جوہر

جوبلی نمبر

انجمن اتحاد

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جوہر

جامعہ جوبلی نمبر

بتقریب

جشنِ سیمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مرتبہ

محمد عرفان نوری۔ بی۔ اے جامعہ

ادارۂ "جوہر" جامعہ جوبلی نمبر"

نگراں:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔اے، پی ایچ، ڈی۔

مہتمم	مدیر
محمد عرفان نوری بی، اے۔ جامعہ	محمد بن عبدالقیوم بی، اے۔ جامعہ

معاونین

عبدالحلیم۔ ندوی۔   محمد یوسف بی، اے۔ جامعہ

حافظ رضی الدین

ادارۂ جوہر جامعہ جوبلی نمبر

کرسیوں پر :— محمد عرفان ندوی - بی - اے (جامعہ) مدیر -
ڈاکٹر سید عابد حسین نگراں - محمد بن عبدالقیوم
بی - اے (جامعہ) مہتمم -

کھڑے ہوئے :— حافظ رضی الدین - محمد یوسف بی - اے (جامعہ)
عبدالحلیم ندوی . معاونین -

فہرست مضامین

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۱	تعارف	مدیر	۵
۲	جامعہ اکابر کی نظر میں	......	۷

جامعہ ملیہ اسلامیہ

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۳	جامعہ کا سیاسی پس منظر	ڈاکٹر محمد اشرف ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی	۱۷
۴	جامعہ کا تمدنی پس منظر	تقی احمد سید متعلم بی۔ اے	۳۴
۵	جامعہ کے تعلیمی اور سیاسی محرکات	سید محمد ٹونکی۔ بی اے جامعہ	۴۳
۶	جامعہ جیسا کہ میں نے دیکھا اور پایا	سید انصاری۔ ایم۔اے۔ کولمبیا	۵۰
۷	ایک پرانا ورق	جنگ بہادر سنگھ بی اے جامعہ ایڈیٹر ٹریبون	۶۳
۸	جامعہ (نظم)	مولانا اسلم جیراجپوری	۷۲
۹	جامعہ ملیہ کے مقاصد	ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی	۷۳
۱۰	جامعہ ملیہ کا نصب العین	خواجہ غلام السیدین مشیر تعلیمات۔ رامپور	۹۳
۱۱	جامعہ کی ادبی خدمات	پروفیسر آل احمد سرور	۱۱۷
۱۲	جامعہ کا نظم و نسق	پروفیسر محمد عاقل۔ ایم۔ اے	۱۲۷

شخصیات

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۳	حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ	محمد عرفان نوری۔ بی اے جامعہ	۱۳۹
۱۴	محمد علی بانیٔ جامعہ	مولانا عبد الماجد دریا آبادی	۱۵۵
۱۵	جوہر بھی یاد ہے؟ (نظم)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۵۸
۱۶	مولانا محمد علی اور جامعہ	ڈاکٹر عبد الحمید زبیری ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی	۱۵۹
۱۷	ملت کے دو معمار	قاضی عبد الغفار مدیر پیام (دکن)	۱۶۷

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۸	حکیم صاحب	ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم۔ اے پی ایچ ڈی	۱۷۴
۱۹	ڈاکٹر انصاری	„	
۲۰	اقبال اور جامعہ	سید نذیر نیازی۔	۱۸۵
۲۱	مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم جامعہ میں	پروفیسر محمد سرور۔ بی۔ اے (آنرز)	۱۹۵
۲۲	عبدالمجید خواجہ اور جامعہ ملیہ	عبدالحلیم ندوی متعلم بی۔ اے۔	۲۰۳
۲۳	ذاکر صاحب	پروفیسر رشید احمد صدیقی۔	۲۰۹
۲۴	مردِ درویش (نظم)	پروفیسر آل احمد سرور	۲۳۴

یادرفتگاں:-

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۲۵	سید محمد شرف الدین یاس	سید محمد ٹونکی بی۔ اے۔ جامعہ	۲۳۷
۲۶	منشی علی محمد خاں	محمود الحسن صاحب استاد تعلیمی مرکز قرولباغ	۲۴۹
۲۷	مولانا سید محمد سورتی	پروفیسر محمد سرور۔ بی۔ اے آنرز	۲۶۰
۲۸	آپا جان مس گرڈا فلیپس بورن	پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)	۲۶۶
۲۹	چودھری اکبر علی	پروفیسر محمد سرور بی۔ اے آنرز	۲۷۶
۳۰	آہ سعد!	پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)	۲۸۵
۳۱	مولانا سعد الدین انصاری	حافظ رضی الدین متعلم ثانوی ششم	۲۸۷
۳۲	صغیر مرحوم	رشید نعمانی صاحب استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر	۲۹۸

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۳۳	پچیسویں سالگرہ	اکابر جامعہ	۳۰۵
۳۴	انجمن اتحاد	ناظم انجمن	۳۱۲

تعارف

رسالہ جوہر، جامعہ کالج کی "انجمن اتحاد" کا ترجمان ہے۔ اس کا نام جامعہ کے شیخ اول حضرت مولانا محمد علی جوہر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یوں تو یہ ایک قلمی رسالہ ہے جو کالج کے طلبا، ہر ماہ نکالتے ہیں، لیکن کبھی کبھی اس کے خاص نمبر، مطبوعہ شکل میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں دو نمبر خاص طور پر قابل ذکر ہیں: ایک جوہر اقبال نمبر، جو علامہ اقبال مرحوم کی وفات پر نکالا گیا تھا اور دوسرے جوہر عبدالحق نمبر، جو مولوی عبدالحق صاحب کی سترویں سالگرہ کے موقعہ پر شائع ہوا۔

پیش نظر نمبر کا منصوبہ اپریل ۱۹۴۵ء میں بنا اور اُسی وقت سے مضامین کی فراہمی شروع کردی گئی۔ مگر جب جامعہ کی جوبلی ملتوی ہوئی تو ہمارے مضمون نگار حضرات نے بھی مضامین بھیجنے میں تاخیر سے کام لیا۔ چنانچہ اب، کہیں ڈیڑھ سال کے بعد بڑی مشکلوں سے رسالہ مرتب ہو سکا ہے۔ جوہر کے اس نمبر میں خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جامعہ کی زندگی، اس کی اہم شخصیتوں، اور اُس کے مرحوم کارکنوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد ایک جگہ جمع ہو جائے۔ تاکہ جشن سیمیں کے موقعہ پر جوہر کا یہ نمبر جامعہ کے تعارف اور اُس کی اجمالی تاریخ پیش کرنے کا بہترین ذریعہ ہو سکے۔

یہ مضامین مختلف حضرات نے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے جامعہ سے تعلق رہا ہے، لکھے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارے ان کرم فرماؤں کا نقطۂ نظر ایک سا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سب کے پیش نظر ایک ہی موضوع یعنی جامعہ ہے، اس لئے الگ الگ ہونے کے باوجود ان مضامین میں ایک وحدت ہے اور اسی خیال سے ہم نے

مضامین کی ترتیب میں مضمون نگاروں کے مراتب کی بجائے نفس مضمون کے تسلسل کا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ جامعہ پر مختلف اکابر قوم کی قیمتی رایوں کے بعد، سب سے پہلے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے عنوان کے ماتحت، جامعہ کی تاریخ، اس کے مقاصد اور اُس کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد جامعہ کی اہم "شخصیات" کا باب ہے، پھر "یادرفتگان" کے عنوان سے جامعہ کے مرحوم کارکنوں کے حالات ہیں۔ یہ تین بڑے عنوان ہیں، جن کے ماتحت ہم نے مضامین کو مرتب کیا ہے۔

جامعہ ملیہ کیا ہے، وہ کن اغراض و مقاصد کے پیش نظر وجود میں آئی، اُس نے قوم و ملک کی کیا اہم خدمات انجام دیں، وہ کن حالات میں قائم ہوئی، اسکا سیاسی و تمدنی پس منظر، اور اُس کے مخصوص تعلیمی و سماجی محرکات کیا تھے، اُسے اپنی پچیس سالہ زندگی میں کن مختلف منزلوں سے گذرنا پڑا، اور اس کا موجودہ نظم و نسق کن بنیادوں پر چل رہا ہے —— کن کن بزرگانِ قوم نے اُس کی سرپرستی فرمائی، اور کونسی ہستیاں تھیں جو جامعہ کی خدمت کرتے کرتے اللہ کی پیاری ہوئیں .... جوہر کے مضامین میں ان سب باتوں کا آپ کو تفصیلی جواب ملیگا۔

(مدیر)

"جامعہ اکابر کی نظر میں"

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

افراد کی طرح اداروں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ جامعہ نے اپنی زندگی کے ابتدائی پچیس ۲۵ سال پورے کر لئے اور اب ایک نئی گرہ اس کے رشتۂ عمر میں بڑھائی جانے والی ہے میں خوش ہوں کہ اس پرچہ کے ذریعہ مجھے موقع ملا کہ اپنی دلی مبارکباد جامعہ والوں تک پہنچا دوں۔ پچیس برس کا یہ زمانہ جامعہ کی زندگی کا ایک آزمائشی دور تھا، لیکن اس دور کی کوئی رکاوٹ بھی اس کی نشوونما کی رفتار کو نہ روک سکی۔ وہ اب اپنے بلوغ کو پہنچ چکا ہے اور آنے والی زندگی کی تمام کامرانیاں پوری آمادگی کے ساتھ اُس کا انتظار کر رہی ہیں۔

(ابوالکلام)

نواب محمد اسمٰعیل خاں۔ ایم۔ ایل۔ اے۔

مقام مسرت ہے کہ امسال جامعہ کی جوبلی منائی جارہی ہے۔ مجھے اس ادارہ سے اوسی وقت سے تعلق ہے جب سے کہ یہ ادارہ ایک ہنگامی حالت میں وجود میں آیا اور میرے محترم دوست اور رفیق کار مولانا محمد علی صاحب مرحوم نے علی گڑھ کالج سے قوم کے نونہالان کو باہر لاکر ایک میدان میں خیمہ جات کے اندر اس درسگاہ کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت میں میں نے ہی بحیثیت صدر صوبہ خلافت کمیٹی اس درسگاہ کے قیام وافتتاح کے لئے خیمہ جات مہیا کئے تھے اور اس کے بعد جب میرے ایک دوسرے عزیز دوست مسیح الملک جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اس ادارہ کا دستور اساسی مرتب کرنے کے فکر میں منہمک ہوئے تو مجھے اُن کی دعوت پر اس درس گاہ کے دستور العمل وضع کرنے والی کمیٹی کے شریک مشورہ رہنے کا بھی شرف حاصل رہ چکا ہے۔

آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ امرتسر میں بتاریخ ۱۶ رجولائی ۱۹۲۵ء میں نے اپنی صدارتی تقریر میں اسی ادارہ کے متعلق کہا تھا کہ :-

”مجھے ایک اور قومی درس گاہ کا تذکرہ کرنا ہے جو جامعہ ملیہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا وجود ہمارے محترم دوست مولانا محمد علی صاحب مرحوم کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ یہ درس گاہ اگرچہ ایک ہنگامی حالت سے وجود میں آئی لیکن جو کام اس قلیل مدت میں اس نے کئے وہ ہر طرح قابل تحسین ہیں۔ اس نے قوم کے سامنے ایک نئی قسم کی درسگاہ کا نمونہ پیش کیا جس میں علاوہ انگریزی تعلیم کے مذہبی، صنعتی وحرفتی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ طلبا کو نہایت سادہ زندگی بسر

کرنی سکھائی جاتی ہے۔ اس درس گاہ کے طلباء نے جس جوش اور استقلال
سے قومی خدمات کو انجام دیا اُس سے اون کی تربیت اور تعلیم کے بلند جذبات
کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں تنظیم کے کام اور دوسری قومی ضرورتوں کے لئے نوجوان
کارکنوں کی فکر ہے جس کے لئے یہی درگاہ انشاء اللہ کافی وضامن ہوگی۔"

جن پُر خلوص اور نیک اِرادوں کے ساتھ اِس ادارہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی
ان ہی کی برکات میں سے ایک یہ اہم بات ہے کہ اِس ادارہ کو ڈاکٹر ذاکر حسین اور
اُن کے دیگر رفقائے کار جیسے مجاہدوں اور خلفائے راشدین کے زمانہ جیسا مادہ ایثار
وقربانی رکھنے والی فدائے قوم ہستیوں کی خداداد قابلیتوں اور گوناگوں اہلیتوں سے
پوری پوری طرح استفادہ حاصل ہونے کا موقعہ نصیب ہوا اور آج میں دیکھ
رہا ہوں کہ یہ درسگاہ بفضل ایزدی اپنی ایک وسیع عمارت بھی رکھتی ہے، اور
اُس کے ہمدردان کا دائرہ روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ میری دلی تمنا ہے
کہ یہ ادارہ نہایت آب وتاب کے ساتھ اپنے منازل ترقی طے کرتا ہوا جلد تر اُس
مقام تک پہونچے کہ جو اس اِدارہ کے قیام کے وقت اس کے بانیان کے پیش نظر
نظر تھا۔

محمد اسمٰعیل خاں

حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب

جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں کی قومی درسگاہ ہے۔ جس نے مجاہدانہ طور پر مسلمانوں کی تعلیم کا کام ہاتھ میں لیکر ان کی قابل تشکر خدمت انجام دی ہے۔ عمر کے ابتدائی پچیس سالہ دور میں اس نے اپنی صلاحیت نمایاں طور پر دکھلائی اور اہل ملک سے خراج تشکر و امتنان حاصل کر لیا۔

کارکنان جامعہ اس کی ابتدائی پچیس سالہ زندگی کی کارگزاری اہل ملک کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ تعلیمی ماہر و مبصر اس کی خدمات کو قدر کی نظر سے دیکھیں گے۔ اور آئندہ کے اس کے منصوبوں کی مدد کرنے میں گذشتہ سے زیادہ متوجہ ہوں گے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

میں ارکین و منتظمین جامعہ ملیہ کو خصوصی طور پر مبارک بادی کا مستحق سمجھتا ہوں کہ انھوں نے جامعہ ملیہ کے ترقی دینے میں ابتدائی دور کی تمام مشکلات پر نہایت عالی ہمتی اور جانفشانی کے ساتھ قابو پالیا اور جامعہ کی ترقی میں بیش بہا کامیابی حاصل کی۔ میں ارکین جامعہ سے پُرزور امید رکھتا ہوں کہ وہ علوم اسلامیہ اور اخلاق و سنن نبویہ کے احیاء میں اپنی پوری کوشش جاری رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کو ترقی اور اوج کے کمالات پر پہونچائیں گے۔ میں آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کے علم و عمل میں ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

حسین احمد غفرلہٗ

سر مرزا محمد اسمٰعیل صدر اعظم دولتِ آصفیہ (دکن)

جامعہ ملیہ کی جوبلی کے موقع پر میں ان تمام بانیان جامعہ کی مسرت میں شریک ہوں جنھوں نے ملک کے سامنے نہ صرف قومی تعلیم کا ایک قابل تقلید نمونہ پیش کیا، بلکہ جنھوں نے قومی مقصد کے لئے ذاتی ایثار اور قربانی کی ایک ایسی شاندار مثال قائم کی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور اُن کے ایثار پیشہ شرکائے کار ہر مسلمان بلکہ ہر وطن پرست ہندوستانی کی بہترین تمناؤں اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔ درحقیقت جامعہ کا وجود خدمت اور ایثار کے جذبے کا ایک ایسا روشن نشان ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کی گذشتہ آدھی صدی کے ورق پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش بنا دئے ہیں۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ جامعہ نے عوامی تعلیم و تربیت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قومی ادارہ کی مزید توسیع اور ترقی کے لئے جدوجہد کرنے کا فرض ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ جامعہ کے متعلق ہماری قوم اپنا فرض بھولے گی نہیں اور اس بات کو یاد رکھے گی کہ یہ ادارہ ہمارا ایک بہت بڑا قومی سرمایہ ہے جس کی ترقی سے ملت کے ذہنی ارتقا کا ایک شاندار مستقبل وابستہ ہے۔

میری تمنا ہے کہ جامعہ کی تعلیمی تحریک کا میدان زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتا رہے اور اہل وطن کے دلوں میں اس کو عزت اور محبت کا وہ اعلیٰ مقام حاصل ہو جس کا وہ بلاشبہ مستحق ہے۔

مرزا اسمٰعیل

پنڈت جواہر لال نہرو - نائب صدر حکومت ہند۔

مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا تھا اور میں خاص طور سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دیکھنے کے لئے علی گڑھ گیا تھا۔ مولانا محمد علی کی قیادت میں جامعہ کو قائم ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن گذرے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے پرجوش اور نوجوان طالب علم خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے جامعہ ملیہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے تھے۔ مولانا محمد علی کے زیر قیادت اس نئے تعلیمی ادارہ کی زندگی جوش اور ولولہ سے بھری ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت میں نے جامعہ ملیہ پر ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں میں نے جامعہ کو تحریک عدم تعاون کے توانا اور تنومند بچہ سے تعبیر کیا تھا۔

کچھ سال بعد جامعہ ملیہ دہلی منتقل ہو گئی۔ یہ اس کے لئے بڑا سخت زمانہ تھا اور اُسے قدم قدم پر نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن اس کے پاس ایک ایسی چیز تھی جو اس زمانہ میں شاید ہی کسی دوسرے تعلیمی ادارے کے پاس ہو۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی زیر قیادت اس کے مخلص، ایثار پیشہ اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے کارکنوں کی جماعت تھی۔ اس طرح زندگی کی معمولی سہولتوں کے فقدان اور تنگدستی کے باوجود اس جماعت کو ایک ایسی چیز مل گئی تھی جو روپے پیسے اور کسی شخص کی سرپرستی سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کے سرد و گرم حالات کے باوجود وہ نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھ سکی بلکہ برابر ترقی کرتی رہی (اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ اس زمانہ میں ایک ایسے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی گئی تھی جسے آئندہ چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہونا تھا۔ وہ بڑھی اور اس نے ہر میدان میں ترقی کی یہاں تک کہ وہ لوگ بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے جنھیں پہلے اس

میں نازل تھا۔ اس کے پیش نظر طالب علموں کو محض ڈگریاں دینا اور انھیں ملازمتوں کے لئے تیار کرنا نہ تھا بلکہ ان میں ایسے انسانوں کا کردار پیدا کرنا تھا جو اپنی شخصی اغراض سے بلند ہو کر کسی بڑے مقصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکیں اس مقصد کے لئے جامعہ ملیہ نے نظام تعلیم کو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے ہندوستان کے تعلیمی اداروں کی اس راہ میں سب سے پہلے رہنمائی کی ہے۔

پچیس سال گذر گئے اور اس عرصہ میں ہندوستان میں ایک نئی نسل پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بڑے اطمینان اور خوشی کی بات ہے کہ اچھے کام کا لوگوں کو اس طرح انعام ملے۔ جوبلی کے موقع پر میں تمام جامعہ والوں اور خاص طور سے ڈاکٹر ذاکر حسین اور اُن کے مخلص ساتھیوں کی خدمت میں اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے جامعہ بڑھے، پھلے پھولے اور ہمیشہ اپنے مقاصد پر قائم رہے اور اس کی زیر نگرانی ایسے لائق آدمی تربیت پاکر نکلیں جو صحیح معنی میں ہندوستان کے سپوت کہلانے کے مستحق ہوں اور جو عوام کو اپنی خدمت کے ذریعہ زندگی کے بلند معیار تک لے آئیں۔

جواہر لال نہرو

جامعہ ملّیہ اسلامیہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر دہلی
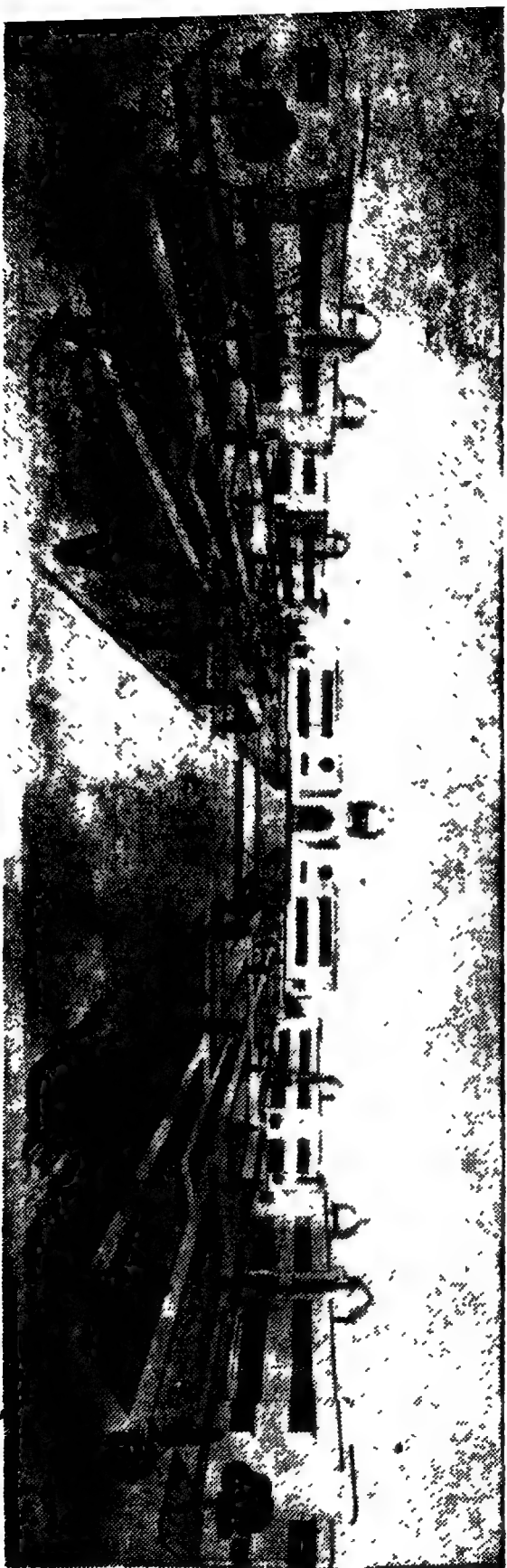
محل علم کا سونے سے بنا خون آدم سے بنتا ہے
خس و خاشاک کا اِک ڈھیر بڑی مشکل سے بنتا ہے

جامعہ کا سیاسی پس منظر

(۱)

اول تو خود جامعہ نے خلافت جیسی ہنگامہ پرور تحریک کی گود میں آنکھیں کھولیں پھر گذشتہ ۲۵ برس میں ہندوستان نے پے درپے ایسے سیاسی طوفان دیکھے ہیں کہ آج پرانی زندگی کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ میں جب اپنی طالب علمی کے ایام پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی "دورِ جاہلیت" کی یاد تازہ کرتا ہو۔ اُن حوصلہ مند نوجوانوں کو جو آئے دن گاندھی ازم، مسلم لیگ یا کمیونسٹ پارٹی کی خامیوں پر آزادانہ بحث کرتے رہتے ہیں اور قومی رہنماؤں کی سست روی سے اکتا گئے ہیں میں کیونکر یقین دلاؤں کہ سنہ ۲۰ء سے پہلے ان آنکھوں نے وہ مناظر بھی دیکھے ہیں جب حب الوطنی جیسے معصوم جذبہ کو صرف یہی نہیں کہ شبہ اور خطرہ کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا بلکہ اس کی پاداش میں سزائیں بھی بھگتنا پڑتی تھیں۔ تعلیمی اداروں کی ذہنی آزادی آج ہمارے مسلمات میں شامل ہے مگر اس زمانہ کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ طالب علم مدرسوں میں محض اس خیال سے آتے تھے کہ نوکری کے لئے سند کی ضرورت پڑتی ہے، اُستادوں نے پڑھانے کا پیشہ صرف اس مجبوری میں اختیار کرلیا تھا کہ کسی بہتر [illegible] میں اُن کی کھپت نہ تھی۔ خود سررشتۂ تعلیم کا منشا اس سے زیادہ نہ تھا کہ طالب علموں کو ضابطہ کے طور پر بعض نامانوس درسی کتابوں کی ورق گردانی کرادی جائے اور دفتری ضروریات کے لائق انگریزی زبان آجائے۔ [illegible] پولس، فوج اور حکومت کے

دوسرے محکموں کی طرح محکمۂ تعلیم قائم ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ نوجوانوں کو علم کی بجائے وفاداری کے آئین اور ذہنی تربیت کی بجائے حکومت پرستی کے آداب سکھائے جائیں اور بہرنوع اُنکا ذہن کسی سماجی نصب العین کی طرف متوجہ نہونے پائے۔ چنانچہ سال میں ایک بار جب انسپکٹر مدارس کا دورہ ہوتا تھا اس کی نمائش بھی ہوتی تھی۔ اس موقعہ پر اسکول کی عمارت شہنشاہ معظم اور اور شاہی خاندان کی عکسی تصویروں سے سجائی جاتی تھی جگہ جگہ کتبوں پر لکھا ہوتا تھا کہ "بادشاہ سلامت کی عمر دراز ہو" اور انسپکٹر بہادر کے جلوہ افروز ہوتے ہی سب طالب علم کروفاداری کے گیت گاتے تھے۔ خدا کے فضل سے صاحب بہادر کو بھی تعلیم یا مدرسہ کے انتظامی معلامات سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ موصوف سرسری طور پر کمروں کا چکر لگا کر اور دفتر کے رجسٹروں کو اُلٹ پلٹ کر معائنہ کی رپوٹ لکھدیتے تھے اور اس کے بعد سدھار جاتے تھے۔ طالب علموں کو خوشی صرف اس بات کی تھی کہ انسپکٹر کی آمد پر ایک دن کی تعطیل ضرور ہوتی تھی اور بادشاہ کی تخت نشینی کے سلسلہ میں ہر سال مٹھائی بانٹی جاتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کالج کی زندگی کا معیار ذرا بلند تھا یعنی چھوٹے موٹے افسروں کی بجائے طالب علموں کو بڑے بڑے عہدیداروں حتے کہ گورنروں کے استقبال کا موقعہ نصیب ہوتا تھا بلکہ بعض بعض اداروں میں تو خود حضور وائیسرائے نزول اجلال فرماتے تھے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ یونیورسٹی کی سند مل جانے کے بعد بڑی بڑی ملازمتوں کے دروازے کھل جاتے تھے۔ چنانچہ کالج کے نصاب میں انگریزی زبان اور مغربی تمدن کے سیکھنے اور اپنانے پر بڑا زور دیا جاتا تھا اور بعض ہونہار نوجوانوں کے بارے میں یہاں تک مشہور ہو جاتا تھا کہ انگریزی زبان بالکل فرنگیوں جیسی بولتے ہیں۔ مسلمانوں کی درسگاہوں میں یہ امتیاز علی گڈھ کالج کو حاصل تھا کہ مغربی تمدن سکھانے کے لئے منتظمین نے خود ولایت اور یورپ سے چھانٹ چھانٹ کر پروفیسر بلائے تھے اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل "کھلنڈرے" کہلانے پر ناز کرتے تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب میرے ایک عزیز ہم جماعت کے بارے میں علی گڑھ کے بعض حلقوں نے یہ شعر چسپت کیا کہ ؎

پیدا ہوئے تھے آپ تو لندن کے واسطے
بد قسمتی سے باپ کو ہندی بنا دیا

تو میرے دوست برہم ہونے کی بجائے کچھ مطمئن سے ہو گئے۔ اسی تربیت کا کرشمہ تھا کہ انگریز حکام علی گڑھ کے پڑھے لکھوں پر بالعموم بھروسہ کرتے تھے اور خان صاحب اور خان بہادروں کی فہرستیں ان کے ناموں سے بھری ہوتی تھیں۔

اس سے آپ کو کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ علی گڑھ کو ملک و ملت کا دھیان ہی نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ کالج کی بنیاد ہی قوم پرستی اور ملت پروری پر پڑی تھی اور ہر نوجوان سے قومی خدمت کی توقع کی جاتی تھی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بنانے کا بھی مقصد یہی تھا کہ ہر سال کم از کم ایک بار قومی مسائل پر غور کیا جائے چنانچہ سرسید کے زمانہ سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جہاں علی گڑھ کے چند نوجوان جمع ہوئے اور قوم کی زبوں حالی کا ماتم شروع ہو گیا علی گڑھ کی نجی صحبتیں اور کانفرنس کے اجلاسوں کی کارروائیاں اس کی شاہد ہیں کہ قومی اصلاح کی تجویزوں پر متواتر غور کیا گیا بلکہ زمانہ کے دستور کے مطابق عمل بھی ہوا یعنی یہ مشورے اور تجویزیں اخبارات میں شائع کرائی گئیں اور اُن کی نقلیں حکام کو بھیجی گئیں۔ ان کا نتیجہ بھی نکلا یعنی متعدد مقامات پر مڈل اسکول ہائی اسکول اور کہیں کہیں نسوانی مدرسے قائم ہوئے۔ اب اگر ان تمام کوششوں کے باوجود قوم کی پستی دور نہ ہو تو اس کے لئے علی گڑھ کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بانیان علی گڑھ کالج نے اپنی بساط کے مطابق قومی زندگی کا ایک مرتب خاکہ پیش کیا تھا جس کی بنیاد یہ تھی کہ انفرادی زندگی کو سنوارنے اور تاج برطانیہ کے وفادار رہنے سے قومی زندگی خود بخود سنور جائے گی۔ چنانچہ اکبر مرحوم نے اپنے مزاحیہ انداز میں اسے یوں بیان کیا تھا۔

کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

ہماری قومی سیاست کے دھارے بھی اسی سوتے سے پھوٹتے تھے یعنی وہ سند یافتہ

نوجوان جو کسی وجہ سے اعلیٰ عہدوں سے مایوس ہو کر اسکول ماسٹری کی بجائے وکالت کا آزاد پیشہ اختیار کر لیتے تھے وہ ایک نہ ایک دن مستند سیاسی رہنما بن جاتے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا پلیٹ فارم اس سیاست کا گہوارہ تھا اور لیگ کی ممبری اُن لوگوں تک محدود تھی جو کم از کم پانچسو روپیہ سالانہ آمدنی کے مالک ہوں اور ۲۵ روپیہ سالانہ فیس دیتے ہوں۔ وکلا اور بیرسٹروں کی سہولت کے خیال سے لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر کی تعطیلات میں ہوتا تھا۔ اس کا اظہار کرنا غیر ضروری ہے کہ ان اجلاسوں کی کارروائی کامل اتفاق رائے سے طے پاتی تھی اس لئے کہ سنجیدہ اختلافی امور کی سرے سے گنجائش ہی نہ تھی۔ سالانہ اجلاس کے موقع پر صاحب صدر کے مدلل اور فاضلانہ خطبہ کے بعد پہلی تجویز سرکار برطانیہ کی وفاداری کے بارہ میں پیش ہوتی تھی جسے شرکائے مجلس کھڑے ہو کر اور سر برہنہ منظور کرتے تھے۔ دوسری تجویز میں بالعموم کسی ایسے حادثہ کا ذکر ہوتا تھا جس میں مسلمانوں کو مادی یا کم از کم روحانی نقصان پہنچا ہو۔ چنانچہ اسکی تلافی کی پرزور سفارش کی جاتی تھی۔ اس کے فوراً بعد مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق کی معرکتہ الآرا بحث چھڑتی تھی اور ہر مقرر رزم آرائی کے تیور چڑھا کر پہلے برطانیہ کی انصاف پروری کی دُہائی دیتا تھا پھر مسلمانان ہند کی امتیازی حیثیت جتاتا تھا اور آخر میں یہ دھمکی ضرور دیتا تھا کہ اگر برطانوی حکومت نے ہندوؤں کے دباؤ میں آکر ہمارے خصوصی حقوق اور تحفظات سے چشم پوشی کی تو پھر خیر نہیں ہے! اجلاس کی آخری تجویز میں بزم آرائی کا سماں بندھتا تھا اس لئے کہ اجلاس کی غیر معمولی کامیابی اور مندوبین کی گراں بہا قربانیوں پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی جاتی تھی اور ارکان استقبالیہ کمیٹی کا ذکر خصوصی طور پر ہوتا تھا۔ بالآخر جب یہ اندر سبھا برخاست ہو جاتی اور لیڈر حسب معمول زمینداری یا عدالت کے کاموں میں منہمک ہو جاتے تو قوم سال بھر ڈھونڈتی پھرتی کہ ہمارے رہنما کہاں ہیں اور کہیں سُراغ نہ ملتا۔

اس "موسمی" سیاست سے بعض لوگ بڑے کڑھتے تھے چنانچہ مولانا شبلی نے ایک بار بصد ادب و نیاز مندی مسلم لیگ کے رہنماؤں سے دریافت کیا کہ ؎

سال بعد حضرت والا کا کوئی کام بھی ہے۔

سرزمین ہند میں لے دے کر ایک دیوبند تھا جس کے پہلو میں انگریز دشمنی کی چنگاریاں ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور حکومت کے بے پناہ تشدد کے باوجود دبی رہ گئی تھیں۔ یہ کہئے کہ انگریز دشمنی علمائے دیوبند کے عقیدہ میں شامل تھی چنانچہ دارالعلوم دیوبند نے کبھی حکومت کی امداد سے کوئی واسطہ رکھا نہ سرکاری ملازمت سے ـــــ اور نہ مسلم لیگ کی سیاست سے! مگر علمائے دیوبند اس خام خیالی میں گرفتار تھے کہ ارسطو و بطلیموس اور ایساغوجی کے بل پر وہ دنیا کے ہر عقدہ کو حل کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی سماجی زندگی بنیادی طور پر بدل چکی تھی مگر یہاں معاشرہ کی تقسیم اب بھی دارالاسلام اور دارالحرب کی بنیاد پر قائم تھی اور ہر مخلص عالم دین حضرت سید احمد بریلوی کی اتباع میں جہاد بالسیف کے خواب دیکھتا تھا۔ اسی علمی اور نظری خامی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی عملی سیاست میں علمائے دیوبند کی کوئی جگہ نہ تھی اور ۱۹۱۳ء کے مسجد کانپور جیسے حادثہ کے موقعہ پر بھی ان حلقوں میں سکوت کا عالم رہا!

ہندو تعلیم گاہوں اور آریہ سماجی اداروں کے بارے میں البتہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی فضا نسبتاً بہتر اور فتح مند تھی یعنی حکومت پرستی اور "مغرب زدگی" کی بجائے یہاں سیاسی خودداری اور خود اعتمادی کا دور دورہ تھا اور سوراج و سودیشی کے نعرے ہر کس وناکس کی زبان پر تھے۔ وطنی سیاست کی بنیاد بظاہر قومیت مگر در اصل مذہبی تجدید پر تھی اور ہر ہندو محب وطن کا پختہ عقیدہ تھا کہ سنسکرت دنیا کی بہترین زبان ویدانت انسانیت کا اعلیٰ ترین فلسفہ اور بھارت ورش کرۂ زمین کا سب سے حسین گو سب سے مظلوم ملک ہے۔ ہندو محبان وطن نے اس دور میں پستول اور بمب سے کام لینا سیکھا اور "دہشت پرستی" کی راہ اختیار کی۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک تقریباً ۱۵۰ مقدمے ان نوجوانوں پر چل چکے تھے اور سیکڑوں نے پھانسی اور کالے پانی کی سزائیں بھگتی تھیں۔ لاجپت رائے، تلک اور بپن چندر پال جیسی شخصیتیں اس تحریک کی رہنمائی کرتی تھیں مسلمانوں میں ان کے پیرو لے دے کر ایک حسرت موہانی تھے۔ جنھوں نے انتہائی پامردی اور استقلال کے

ساتھ سدیشی کو اپنایا مگر علی گڑھ اور دیوبند دونوں حسرت سے منحرف رہے ہے۔ اس لئے کہ ایک کو تاج برطانیہ اور دوسرے کو شریعت اسلام کے مٹ جانے کا اندیشہ تھا اور مسلمانوں میں کوئی تحریک اسوقت تک کامیاب نہ ہوسکتی تھی جب تک ان دونوں کو اپنے ساتھ نہ لے۔ بالآخر علی گڑھ سے ایک نیا رجحان پیدا ہوا جس نے صرف یہی نہیں کہ دونوں کو آپس میں ملادیا بلکہ انگریز دشمنی کی ٹھوس اور محکم بنیاد پر ہندو اور مسلمان سیاست کے جداگانہ دھاروں کو ایک کردیا۔

جامعہ کی تعلیمی اور خلافت کی سیاسی تحریک اسی جمہوری اتحاد اور سامراج دشمن عمل کی تاریخی نشانی ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم اس تحریک کے قافلہ سالار تھے۔

(۲)

نئے دور میں جن بزرگوں نے "جداگانہ اسلامی سیاست" کا بیج بو کر اپنی دانست میں سرسید کی اتباع کا حق ادا کیا تھا انھیں یہ اندیشہ برابر لگا ہوا تھا کہ مسلم سیاست کی ایک تاویل ایسی بھی ہوسکتی ہے جو سرے سے فرقہ وارانہ امتیازات کو ہی مٹا دے اور مسلم عوام کو ہندوؤں سے جدا رکھنے کی بجائے ایک جمہوری اتحاد اور متحدہ قومی جدوجہد میں منسلک کردے۔ نوجوان اس روش پر پڑتے جا رہے تھے اور "قوم پرست" ہندوؤں کی طرح اُنھوں نے بھی اپنی "قومی" عظمت کی تاریخ مرتب کرنا شروع کردی تھی چنانچہ نواب عماد الملک نے بار بار علی گڑھ آکر شکوہ کیا کہ نئی نسل کے نوجوان سرسید کی روایات پر عمل کرنے کی بجائے کانگریسی انتہا پسندوں کے نظریوں کو اپناتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں نواب عماد الملک نے ایجوکیشنل کانفرنس کے بھرے اجلاس میں اس کا دکھڑا رویا کہ مولانا شبلی کی تحریروں سے "اسلاف پرستی" کا مرض اب مسلمانوں میں وبا کی طرح پھیلنا شروع ہوگیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی تباہ کاریوں سے مسلم نوجوان باخبر ہوتے جا رہے تھے اور وہ ایک ایسے سیاسی فلسفہ کی تلاش میں تھے جو اُن کی سامراج دشمنی کو اُبھارنے کے ساتھ ساتھ اُن کی تمدنی روایات اور مذہبی تعصبات کا بھی لحاظ رکھے۔ مولانا شبلی کا بڑا کارنامہ یہی تھا کہ موصوف نے مذہبی تجدید اور اسلاف پرستی کے پردہ میں نوجوانوں کو جمہوری سیاست اور

قومی آزادی کے گر سمجھائے اور اس نئے رجحان کے لئے تاریخی اور جذباتی اسناد فراہم کیں۔ شبلی نے مسلمانوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر سمجھایا کہ تم خود ایک شاندار تہذیب کے وارث ہو جس نے دنیا کو اعلیٰ تمدنی زندگی اور جمہوری حکومت کے سبق سکھائے ہیں اس لئے تمہارا بدرجہا اولیٰ فرض ہے کہ برطانوی شہنشاہیت سے مرعوب ہونے کی بجائے اس کے مقابل صف آرا ہو اور "نوجوان ترکوں" کی طرح اپنے ہموطنوں سے اتحاد کر کے قومی آزادی کی سبیل نکالو۔ عام مایوسی اور بے بسی کی فضا میں شبلی نے مسلمانوں کو فتح اور کامرانی کا مژدہ سنایا اور ایک نیا راگ چھیڑا کہ ؏

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر نکل آئے

کہ ہم نے انقلاب دورِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

مسلم لیگ میں مولانا محمد علی اور احرار کا نوجوان گروہ اسی پیام کا حامل تھا اور علی الاعلان کہتا تھا کہ مسلم حقوق کی حفاظت کے لئے حکومت برطانیہ پر بھروسہ کرنا ہماری قومی توہین ہے ہمیں اپنے ہندو ہم وطنوں سے یہ حقوق منوانے ہیں مگر وطن کی آزادی کے لئے اُن کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے۔ اس رجحان کا فروغ پانا تھا کہ ہر طرف ایک لہر سی دوڑ گئی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے اگر کسی بات کی کمی تھی تو دنیائے اسلام کے تازہ واقعات نے پوری کر دی۔ ترکی۔ ایران اور مصر کے نوجوانوں کی طرح ہندوستان کے مسلم نوجوانوں نے بھی اپنے تجربہ سے سیکھا کہ برطانوی سامراج کو مٹائے بغیر کوئی باعزت قومی یا اسلامی زندگی ممکن نہیں ہے چنانچہ ابھی لیگ کی بنیاد ہی پڑی تھی کہ علی گڑھ کالج کے طلبا نے یورپین اسٹاف کے خلاف اسٹرائک کیا اور اسلامی اخبارات نے اُن کی پرزور حمایت کی جس کی وجہ سے حکومت کو بالآخر اُن کے سامنے سر جھکانا پڑا ۱۹۰۷ء کا علی گڑھ کالج کا اسٹرائک درحقیقت ایک نئے دور کا آغاز تھا جس میں حکومت سے فریاد کرنے کی بجائے نوجوان طبقہ لڑنا سیکھ رہا تھا۔ البتہ پرانی نسل کے لوگ ایک زمانہ تک مسلمانوں کو یہ دلاسا دے کر بہکایا کرتے تھے کہ برطانیہ نے تمہاری تعلیمی پستی کے باوجود تمہاری ترقی کے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ تمہیں حیثیت سے زیادہ ملازمتیں دی ہیں اور مشرقی بنگال کا نیا صوبہ بنا کر اپنی اسلام نوازی

کا ثبوت دیا ہے۔ ۱۹۱۱ء کے شاہی دربار نے یہ رہا سہا بھرم بھی کھول دیا اور تقسیم بنگال کی منسوخی سے مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں پر سہارا کرنا محض خود فریبی ہے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد "مسلم یونیورسٹی ایکٹ" کا سوال آیا اور حکومت نے مسلمانوں کے مطالبات ٹھکرا کر انھیں ایک نئی سیاسی نہج پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ۱۹۱۲ء سے مسلمانوں کی سیاست کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

"فرقہ پرور" سیاست سے منھ موڑتے ہی نوجوان گروہ کی نگاہ ہندو مسلم اتحاد کے سوال پر گئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ اس اتحاد کو وسیع اور پائدار بنیادوں پر قایم کرنا چاہیے "اتحاد اسلامی" کا مقبول عام جذبہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی اس لئے کہ ہندو وطن پرست اسے جارحانہ مذہبیت سے تعبیر دیتے تھے چنانچہ مولانا محمد علی نے بار بار کامریڈ کے صفحات میں "پان اسلامزم" کی جدید سیاسی تحریک سے بحث کی اور ہندو قوم پرستوں کو سمجھایا کہ "اتحاد اسلام" کا نعرہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیائے اسلام کے محکوم اور مغلوب ممالک مغربی شہنشاہیت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی اعتبار سے ہمیں بجائے دور رہنے کے مشرقی اقوام کی اس عظیم الشان صف بندی میں شریک ہونا چاہیے بالفاظ دیگر یہ مظلوم قوموں کا اتحاد ہے اور اس میں جارحانہ مذہبیت کا کوئی پہلو نہیں ہے واقعہ کے طور پر "اتحاد اسلامی" کی پرانی تحریک خالص قومی آزادی کی نئی تحریکوں میں بدل چکی تھی اور ایران کی دستوری تحریک یا ترکی کی "انجمن اتحاد و ترقی" سے ہندوستان کے مسلمان صرف ایک ہی سبق سیکھ سکتے تھے کہ فی زمانہ مذہب کی بنیاد پر کوئی قومی آزادی کی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے احرار لیگ کا ردعمل بھی وہی تھا جو ہندوستان اور مشرق کی دوسری قوموں میں ہو رہا تھا یعنی مہاراشٹر اور بنگال کے ہندو قوم پرستوں کی طرح اصطلاحات ان کی بھی مذہبی تھیں مگر مدعا وطنی و قومی آزادی تھا۔ تلک اور مولانا محمد علی بات ایک ہی کہتے تھے گو تلک گیتا سے اور دوسرا قرآن و حدیث سے اس کے لئے جواز پیش کرتا تھا۔ خال خال نوجوان ایسے

بھی تھے گویا تو دونوں مذاہب کی عظمت کا یکساں اعتراف کرتے تھے یا پھر دونوں سے منحرف تھے۔ احرار لیگ کے ایک ممتاز رکن نے اس زمانہ میں دیوان غالب کی شرح لکھی اور برملا کہا کہ "ہندوستان کی دو مقدس کتابیں ہیں۔ ایک وید دوسری دیوانِ غالب" اور یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان "کلمات کفر" سے کسی مسلمان کی جبیں پر شکن نہیں پڑی!

احرار لیگ کا دوسرا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے علی گڑھ اور دیوبند میں صرف یہی نہیں کہ صلح کرائی بلکہ دونوں کو نئی قومی سیاست کی بنیاد پر یکجا کیا۔ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ سیاسی عقاید کے علاوہ مذہبی اور تمدنی اختلافات کی خلیج بھی حائل تھی اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کا میل ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے بھی زیادہ کٹھن ہے مگر بالآخر سامراج دشمن کی ہمہ گیری نے ان حدبندیوں پر فتح پائی اور ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہند مرحوم نے مولانا محمد علی کو اپنا سیاسی رہنما اور مولانا محمد علی نے علمائے اسلام کو اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کر لیا۔ در اصل علماء کے حلقوں میں مولانا ابوالکلام کے مشہور اخبار الہلال نے ایک زمانہ تک نئے سیاسی رجحانوں کا اسی طرح پرچار کیا تھا جیسے مولانا محمد علی کا مرڈ کے ذریعہ انگریزی خواں طبقہ میں اس کی تبلیغ کرتے تھے۔ دیوبند نے علمائے ہند کی دیرینہ روایات کے مطابق صرف یہی نہیں کہ ان افکار کو اپنایا بلکہ ایک پوشیدہ تنظیم کی صورت دی۔ اور ایک انقلابی پروگرام مرتب کیا جسے تاریخ "ریشمی خطوط کی سازش" کے نام سے یاد کرتی ہے۔

یہ کہنے کہ ۱۹۱۳ء کی ابتدا تک نوجوان گروہ نے زمین ہموار کر لی تھی اور اب عملی سرگرمی کی باری تھی۔ احرار لیگ کا سب سے پہلا مطالبہ یہ تھا کہ کانگریس کی طرح مسلم لیگ کا نصب العین بھی "حکومت خود اختیاری" ہونا چاہیے تاکہ دونوں مل کر اپنے دستوری مطالبات مرتب کریں اور حکومت ماننے پر مجبور ہو جائے۔ ادنیٰ کوشش سے انھیں اس میں کامیابی ہوئی

اور بالآخر ۱۹۱۳ء میں لیگ کا کریڈٹ کانگریس کے ہم پلہ ہوگیا۔ یہ صحیح ہے کہ سر آغا خاں اور امیر علی یا محمد شفیع جیسے حکومت پرستوں نے شروع میں بڑا زور باندھا مگر بالآخر گھٹنے ٹیکنے اور ہار ماننے پر مجبور ہوئے۔

۱۹۱۳ء میں آنے والی جنگ عظیم کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور نوجوان طبقہ محسوس کر رہا تھا کہ ہمیں اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے چنانچہ ہنگامہ بلقان کے شروع ہوتے ہی مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری نے ایک "طبی مشن" مرتب کرنے کا فیصلہ کیا جو بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہوا ترکی روانہ ہوگیا۔ یہ کہیئے کہ طبی مشن کے پردہ میں ہندوستان کی تحریک آزادی نے مشرق وسطی کی قوموں کے پاس اپنے سفیر بھیجے تاکہ آنے والے دور میں باہمی اتحاد و یگانگت کی بنیاد پڑ جائے۔ ابھی "انصاری طبی مشن" ہندوستان لوٹ ہی رہا تھا کہ مسجد کانپور کا سانحہ ہوا جس میں مسجد کے انہدام کے علاوہ بہت سے مسلمان شہید اور سیکڑوں زخمی ہوئے اس موقعہ پر مسلم اخبارات کا مطالبہ صرف یہ نہ تھا کہ مسجد کی مرمت کر دو یا زخمیوں کو امداد دو بلکہ سب اس پر متفق تھے کہ نظام حکومت کی تبدیلی ضروری ہے۔ چنانچہ حکومت نے پہلی بار اس خطرہ کا احساس کیا اور راجہ محمود آباد، نواب رامپور، سر علی امام وغیرہ کو بیچ میں ڈال کر کوشش کی کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے ان خود ساختہ عمائدین قوم نے حسب معمول دہلی میں ایک خفیہ جلسہ کر کے فیصلہ کیا کہ حکومت کی تجویزوں کو قومی مطالبات کی صورت میں مان لینا چاہیئے۔

ہمدرد اخبار کے صفحات میں اس واقعہ کا مشتہر ہونا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور ہر طرف سے ان پرانے اور "مستند" لیڈروں پر گالیاں پڑنے لگیں۔ بالآخر مولانا محمد علی نے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بیچ بچاؤ کیا۔ عام لوگوں کے جوش اور انگریز دشمنی کا یہ عالم تھا کہ مولانا محمد علی کا اعتدال آمیز رویہ بھی ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور خواجہ حسن نظامی جیسے ادیبوں نے "کہو تکبیر" جیسے مضامین لکھے جو چھپتے ہی ضبط کر لیئے گئے۔

مسجد کانپور کے زخم ابھی ہرے ہی تھے کہ اماکن مقدسہ اور حجاز کی حفاظت کا سوال پھر اگیا۔ جنگ بلقان کے تجربہ کے بعد ہر شخص محسوس کرنے لگا تھا کہ جب خلیفہ مغربی سامراج کے مقابلہ میں خود دار الخلافہ یا اناطولیہ کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتا تو پھر برطانیہ یا فرانس کے مقابلہ میں اس کا کیا یقین ہے کہ "دشمن" مقامات مقدسہ پر قابض نہ ہو جائیں گے اس لئے یہ فرض اب مسلمانانِ عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کا ہے کہ اُن مقامات کی حفاظت کا ذمہ خود لیں۔ اس احساس کا عام ہونا تھا کہ مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالباری نے "خدام کعبہ" کی بنا ڈالدی اور مطالبہ کیا کہ مسلمان اماکن مقدسہ کی حفاظت کے لئے اپنے جان و مال سے تیار رہیں۔ آپ خود غور کیجئے کہ جب اس فضا میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو مسلمانوں کا کیا حال ہوا ہوگا؟ آج اس دور کی ہیجانی کیفیت کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے مگر شاید آپ اس واقعہ سے قیاس کرلیں کہ اُس زمانہ میں غلام بھیک چودھری جوش محمد، آغا حشر بلکہ سید ہاشمی فریدآبادی جیسے جمود پسند اور انقلاب نا آشنا مزاج شبلی، حسرت، جوش اور اقبال سے بڑھ کر شرر فشانی کیا کرتے تھے اور ان کا یہ کلام ہماری انقلابی شاعری میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس دور کی معرکۃ الآرا نظموں میں ہاشمی صاحب کی "چل بلقان چل" "حضرت عمر سے فریاد" "بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی" اور آغا حشر کا مغربی تہذیب سے خطاب (تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم ملت کھل گئی) خصوصیت سے ذکر کے قابل ہیں۔

حکومت نے جنگ کے زمانہ میں وہی پالیسی برتی جس کی ایک بدیسی سامراج سے توقع تھی یعنی سب ہندو مسلمان لیڈروں کو نظر بند کیا۔ قومی اخباروں پر پابندی لگائی اور ملک کو اس بے دردی سے لوٹا کہ غالباً جرمن دشمن بھی اس سے زیادہ نہ کر سکتے تھے۔ تشدد کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ اکیلے صوبہ بنگال میں ۰۰، گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی

مولانا حسین احمد مدنی اور شیخ الہند ان نظر بندوں میں شامل تھے۔ مسلمانوں پر حکومت کے تشدد کا طبعی ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے "ہندوستان چھوڑو" کا نعرہ لگانے کی بجائے اس پر عمل کیا اور ہندو اور مسلمان انقلاب پرستوں میں ہم آہنگی ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کابل میں ہندوستان کی پہلی آزاد جمہوری حکومت بنی جس میں مسلمانوں کی جانب سے مولانا عبید اللہ سندھی اور ہندو قوم پرستوں کی طرف سے راجہ مہندر پرتاب شریک ہوئے اور مولانا محمود الحسنؒ آزاد حکومت کی افواج کے کمانڈران چیف مقرر کئے گئے۔ اسی سرگرمی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کا دن ہندوستان کی عام بغاوت کے اعلان کے لئے مقرر کیا گیا گو اس پر عمل نہ ہو سکا۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر بالآخر مسلم لیگ اور کانگریس کے اعتدال پسندوں نے بھی ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کا عہدنامہ مرتب کیا اور مسٹر جناح اور سر سیندر ناتھ ان کارروائیوں میں پیش پیش تھے۔ یہ کہئے کہ جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہوتے ایک متحدہ انقلابی جدوجہد کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور صرف اس کی دیر تھی کہ تلک اور مولانا محمد علی جیسے رہبر کیلئے آزادی کا پیام دینے کی بجائے مل کر اس کی پکار کریں۔

(۴)

لڑائی کا ختم ہونا تھا کہ ایک طرف سے ترکی مقبوضات کی تقسیم اور دوسری جانب سے رولٹ ایکٹ کے نفاذ کا [illegible] ہوا یہ کہئے کہ برطانوی حکومت نے بیک وقت ہندو مسلمان دونوں کو چنوتی دے دی اور دونوں بھانپ گئے کہ آزادی کے اعلان کی گھڑی آپہنچی لیگ اور کانگریس کے اعتدال پسند رہنما عوام کی نفسیات سے قطعاً بے خبر اور حسب معمول قانونی موشگافیوں میں لگے ہوئے تھے۔ سردست ان کے پیش نظر ۱۹۱۹ء کا ایکٹ تھا اور سب اس کے لئے آمادہ تھے کہ نئی دستوری اصلاحات پر عمل کیا جائے۔ چونکہ عوام کی کوئی اپنی سیاسی پارٹی نہ تھی اس لئے ہر بات اضطراری کیفیت میں سوچی گئی۔ کسان بالعموم یہ سمجھے کہ جنگ آزادی کی ابتدا لگان بندی سے ہوگی چنانچہ کہیں کہیں اس پر عمل شروع ہوگیا۔ انقلابی نوجوانوں نے تلک سے بائیکاٹ اور سودیشی کے سبق سیکھے تھے انھیں قانون شکنی اور ولایتی مال کے بائیکاٹ

بائیکاٹ کی سوجھی۔ عام لوگ سمجھے کہ انگریزی حکومت کے خاتمہ کا وقت قریب آگیا ہے اس لئے
انھیں اس ہیئت کے دفنانے کی فکر تھی مگر پروگرام کوئی نہ تھا۔ اس سراسیمگی کے عالم میں بعض
مسلمانوں کو خیال آیا کہ ہجرت اور جہاد کا سازوسامان کرنا چاہیئے چنانچہ اُنھوں نے افغانستان
اور ترکی جانے کے خاکے بنانا شروع کر دیئے۔ البتہ گاندھی جی کی ذات ایک ایسی تھی جس کا
ہاتھ قوم کی نبض پر تھا اور جو عوام کو قابو میں رکھ کر حکومت پر دباؤ ڈالنے کی تدبیریں برابر سوچ
رہا تھا۔ چنانچہ بالآخر گاندھی جی نے ترکِ موالات کا پروگرام دیا جس سے سب مطمئن ہو گئے
اس میں قومی تعلیم، سدیشی اور سوراج کے علاوہ بائیکاٹ کا نعرہ بھی تھا اور انقلابی نوجوان
سمجھے کہ یہ تلک کی روح کا پرتو ہے۔ ترکِ موالات کے پروگرام میں مسلمانوں کو نظر آیا کہ یہ
دراصل شاہ عبدالعزیز اور اسلامی روایات کی ترجمانی ہے۔ ہمہ شما کے اطمینان قلب کے لئے
اس میں کھادی اور اچھوت سدھار کی چاشنی بھی تھی اور بہر نوع سب کو یقین تھا کہ گاندھی جی
نے سال بھر کے اندر سوراج دلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گاندھی جی کی بنیادی
تعلیم یعنی اہنسا پر کسی کو بھروسہ نہ تھا مگر سب جانتے تھے کہ " وحشت پسندی " کی تحریک سے
وطن آزاد نہیں ہوا۔ اس لئے کسی دوسرے حربہ کا استعمال ضروری ہے۔ غرضکہ ہر محبِ وطن اپنی
فہم کے مطابق عدم تشدد کے اصولوں کو گردانتا رہا۔ کسی نے اسے اخلاقی معجزہ قرار دیا کوئی سمجھا کہ یہ
واقعی انقلابی عمل ہے اور سب اس کے منتظر رہے کہ ہم سے آخری قربانی کا مطالبہ کیا جائے گا میری
آنکھوں کے سامنے وہ سماں آج بھی ہے جب ترکِ موالات کے اعلان پر لوگوں نے اس والہانہ
انداز سے اس کا خیر مقدم کیا گویا سرمد کو سولی پر چڑھنے کا مژدہ ملا ہے اور وہ اس کے متمنی ہیں
کہ ساری دنیا یہ " خوش تماشہ " دیکھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عالمگیر سامراجی جنگ کے بعد دنیا کا ایک
نیا انقلابی دور شروع ہو چکا تھا البتہ ہم بدنصیب اس کی ماہیت اور اس کے تقاضوں سے بے خبر تھے

ہندوستان میں جب گاندھی جی کی " ستیہ گرہ " کا چرچا شروع ہوا تو میں علیگڑھ کالج
میں تعلیم پا رہا تھا اور ہم سب اس کے منتظر تھے کہ مولانا محمد علی نظر بندی سے رہا ہو کر ہمیں بھی آزادی

وطن کی جدوجہد کا پیام سنائیں۔ بالآخروہ گھڑی آئی جب مولانا بیتول جیل سے چھوٹ کر امرتسر کانگریس کے اجلاس میں پہنچے اور اس کے فوراً بعد ترکِ موالات کا غلغلہ شروع ہوا۔ ہم نے سنا کہ علمائے ہند نے اس کے وجوب کا فتویٰ دیدیا ہے اور خلافت کمیٹی اس پروگرام کو مسلمانوں میں چلائے گی۔ کلکتہ کانگریس کے اجلاس نے جب اس کی منظوری دے دی تو ہم پر اور بھی فرض ہوگیا کہ ہم اپنے کالج کے منتظمین سے سرکاری امداد چھوڑنے کا مطالبہ کریں۔ یہ کہیے کہ اس نقطہ سے ہماری اپنی جدوجہد بھی شروع ہوگئی اور باقی ملک کی طرح علیگڑھ کالج میں بھی دو کیمپ بن گئے۔ خیر سے ہمارے کالج کے ٹرسٹی اُس گروہ کے افراد تھے جو ہر جمہوری رجحان کو صرف سیاسی بغاوت ہی نہیں بلکہ اسلامی روایات کا دشمن اور برطانوی حکومت کو "ظلِ خداوندی" سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ہر قدم پر اس کی مخالفت کی تھی کہ ہندوستانیوں کو کوئی بھی اختیار سونپا جائے۔ دوسری طرف ہماری نوجوان نسل تھی جو الہلال اور کامریڈ سے ہر بات کا ثبوت پیش کرتی تھی اور جس کی زبان پر دن رات انقلابی نظموں کا وِرد اور ہجرت اور جہاد کا چرچا تھا چنانچہ جب منتظمین کالج ترکِ موالات کی مخالفت میں مولانا اشرف علی تھانوی یا مولانا سلیمان اشرف کا قول پیش کرتے تو ہم فوراً مولانا ابوالکلام اور مولٰنا محمود الحسنؒ کی سند دیکر اُنھیں قائل معقول کر دیتے۔ اور جب وہ دعویٰ کرتے کہ خان بہادر بشیر الدین اور مولوی طفیل احمد جیسے مخلص "اولڈ بوائے" اُن کے ساتھ ہیں تو ادھر سے جواب دیا جاتا کہ محمد علی، شوکت علی یا حسرت اور ظفر علی خاں کا مرتبہ ان سے بدرجہا زیادہ ہے۔ بالآخر جب ہم نے طے کیا کہ مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی کو یونین کلب کی جانب سے بلایا جائے تو کالج کے پرنسپل نے علی گڑھ میں والدین کی ایک کانفرنس بلالی تاکہ ہم کسی طرح سے علی گڑھ چھوڑ کر گھر واپس جانے پر رضامند ہو جائیں اور جب ہم اس پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے تو پھر حکومت کی امداد طلب کی گئی۔ بہرحال ہماری دعوت پر صرف گاندھی جی ہی نہیں بلکہ علی برادران، مولانا ابوالکلام، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری آئے اور ہم نے ان کی تقریریں سن کر ترکِ موالات کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ یونین کا یہ منظر مجھے آج بھی یاد ہے جب غلام السیدین جیسے معتدل مزاج لوگوں نے۔ کم از کم اس وقت تحریک کو لبیک کہا

اور کسی کی ہمت نہ تھی کہ مخالفت میں تقریر کرے۔ اس جلسے کے دو چار دن بعد کالج کے ٹرسٹیوں کا اجلاس ہوا اور اُنھوں نے طے کیا کہ علیگڑھ کالج بدستور سرکاری امداد لیتا رہے گا۔

ٹرسٹیوں کے فیصلہ کے بعد مولانا محمد علی کے سامنے اب صرف ایک ہی راہ تھی کہ علیگڑھ کالج یا (مسلم یونیورسٹی) کی بجائے ایک آزاد دارالعلوم کی بنیاد ڈالیں چنانچہ اسی زمانہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ہاتھوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی اور کالج کی مسجد میں اس کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ منتظمین کالج اب اس درجہ حواس باختہ تھے کہ اُنھوں نے پہلے ہمارے بھنگی، بہشتی اور ڈائننگ ہال کا کھانا بند کیا اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو پھر مسلح پولس بلاکر ہمیں کالج کی چار دیواری کے باہر نکلوا دیا۔ آزمائش اور جدوجہد کے ان ایام میں مولانا محمد علی برابر ہمارے ساتھ رہے جن کی حیثیت ہماری نظر میں اب پیرومرشد کے علاوہ ایک رفیق ساتھی کی سی ہوگئی تھی۔

"بیعتِ رضوان" کا وہ دن بھی ہمیشہ یاد رہے گا جب اس سالارِ قافلہ نے ہم سب کو اکیلے اکیلے بلاکر یکی بارک کے ایک تنگ و تاریک کمرہ میں کلام پاک پر عہد لیا تھا کہ جبتک انگریزی اقتدار کا خاتمہ نہو ہمارے لئے برطانوی حکومت سے کسی حالت میں تعاون جائز نہیں ہے۔ اس عہد و پیمان نے جانے میری طرح کتنے نوجوانوں کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا حوصلہ بخشا اور ہم نے طے کیا کہ اب ہماری زندگی قومی جدوجہد اور وطنی آزادی کے لئے وقف ہو۔ (علی گڑھ کالج کے اخراج کے بعد یوں سمجھئے کہ جامعہ کی زندگی شروع ہوئی مگر اس بے سروسامانی کے عالم میں کہ کتب خانہ، معمل یا درسی عمارت تو کجا ہماری رہائش کا بھی کوئی سامان نہ تھا۔ بعض مقامی دوستوں کی مدد سے کرشنا آشرم اور ڈگی کے احاطہ میں کچھ خیمے نصب ہوگئے تھے اور یہی ہمارا کالج، بورڈنگ، کھیل کا میدان غرضکہ سب کچھ تھا مگر ہمیں محسوس ہوتا تھا گویا کہ ہمارے پاس راحت و آسائش کا خزانہ موجود ہے) اس زمانہ میں مولانا محمد علی کے وردِ زبان یہ شعر اکثر رہتا تھا۔ ؎

بے دستگاہ نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل
شوریست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

ہمیں تعلیم کا شوق ہی نہیں بلکہ ارمان تھا اور ہم اکثر منصوبے بناتے رہتے تھے کہ ایک دن وہ آئے گا جب جامعہ میں مولانا محمد علی جیسے انگریزی ادیب اور مؤرخ، انصاری اور اجمل خاں جیسے ماہرینِ طب اور ابوالکلام جیسے عالمانِ دین ہمیں درس دیا کریں گے! اور یہ کوئی بعید بھی نہ تھا، اس لئے کہ یہ لوگ براہ راست ہماری تعلیم کے ضامن اور جامعہ کے بانی تھے اور انھیں ان علوم کا ذوق تھا۔ مگر جامعہ والوں کو علم کے ساتھ ساتھ اس کا بھی پورا پورا احساس تھا کہ ایک آزاد قومی دارالعلوم کی پہلی شرط ہندوستان کی سیاسی آزادی ہے چنانچہ ہماری تعلیم کا سب سے بڑا جزو یہ تھا کہ ہم آئے دن اپنے وطن کی اجتماعی زندگی سے باخبر ہوتے جارہے تھے اور معاشرہ کی زندہ حقیقتیں ہمیں درس دے رہی تھیں جس کی تکمیل بالآخر جیل خانوں میں جاکر ہوئی۔ جامعہ کی بدولت مجھے اور میرے دوسرے رفیقوں کو کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں شریک ہونے کا موقعہ ملا بلکہ یہ دستور ہوگیا کہ ہم کانگریس کے ہر سالانہ جلسے میں وفد بناکر جاتے اور ان قومی اجتماعوں سے ایک نئی اُمنگ اور تازگی لے کر واپس آتے تھے۔ ناگپور کا تاریخی اجلاس اس کی ابتدا تھی اور ہم سب نے دفعتاً محسوس کیا کہ اس قومی ہفتہ کے تبرکات علی گڑھ کی ذہنی تربیت اور کالج کے کتابی علوم سے کہیں زیادہ گراں اور سبق آموز تھے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ اب ہماری جامعہ کی زندگی اور سڑک پار مسلم یونیورسٹی کی علمی قدروں میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا تھا اور یہ فرق اس درجہ بنیادی تھا کہ جہاں ہمیں ناگپور کے اجلاس میں حیات تازہ نظر آئی وہاں مسلم یونیورسٹی کے بند پانی میں ایسے ذہن بھی تربیت پارہے تھے جو ان قومی اجتماعوں کو "مینڈک کانفرنس" سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ ؎

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا۔

جامعہ کے طلبہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے والدین کا اصرار رسمی تعلیم پر تھا۔ چنانچہ ان کے لئے مولانا محمد علی نے ایک عارضی نصاب بنایا اس کے مطابق مولانا محمد علی انگریزی ادب اور جدید تاریخ اور مولانا محمد اسلم تاریخ اسلام کا درس دیتے تھے۔ ہم مولانا شرف الدین صاحب سے اردو، خواجہ عبدالحی صاحب سے تفسیر قرآن اور مولانا محمد سورتی صاحب سے عربی سیکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان محترم بزرگوں کی تعلیم سے فیضیاب ہونا ہی ہماری بہت بڑی سعادت تھی چنانچہ ہیں نے محسوس کیا کہ جامعہ کے تفسیر کے درس مولانا سلیمان اشرف مرحوم کے درسوں سے بھی زیادہ دلکش تھے۔ غالباً نئے جذبہ نے یہ نیا احساس پیدا کیا تھا۔ اس میں ہمیں شراب کے ساتھ "چشم ساقی" کا خمار بھی نصیب ہو جاتا تھا۔

یہ تھا جامعہ کا پہلا دور اور انقلابی دور ۱۹۲۰ء کے جامعی اسی ماحول میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ میرے اس دور کے ساتھیوں میں ڈاکٹر ذاکر، ڈاکٹر حمید اور بہت سے اور جامعی ہیں اور ہم میں سے ہر شخص اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ جامعہ کے قلندروں کا دور دوسری جگہ کی خوش گپیوں سے کہیں زیادہ کشش رکھتا ہے۔

اب جامعہ ملیہ دہلی میں ہے اور یہ دور جامعہ کا خالصاً تعمیری دور ہے اب پرانی بے سروسامانی کی بجائے جدید قسم کی عمارتیں، خوشنما رہائشی بنگلے ہیں بلکہ اس نوآبادی کی وجہ سے اس کا نام ہی جامعہ نگر پڑ گیا ہے۔ اب یہاں ایک نئی نسل کی پرورش ہو رہی ہے جس کی جسمانی اور ذہنی تربیت کے لئے جدید تعلیمی اصولوں پر اعلیٰ ترین اہتمام ہے فنی اعتبار سے جامعہ ملیہ کا معیار ہندوستان کی کسی دوسری یونیورسٹی سے کم نہیں۔

عجب نہیں کہ اس دہلی میں، جہاں، جامعہ کے اردگرد، پرانی بادشاہتوں کے کھنڈر پڑے ہوئے ہیں جمہوری بیداری کے اس جیتے جاگتے نشان کو عمر دوام نصیب ہو۔ ہمارے نزدیک جامعہ کے تصور کی پرورش اقبال کی زبان میں انقلابی "طوفانی" نے کی ہے اور اس کے دوام کی شرط اول یہی ہے کہ وہ ان طوفانوں کے لئے نئی نسل کو تیار کرے، جو، ابنسانی آزادی اور ایک نئی زندگی کی تعمیر کے لئے آنے والے ہیں۔

(ڈاکٹر محمد اشرف)

جامعہ کا تمدنی پسِ منظر

جب دو تمدنوں کا آپس میں ملاپ ہوتا ہے تو دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر ایک تیسرا تمدن وجود میں آجاتا ہے۔ اس ٹکر سے مفتوح قوم میں ایک بار پھر حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ قوتیں دوبارا ابھر آتی ہیں جن کی عدم موجودگی نے اس کی زندگی میں جمود پیدا کر دیا تھا۔ اس طرح قوموں کی زندگی میں ارتقا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان آئے تو اپنے ساتھ ایک زندگی بخش تصورِ حیات اور بہتر تمدن لائے تھے۔ یہاں آکر ان کا ملاپ ایک دوسرے تمدن سے ہوا۔ انھوں نے کچھ اچھے اثرات چھوڑے اور کچھ یہاں کے اثرات قبول کئے۔ اس طرح سے ایک خالص ہندوستانی تمدن پیدا ہو گیا۔

قوموں کی زندگی کا دارومدار اس نظامِ فکر پر ہوتا ہے جس کی وہ حامل ہوتی ہے۔ ذہنی انتشار اکثر قوموں کی موت کا سبب بنا ہے۔ ایک عرصہ بعد جب قومی ذہن اس قابل نہیں رہتا کہ نئے نئے مسائل حل کر سکے تو قوم کی زندگی پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ اس یکسانیت کا نتیجہ قوم کے ذہنی و دماغی انتشار اور تنزل کی صورت میں نکلتا ہے ضرورت ہوتی ہے کہ قوم کسی انقلاب سے دوچار ہو تاکہ اسکے نظامِ فکر کی تشکیل دوبارہ ہو سکے جو قومی ضروریات اور زمانے کے تقاضے کو پورا کر سکے۔ ان حالات میں سیاسی وحدت کا کمزور ہو جانا موت کا پیغام ہوتا ہے مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب کچھ ہی ہوں۔ محمد شاہ کے زمانے میں اکبر اور اورنگ زیب کی بنائی ہوئی سلطنت منہدم ہو گئی سیاسی قوت کے ختم ہو جانے سے ہندوستان باہر کی مختلف قوموں کی زور آزمائی کا میدان بن گیا۔ اندرون ملک میں جاٹوں، سکھوں، مرہٹوں

اور روہیلوں نے طوائف الملوکی پیدا کردی۔ ان حالات میں نادر شاہ کے حملے نے دہلی کی مرکزی حیثیت بالکل فنا کردی اور ملک غیروں کا غلام بن گیا۔

مسلمانوں کی سیاسی قوت فنا ہوگئی لیکن وہ نظام فکر جس نے ان کو یہ قوت دی تھی موجود تھا۔ ہندوستان کی سب سے پہلی تحریک جس نے اس فکر کی ترجمانی کی اور مردہ قوم میں زندگی کا خون دوڑانا چاہا اسے بدنام کرنے کے لئے "وہابی" تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک ان بنیادی اصولوں پر قومی زندگی کی دوبارہ تعمیر کرنا چاہتی تھی جو ملتِ اسلام کے سنگ بنیاد رہ چکے تھے۔ ان کی ناکامی کا راز ان کے طریقہ کار میں پوشیدہ ہے۔ ہندوستان کے باہر بھی ان کی کوششیں ناکام رہیں اور صرف اس وجہ سے کہ اس تحریک کے چلانے والوں نے حالات کا غائر مطالعہ نہ کیا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے تھے کہ معاشی و معاشرتی ماحول تبدیل ہو چکا ہے ان حالات میں کوئی ایسی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی جو پرانی قدروں کی حامل ہو۔

۱۸۵۷ء کی تحریک اس سلسلے کی آخری اور ناکام کوشش تھی جس نے پرانے نظام کو ایک بار پھر عملی شکل دینا چاہا۔ غدر نے مسلمانوں کی حیثیت بالکل ختم کردی۔ حکومت کا پردہ اٹھ جانے کے بعد یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہوگئی کہ اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ حکومت ان کا حق سمجھا جائے۔ اس تلخ حقیقت کے احساس نے مسلمانوں کے سوچنے اور سمجھنے والے دماغوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کا جائزہ لیں کہ آیا وہ اس قابل ہو سکتے ہیں ہیں کہ موجودہ طوفان خیز حالات میں اپنا قومی تحفظ کر سکیں۔

سیاسی اقتدار کے ختم ہوتے ہی ان کا ذہنی تفوق بھی ختم ہو گیا تھا حکومت کے ساتھ دولت اور عزت بھی جاتی رہی تھی۔ ان میں کوئی ایسی خصوصیت باقی نہ رہی تھی جو انھیں حیات نو دینے کا ذریعہ بن سکے

اس سیاسی و ذہنی انتشار کی حالت میں چند تحریکیں پیدا ہوئیں جنھوں نے مسلمانوں کی ذہنی و معاشرتی زندگی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ان تحریکوں کے بنیادی فکر میں اختلاف ہونا

تعجب کی بات نہیں۔ ہر انتشار کی کیفیت مختلف الخیال لوگ پیدا کر دیتی ہے جو ایک ہی مقصد حاصل کرنے کے لئے جدا جدا فکر رکھتے ہیں اور مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی کئی تحریکیں اٹھیں جن میں دو ایسی بڑی تحریکیں کہی جا سکتی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں۔

سر سید احمد خاں کی رہنمائی میں ایک تحریک پیدا ہوئی جس نے اس بات کی کوشش کی کہ مغربی تہذیب و تمدن، علوم اور معاشرت سب کو اپنا لیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ مقصد ترقی کرنا اور ایک اچھے تمدن کو اپنانا ہے تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کا شمار بھی دنیا کی متمدن قوموں میں کیا جا سکے۔ اس تحریک کے ماننے والے پرانے تمدن کا انکار نہ کرتے تھے لیکن ان کی دلیل تھی کہ زمانہ گذر گیا، حالات تبدیل ہو گئے اب اگر زندہ رہنا ہے اور عزت کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو ہمیں یورپی تمدن کو اپنانا ہوگا۔ کیونکہ یہی ایک تمدن ہے جو دنیا کی ترقیات کا ارتقائی نتیجہ ہے۔

سر سید احمد خاں کی تحریک اپنی نوعیت میں بڑی ہمہ گیر تھی جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح کی کوششیں کیں۔ مختصر طور پر اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اس تحریک کے چلانے والے چاہتے تھے کہ ہندوستانی انگریزی لباس اور دوسری یورپ کی ظاہری چیزوں کو اپنا لیں دوسرے اپنی معاشرتی اصلاح کریں تاکہ موجودہ حالات میں وہ اس قابل ہو سکیں کہ انگریزیت ان پر اپنا پورا اثر کر سکے۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ مذہب کا تصور بدل دیں اور اس کی تاویل اس طرح کریں کہ وہ یورپی علوم کا انکار نہ کر سکے۔

سر سید اور ان کے رفقا، سمجھتے تھے کہ وہ اپنے مقصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جبتک کہ ہندوستانی مسلمانوں اور حاکم انگریزوں میں اچھے تعلقات قائم نہ ہو جائیں اس سلسلہ میں انھوں نے اس بات کی کوشش کی انگریزوں کے دماغ سے یہ خیال نکال دیا جائے کہ غدر کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں ہی پر ہے اور مذہبی اعتبار سے انگریزوں اور مسلمانوں میں سمجھوتہ ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھایا جائے کہ ان کی مخالفت جہالت کا

نتیجہ ہے جس سے انھیں نقصان کے سوا کچھ نہیں مل سکتا۔ ان خیالات کی اشاعت کے لئے اسباب بغاوت ہند اور ہندوستان کے فرمانبردار مسلمان جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ ہندوستان میں ہمنوا پیدا کرنے کے لئے ایسے ادارے کھولے گئے جو ہندوستانی عوام کو مغربی علوم وفنون سے آگاہ کرائیں اور یہ بتائیں کہ انگریزی راج ان کے لئے کس قدر مفید ہے۔

مغربی علوم سے پوری طرح مستفید ہونے اور گورنمنٹ کی ملازمت حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مغربی علوم وزبان سکھانے کے لئے باقاعدہ کالج قائم کیا جائے، جس میں اس بات کی کوشش کی جائے کہ مغربی علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو بھی فروغ ہو تاکہ آئندہ نسلیں تمدنی اعتبار سے انگریزوں کی شبیہ اور مذہباً مسلمان ہوں۔

معاشرتی اصلاح کے لئے رسالے جاری کئے گئے تاکہ وہ مسلمانوں کو نئی روشنی سے روشناس کرے اور تمام پرانے رجعت پسندانہ خیالات وتصورات سے انھیں نجات دلائے۔ اور انھیں اس بات کی ترغیب دلائے کہ پرانا معاشرتی نظام چھوڑ کر وہ اس سے بہتر نظام کو اپنا لیں۔ مسلمانوں کا متوسط طبقہ پوری طرح سے انگریزوں کی سرپرستی کا خواہاں تھا اور ان کے دستِ شفقت کا طالب تھا اس نے اس تحریک کو لبیک کہا اور بہت جلد لوگ مغربی تعلیم حاصل کرنے لگے جس سے نہ صرف یہ کہ ان کو سرکاری ملازمتیں مل جاتی تھیں بلکہ انھیں بغیر کسی کد وکاوش کے ایک ترقی یافتہ تمدن بھی مل جاتا تھا۔

مذہبی اصلاح میں سب سے زیادہ اس بات کو اہمیت دی گئی کہ ہر اس چیز کا انکار کر دیا جائے جو مغربی علوم سے مختلف اور مغربی تمدن کی روح کے مطابق نہ ہو۔ عقائد کی جانچ کا معیار دلائل اور منطق ہو۔ حدیث وفقہ کا انکار کیا جائے کیونکہ ان کی بہت سی باتیں سائنس ومنطق کے معیار پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ بقول خود سر سید مرحوم کے "قرآن ہی اسلام کی اساس ہے اور باقی تمام دوسری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں" مختصر الفاظ میں سر سید نے مذہب کا ایک ایسا تصور پیش کیا جو زمانہ کی ضروریات اور مغربی تمدنی خصوصیات کے منافی نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اس تحریک نے مسلمانوں کی جو خدمات کی ہیں اور جتنی بڑی تعداد میں لوگوں پر اپنا اثر چھوڑا ہے اس کی تاریخ میں مشکل سے مثال مل سکے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس نے مسلمانوں کی صحیح تمدنی رہنمائی کی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے بہت سے خیالات پُرانے تمدن کے خلاف ردعمل کا نتیجہ تھے۔

انھوں نے بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے "یہ نکتہ فراموش کر دیا تھا کہ جو قوم ایک خاص تمدن میں جڑ پکڑ چکی ہے اس سے الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی ہے کیونکہ قوموں کا تعلق اپنے ذہنی ماحول یعنی اس تمدن سے جس میں انھوں نے نشوونما پائی ہے اس قدر استوار ہوتا ہے کہ اس کو قطع کرتے ہی گویا ان کے شجر حیات کی جڑیں کٹ جاتی ہیں اور وہ مرجھا کر رہ جاتا ہے"۔ ہمارے مصلحین نے اسی قسم کی غلطیاں نظام تعلیم مرتب کرنے میں کیں۔ یہ بھول گئے کہ تعلیم تمدنی زندگی کا سب سے اہم جزو ہوتا ہے اور کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی ہے۔ جب تک اس کا نظام تعلیم اس کے تمدن کی حفاظت کا ذریعہ نہ ہو۔ اور اس کے نشوونما کا سبب نہ بن سکے۔ انھوں نے یہ نکتہ فراموش کر دیا کہ مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ اپنے بزرگوں کے چھوڑے ہوئے علوم و فنون میں پوری دستگاہ پیدا نہ کر لیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو مغربی علوم کا انکار کر دینا چاہیئے بلکہ صرف یہ کہ وہ اسی وقت ان علوم سے پورا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جبکہ ان کا ذہن اپنے تمدنی افکار کے سانچے میں پوری طرح ڈھل چکا ہو اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہو کہ وہ دوسری اقوام کے افکار کو بجنسہٖ قبول کر لینے کے بجائے ان کو اپنے ماحول و زندگی کے مطابق ڈھال سکیں۔ اور ان سے مستفید ہو سکیں۔

سرسید کی تحریک کے بالکل برعکس دیوبند کی تحریک تھی جس نے قطعی انگریزی مذاق، انگریزی طرز معاشرت، انگریزی اخلاق اور انگریزی زبان کا انکار کر دیا۔ اس تحریک کے علمبردار چاہتے تھے کہ ایک بار پھر پرانے تمدن کو زندہ کیا جائے۔ اور کھوئی ہوئی عظمت کو اسی شکل میں حاصل کرنے کی کوشش کیجائے۔ اس تحریک کے بعض رجحانات وہابی تحریک سے ملتے جلتے تھے۔ اور

شروع میں تو اس کی معزز شخصیتیں اسی سلسلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس تحریک کو صرف دیوبند تک محدود سمجھنا غلطی ہوگی وہ رجحانات جو اس تحریک کے سنگ بنیاد تھے ہندوستان کے ایک بڑے طبقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔

اس تحریک کے چلانے والے سرسید کی تحریک کے ہر طرح مخالف تھے۔ ان کو ہر اس چیز سے انکار تھا جسے نئی روشنی کا نام دیا جا سکتا تھا۔ مغربی طرز معاشرت اختیار کرنے کی بجائے وہ پرانے اسلامی طریقۂ زندگی کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ تعلیم میں بھی وہ اسی سختی سے مغربی علوم کا انکار کرتے تھے۔ اور اس کے آگے ایک قدم بھی بڑھانا گناہ کے مترادف سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس حقیقت سے منھ پھیر لیا تھا کہ کوئی قوم علم و تعلیم میں حدیں مقرر نہیں کر سکتی اور نہ قلعہ بند ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اس نکتہ کو بھی نظر انداز کر دیا تھا کہ زندگی کے کسی شعبے میں وہ دوسروں سے بے تعلق ہو کر ترقی نہیں کر سکتے ہیں۔ اور اس وقت تک ان کی تعلیم ناقص اور نامکمل ہوگی جب تک کہ وہ ان ترقیات کا انکار کرتے رہیں گے جو دوسری قوموں نے خود ان کے اسلاف کے چھوڑے ہوئے علوم کو زمانے اور ماحول کے مطابق بنا کر کی ہیں۔ ان باتوں کو نظر انداز کر کے وہ صرف بغداد و غرناطہ کی یونیورسٹیوں کو یاد کرتے اور وہی تعلیم دینا چاہتے جو ان میں رائج تھی۔

زندگی کے دوسرے تصورات کی طرح ان کا مذہبی تصور بھی مختلف تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہبی تصورات زمانے کے ساتھ بدلتے نہیں جو بدل جائے وہ مذہب نہیں۔ مذہب ایک نظام فکر بھی ہے اور نظام تمدن بھی۔ اس پر زمانے کے حوادث کا اثر نہیں ہوتا۔ یہ ایک زندگی کا دستور العمل ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

ان اصلاحی تحریکوں کے علاوہ ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں پیدا ہو گئی تھیں ہندوستان میں انگریز آئے تو نہ صرف انھوں نے یہاں کے معاشرتی و تمدنی افکار کی بنیادیں ہلا دیں بلکہ معاشی نظام کو بھی یکسر تبدیل کر دیا۔ اس وقت نہ صرف کسانوں اور زمینداروں میں ایک کشمکش

شروع ہوگئی تھی بلکہ اس کا میدان بہت وسیع ہوگیا تھا۔ انگریز ہندوستان میں سرمایہ داری رائج کرنے پر مجبور تھا۔ ابتدائی حالات میں ان کو اس میں مشکلات کا تصور بھی نہ تھا۔ لیکن بعد میں ہندوستانی سرمایہ داروں کے مفاد انگریزی سرمایہ داروں سے ٹکرانے لگے۔ اس طرح سے ان دونوں میں جو کشمکش شروع ہوئی اس کا نتیجہ ان بڑی بڑی سیاسی تحریکوں میں نکلا جنھوں نے نہ صرف ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا کر دیا بلکہ جو ہندوستان کی جنگ آزادی میں آگے آگے رہی ہیں۔

ہندوستان کا متوسط طبقہ جو انگریزی تعلیم سے روشناس ہونے کے باوجود معاشی بدحالی میں مبتلا تھا اس نے پورے جوش کے ساتھ ان تحریکوں کو لبیک کہا۔ قومیت کے بیج مغربی تعلیم نے بو دئے تھے۔ بین الاقوامی حالات نے ان کو تقویت دی اور سیاسی پارٹیوں نے اس کو سیاسی بیداری کا ذریعہ بنا دیا۔ بیسویں صدی میں دنیا نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں۔ یہ دور مشرقی ممالک میں بڑے انقلابات کا پیغام لے کر آیا تھا۔ ٹرانسوال کی جنگ نے ہندوستان میں قومیت کا احساس قوی کر دیا۔ جاپان سے روس کی شکست نے مشرقی قوموں کو بتلا دیا کہ ایشیائی طاقتیں بھی یورپ کو شکست دے سکتی ہیں۔ اس جنگ نے قومی جذبے کو جس قدر فروغ دیا اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ انھیں حالات میں لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کی تجویز کو عملی جامہ پہنانا چاہا۔ ہندوستانیوں کو اپنے قومی جذبات کے اظہار کا پہلا موقع ملا۔ اور پہلی بار ہندوستانی قومیت کی ٹکر برٹش شہنشاہیت سے ہوئی۔ ہر طرف سے آزادی کے نعرے بلند ہونے لگے اور ہندوستانی پورے اعتماد و خودداری کے ساتھ انگریزوں کے مقابلے میں نکل آئے۔

حالات بہت تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے اور بقول لائڈ جارج کے دنیا والے صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کر رہے تھے۔ چین کے انقلاب، ترکی میں نوجوانوں کی تحریک اور عالمگیر اتحاد اسلام جیسی تحریکوں نے بڑی حد تک ہندوستانی جنگ آزادی میں مشعل راہ کا کام دیا۔

جنگ عظیم نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ہلچل مچادی۔ جنگ عظیم کے بعد کی تحریکوں نے اور خاص کر انقلاب روس نے ہندوستان میں بھی زلزلہ پیدا کر دیا۔ اور ملک میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ۱۹۲۰ء کے اس ناکام انقلاب کو خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

طوفان مغرب نے ہندوستانیوں میں قومیت کا احساس پہلے ہی پیدا کر دیا تھا اب انھیں اس بات کا خیال ہوا کہ مکمل آزادی اور قومی تمدن کی حفاظت کے لئے قومی تعلیم کا ہونا لابدی ہے۔ اس خیال کو ایک عملی شکل دیدی گئی اور اس عملی شکل کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام دیا گیا جامعہ کے اساتذہ جامعہ کے طلباء اور جامعہ میں کام کرنے والے اپنے آپ کو سیاسی سیلاب سے جدا نہ رکھ سکتے تھے اور ایسی حالت میں یہ تو ان کے لئے قطعی غیر ممکن تھا جبکہ اس کی بنیاد رکھنے والے خود ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی رہنما تھے۔ گویا دوسرے الفاظ میں اس وقت کی جامعہ ایک ایسا پلیٹ فارم تھی جس سے سیاست کے میدان میں کام کرنے والے نوجوان پیدا کئے جائیں۔

حالات جلد ہی تبدیل ہو گئے جنگ آزادی کا وہ طوفان جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے لوگوں کو ایک مقصد کے لئے یکجا کر دیا تھا۔ وقت کے ہاتھوں تھم گیا۔ اب وقت کو جامعہ کی ضرورت باقی نہ رہی تھی چنانچہ اس کے توڑ دینے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔

لیکن زمانے کو ایک ایسی تعلیم گاہ کی ضرورت تھی جو ہندوستان کے تمدن کی حفاظت کر سکے۔ چنانچہ خوش قسمتی سے جامعہ کو چند ایسی ہستیاں مل گئیں جنھوں نے جذبات سے الگ ہو کر اس کے مقاصد مقرر کئے اور اس کو ایک ایسی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا جو صحیح معنوں میں ہندوستانیوں کی تمدنی رہنمائی کر سکے اور قومی ذہن و افکار کی تربیت کر سکے۔

جامعہ سے پیشتر جو تمدنی تحریکیں وجود میں آئیں وہ کسی طرح ہندوستان کی تمدنی زندگی

کی حفاظت اور اس کو نشو و نما دینے کے قابل نہ تھیں ضرورت ایک ایسے ادارے کی تھی جو ماحول اور وقت کے مطابق قوم کی ذہنی تربیت کر سکے اور اس کی تمدنی زندگی کی صحیح نشو و نما کا ضامن ہو پچیس سال سے جامعہ اپنے ان مقاصد پر صبر و استقلال سے قائم ہے جو اس تحریک کی بنیاد ہیں۔

اس عرصہ میں جامعہ کے کاموں کی جس قدر توسیع کی ضرورت تھی بعض مشکلات کی بنا پر نہیں کی جا سکی۔ اب تک وہ تعلیم میں قوم کی رہنمائی کرتی رہی ہے۔ اب وہ مسلمانوں کو ایک نظام فکر دینے والی ہے جس پر ان کے تمدن کی عمارت کھڑی کی جا سکے۔ شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے، جامعہ کے مستقبل کے پروگرام اور وقت کے اہم تقاضوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے:۔

> "یہ ضرورت بھی بہت ہی اہم ہے کہ ہم خود جانیں اور اوروں کو بتا سکیں کہ ہم کن افکار کے حامل ہیں، ہم جانیں اور بتا سکیں کہ انفرادی زندگی کی تکمیل اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لئے ہم کیا اصول رکھتے ہیں اور خالق کائنات اور اس کی مخلوق سے ہمارا کیا رشتہ ہے۔ اسلام کے دامن میں شخصیت کیسے پرورش پاتی ہے، سیاست کیسی ہوتی ہے، معیشت کا کیا نقشہ ہوتا ہے، اقوام کے تعلقات باہمی کا ہمارے یہاں کیا تصور ہے اور ہم انسانیت کے لئے کس مستقبل کے متوقع اور کس منزل کے لئے ساعی ہیں!"

تقی احمد سید

جامعہ کے
تعلیمی اور سیاسی محرکات

جس درس گاہ میں طالب علموں کو خرابیاں معلوم ہوتی ہیں اُس کو چھوڑتے اور جس میں اُنھیں خوبیاں نظر آتی ہیں اُس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسا فعل ہے جو روزانہ ہزاروں طالب علم کرتے ہیں۔ اس عادت یا دستور کو دیکھتے ہوئے شاید یہ سمجھا جائے کہ ہم لوگوں کو اپنے اپنے کالج پسند نہ تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ہم لوگ بہتر اور خوب تر سمجھتے تھے اس لئے اپنے اپنے مدارس کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیہ میں چلے گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت جامعہ کا وجود ہی نہ تھا۔ اُس کی خوبیاں جو ہم کو اپنے اپنے کالج چھوڑنے اور وہاں جانے پر آمادہ کرتیں کسی کو معلوم ہی نہ تھیں ہمارے سامنے ایک مدرسے کو چھوڑ کر دوسرے میں جانے کا سوال نہ تھا بلکہ تعلیم کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر کن وجوہ نے ہم کو اس نئے تجربہ پر آمادہ کیا جس میں دیکھے بھالے جانے بوجھے مدارس کو چھوڑ کر ہم لوگ ایسا جامعہ بنانے میں مصروف ہوئے جو ذہنوں میں تو قائم ہو گیا تھا لیکن اِس دنیا میں اُس کی کوئی مادی شکل ہی نہ تھی۔

اس نئے تجربے میں بہت سے سماجی، تعلیمی یا تاریخی اور سیاسی اثرات و رجحانات کام کر رہے تھے۔ یہ کیا تھے۔ اس کی تشریح کے لئے تاریخ کے ورق لوٹنے پڑیں گے تاریخ بتاتی ہے کہ اٹھارویں صدی میں ہمارے سماج میں گھن لگنے لگا تھا۔ مل جل کر کام کرنے اور سب کی بھلائی چاہنے کے بجائے لوگ اپنی اپنی بھلائی چاہتے اور اُسی کے لئے کوشش کرتے اور اسی کو ترقی و عقلمندی سمجھتے تھے۔ ممکن ہے آپ میرے اس بیان کو غلط سمجھیں لیکن اردو کی یہ مثل "آپ بھلے تو جگ بھلا" اس نفسا نفسی اور خود غرضی کا ایسا ثبوت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا

تاریخ کے صفحات لوٹتے جایئے آپ کو ہر دوسرا شہر یا قصبہ "گڑھ" ملے گا اور ہر اہم واقعہ جنگ۔ یہ کیوں اس لئے کہ ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا تھا اور کسی حالت میں بھی دوسرے سے مل کر کام کرنے پر تیار نہ تھا۔ بھلا ایسا سماج کب تک بچا رہتا۔ اس کی ایک ایسے بدیسی نظام سے ٹکر ہوئی جس کے افراد سماج کی بہبود کو نظر انداز نہیں کرتے تھے تو پلاسی میں اس کا کھوکھلا پن نظر آیا۔

پلاسی کی شکست کلائیو کی ذاتی خوبیوں یا مرزا محمد سراج الدولہ کی شخصی خرابیوں کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ ذاتی حیثیت سے ہندوستانی سماج کا نمائندہ سراج الدولہ بدیسی نظام کے لیڈر کلائیو یا واٹسن سے بدرجہا بہتر تھا۔ اس کی اخلاقی قدریں ان سے کہیں اچھی تھیں۔ لیکن ان سب ذاتی خوبیوں کے باوجود ہندوستانی نظام "آپ بھلے تو جگ بھلا" کے ستون پر قایم تھا۔ اس لئے ذاتی بھلائی یا جاہ کی خاطر ہندوستانی دوسرے نظام کو سہارا دینے اور قائم کرنے کے لئے آمادہ تھے انھوں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا وہ یہ سوچتے ہی نہ تھے کہ آخر تھانی کا بیگن بننے سے فائدہ کیا ہوگا۔ اس نفس پرستی اور راندمی زندگی کی وجہ سے ۱۷۵۷ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک جتنی کوششیں اس سماج کو اپنی جگہ قائم رکھنے کی کی گئیں وہ سب کی سب خاک میں مل گئیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ٹیپو جیسا شخص خاک ہند سے اٹھا جس نے اپنے گھر کو ٹھیک کیا باہر کی طاقتوں سے ہندوستان کا رشتہ جوڑا لیکن یہ سب اوپری رنگ و روغن اس گھن کو نہ روک سکا جو اندر ہی اندر اس کو کھا گیا اور ۱۸۵۷ء میں تو بالآخر تختہ ہی لوٹ دیا۔

۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا اس نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور مسلمانوں میں اصلاحی کوششیں شروع ہوئیں۔ سید احمد شہید کے گروہ نے مذہبی اصلاح کو لیا جس میں ایک سیاسی پہلو بھی تھا اور سرسید نے نئی تعلیم پھیلانے کا بیڑا اٹھایا جس کے ذریعہ وہ ہمارے سماج کو بھی بدلنا چاہتے تھے۔ ان دونوں گروہوں میں اخلاص کے باوجود کمی یہ تھی کہ سید صاحب کے ساتھیوں نے وقت کے تقاضوں کو نہ پہچانا اور سرسید نے اس زمین کا خیال نہ رکھا جس میں وہ نئی پود لگانا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دو الگ گروہوں میں ہم آہنگی اور صحیح تعلق پیدا ہونے

کے بجائے ٹکر ہوئی اور قوم کی وہ قوت جو تعمیر میں صرف ہوتی آپس کی ٹکر میں ضائع ہوگئی۔ دونوں نے اپنی اپنی کوششوں کو خود ساختہ پیمانوں سے ناپا اور خوش ہوئے کہ جو کچھ کرنا تھا کرلیا لیکن اصل پیمانہ خود وقت ہے اور اس کا فیصلہ ان دونوں کے خلاف تھا۔

سرسید نے نئی تعلیم کے ذریعہ جنت کے دروازے کھولنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب مسلمانوں کی اکثریت نے اس کا رُخ کیا تو نئے مدارس کے اخراجات "دور باش" کی حوصلہ شکن صدا سنا رہے تھے۔ بھلا بے مایہ مسلمان جس کی اوسط سالانہ آمدنی لارڈ کرزن کے زمانے تک ڈھائی روپیہ فی کس تھی وہ اپنے بچہ کی تعلیم پر پچیس تیس روپے ماہانہ کیسے خرچ کرسکتا تھا اور جب غریب سے غریب مسلمان کے لئے تعلیم کا دروازہ نہ کھلے تو زمینداروں اور اُمراء کے گنے چنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم سے تمام قوم کے دماغ روشن نہیں ہوسکتے تھے۔ رونا تعداد ہی کا نہ تھا بلکہ کیفیت کا بھی۔ تقریباً آدھی صدی یعنی ۱۸۷۵ء سے لیکر ۱۹۱۰ء تک ان کالجوں سے نہ کوئی بڑا مہندس نکلا اور نہ چوٹی کا سائنس داں۔ نہ بین الاقوامی شہرت کا عالم۔ ہاں ان کالجوں کے گریجویٹ سرکاری دفاتر اور محکموں کی رونق بنے ہوئے تھے۔ درباروں کی چہل پہل۔ دفاتر کی ہماہمی کے باہر کروڑوں مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی غربت اور بے روزگاری قوم کو برابر نیچے دھکیل رہی تھی۔ قوم اس کو کب تک برداشت کرتی آخر زبان اکبر بن کر چلا اُٹھی۔

یہ وادی ہے طور سے خالی	یہ محفل ہے نور سے خالی
یہ جنت ہے حور سے خالی	پاس سے خالی دور سے خالی

یہ شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ قوم کے اس دردمند دل کی کراہ ہے جو اتنے سال کی ترقی کے باوجود اپنے تئیں تہی دامن پاتا تھا۔ اس کو احساس تھا کہ کمی کس چیز کی ہے چنانچہ اسی نظم میں اسکا بہت صاف طور سے اظہار کیا گیا ہے۔

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے	قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے چلاؤ تیشے	تا کہ کٹیں افلاس کے بیشے

ایسی تعلیم سے بھلائی کی کیا امید ہو سکتی تھی جس کے نصاب کا تعین۔ اساتذہ کا تقرر ان کی نگرانی غرض پورا نظام بدیسی آقاؤں کے ماتحت تھا وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہتے اور جانتے تھے۔ ہندوستانیوں کی ضرورتوں سے ان کو واسطہ نہ تھا۔ کچھ دن نوکریاں ملتی رہیں اور گاڑی چلتی رہی لیکن جوں جوں زمانہ بدلتا گیا۔ اس تعلیم کی کامیابی کو قومی ضرورتوں کی کسوٹی پر کسا گیا تو اس کی خامیاں ظاہر ہوئیں۔

زبان کا تمدن اور قومی زندگی سے گہرا واسطہ ہے اس کی حفاظت کی خاطر قوموں نے خون بہایا ہے۔ ممالک کی نئی حدبندیاں کرائی ہیں۔ ہندوستان کے اس تعلیمی نظام نے ملکی زبان کو اچھوت بنا دیا تھا۔ ادنٰی کاموں یا معمولی بات چیت میں تو اس کا استعمال کیا جاتا تھا لیکن اعلیٰ خیالات کے لئے انگریزی تھی۔ جیسے جیسے ہندوستانی بیدار ہوتے گئے یہ بیگانگی طبیعت کو کھلنے لگی اور بالآخر قوم پکار اُٹھی۔

ڈر ہے گونگا نہ ہو جائے کہیں ہندوستان

ایک زبان ہی پر وار نہیں ہوا۔ مدرسوں کے کمروں میں آئے دن ذلت اور بے چارگی کا احساس ہوتا تھا خصوصاً تاریخ کے گھنٹہ میں۔ کبھی مغل دور کا مقابلہ برطانیہ کے دور سے کیا جاتا تھا اور برطانوی دور کی خوبیاں اور مغل حکومت کی زبردستیاں ذہن نشین کرائی جاتی تھیں۔ محمود غزنوی کے دور کا ذکر ہی نہ کیجئے۔ اورنگ زیب اور سیواجی۔ غرض ان سب کی مکروہ تصویریں جن میں تاریخی واقعات نہیں بلکہ مصنف کے ذاتی تعصبات کا گہرا رنگ ہوتا تھا اور پھر مشرق و مغرب کا فرق۔ کالے اور گورے کی تمیز تاریخ کے نام سے وہ سب پڑھایا اور یاد کرایا جاتا تھا جس میں ذلت محسوس ہوتی تھی اور اگر ترک موالات کی تحریک دنیا کو بدل نہ دیتی تو شاید پچھلی تاریخ کا کوئی باب بھی روشن معلوم نہ ہوتا۔

یہ تھے وہ تعلیمی محرکات جنھوں نے ہم لوگوں کو نئے تجربے پر آمادہ کیا۔ ان تعلیمی محرکات کو اتنا موثر وقت کی سیاست نے کر دیا۔ اگر سیاسی حالات ویسے نہ ہوتے جیسے ۱۹۲۰ء میں تھے،

توبقول حضرت مولانا ابوالکلام آزاد "تعلیم کی ٹھنڈی لاش" کو رونے کی فرصت کسے تھی جب
سیاست کا تعلق تعلیم سے ہوا تو اس میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ ملک کی سیاست کا یہ بڑا کارگر ہتھیار تھا
جو پچھلے سیاسی تجربوں نے لیڈروں کے ہاتھ میں دیا تھا۔

اُنیسویں صدی کے آخر میں مغربی شہنشاہیت کے پھیلاؤ اور اسلامی ممالک کے انتشار
و بدحالی کا منظر سامنے آتا ہے۔ سائنس نے مغرب کے ذہن کو فکر و تلاش کا عادی کیا اور
"پدرم سلطان بود" نے مسلمانوں کو شیخی خورہ اور نکما۔ اُس کی حرکت میں برکت ہوئی۔ حکومت پھیلی۔
تجارت بڑھی۔ اس کی تقدیر نے اس کی صنعت کو خاک میں ملایا حکومت چھنوائی اور ذلت کے
مدارج طے کرا کر غلامی کی لعنت میں پھنسا دیا۔ غلامی دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے۔ مسلمان گھبرایا ادھر
مغربی تعلیم سفید فام آقاؤں کی آزادی پسندی کی تاریخیں سناتی اور آزادی کی خوبیاں گناتی تھی
یہ بھی سیکھ گیا کہ

ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

حالات اب سازگار ہو گئے تھے نئی ایجادات نے وسائل آمد و رفت کو دنیا میں پھیلا کر
زمین کی طنابیں کھینچ دیں تھیں۔ اب مشرق کے چپہ چپہ کی بدحالی کی داستان بچے بچے کو معلوم
ہو گئی اور ہر چھوٹے بڑے کے دل میں اس گرفت سے نکلنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ مغربی حکومتوں نے
اس کو دبایا آزادی خواہ جماعتیں مصائب کو برداشت کر کے غلاموں کے جذبات کو ابھارتی
رہیں اور حال یہ ہو گیا کہ لکھنؤ کے وہ مشاعرے جو " بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے "
سے گونجا کرتے تھے اب " ہم ہوں گے عیش ہوگا ہوم رول ہوگا " سے گرماتے تھے۔

بڑھتی ہوئی دنیا کو کون روک سکتا ہے۔ مغربی شہنشاہیتوں میں رقابتیں پیدا ہوئیں اور
بالآخر ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی۔ اعلان جنگ کا غلام ملکوں پر کیا اثر ہوا۔ اعلان ہوتے ہی اُردو کے
پرچوں میں نظم شائع ہوئی جس کا مطلع یہ تھا:۔

سنا یورپ میں پھر قاصد پیامِ جنگ لایا ہے | بہت عرصے میں اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

ادھر یہ جذبات اُبھر رہے تھے۔ اُدھر برطانیہ کو ترکوں کے خلاف جنگ کرنا پڑی تو عربوں کو آزادی کا سبز باغ دکھا کر ترکوں کی بغاوت پر آمادہ کیا۔ لڑائی نے زور پکڑا تو رعایا سے زیادہ سے زیادہ مالی اور جانی قربانی کی اپیل کی۔ قربانی کسی اعلیٰ مقصد کے لئے کی جاتی ہے۔ اس لئے یہ اعلان ہوا کہ جنگ کے بعد اقوام عالم کو اختیار ہوگا کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی حکومت بنا لیں۔ اس اعلان نے سب کو اطمینان دلایا کہ غلامی کی ذلت بس جنگ تک ہے اس کے بعد تو آزادی ہی آزادی ہوگی۔

لڑائی میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ عربوں کی ریاستیں قائم ہوئیں لیکن آزادی دوسروں کے دینے سے تو ملتی نہیں جو عرب آزاد ہو جاتے۔ ان کی ذلت نے مسلمانوں کے زخمی دلوں پر نمک چھڑکا اُدھر ترکی کی راکھ سے کمالی چنگاری بھڑکی۔ یورپ کے خاکستر سے روس کا انقلاب جس نے رنگ ونسل کی تمیز کو ختم کیا اور سرمایہ داری کو ختم کیا جس کے سہارے یورپ کی شہنشاہیتیں مشرقی ممالک میں کھڑی تھیں۔ خود ہندوستان میں رولٹ ایکٹ کا تحفہ ملا اور جب اس کے خلاف احتجاج کیا گیا تو جلیان والا باغ میں حاضرین پر گولیاں چلائی گئیں۔ یہ گولیاں رحمت بن گئیں۔ مجمع میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ خون دونوں کا بہا اور زمین میں جا کر ایسا ملا کہ تمیز نہ ہو سکا۔ برسوں سے اورنگ زیب اور سیواجی پر جھگڑتے تھے اب جو اس طرح ساتھیوں کو خاک و خون میں لوٹتے دیکھا تو سب بھول گئے اور ایک ہو گئے۔ یہ تھا دنیا کا نقشہ جو لڑائی کے بعد بنا۔ مغربی آقاؤں نے سوچا کیا تھا اور ہو کیا گیا۔

مسلمان پہلے ہی بد دل تھے عربوں کے ساتھ جو ہوا اس نے اور بھی زخمی کیا جلیان والا باغ نے دونوں کو آگے بڑھنے کی راہ دکھائی جب ہندو مسلمان کے اختلافات دور ہو گئے تو اُن کے ذہن اپنی بیڑیاں کاٹنے پر لگے اور سب رہنماؤں نے مل کر یہ سوچا کہ نظام سلطنت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ یعنی خطاب یافتہ خطاب چھوڑ دیں۔ ملازم سرکاری ملازمت سے دست بردار ہوں۔ وکیل وکالت کو خیرباد کہیں اور طلباء انگریزی مدارس سے کنارہ کش ہوں غرض ملک کی آبادی کا کوئی حصہ حکومت سے تعلق نہ رکھے۔ اس پس منظر میں مولانا محمد علی مولانا

شوکت علی سوامی ستیہ دیو اور مہاتما گاندھی علی گڑھ آئے تقریریں ہوئیں سلگتی آگ پر تیل پڑ گیا۔ دوسرے دن طلبہ نے اپنا جلسہ کیا تو جوش بھرے علیگڑھ کے طالب علم اپنی ڈگریاں اور وظائف واپس کرنے کا اعلان کر رہے تھے کہ شوکت صاحب آگئے ایک مختصر سی تقریر اور آخر میں یہ

سپردم بتو مایۂ خویش را　　　　تو دانی حساب کم و بیش را

نے ایسی ٹھیس لگائی کہ سب اشک بار تھے۔ اس کے بعد سربرآوردہ رہنماؤں کا تانتا بندھ گیا اور گرم جوشی بڑھتی گئی اس سلسلہ کی آخری کڑی دیوبند کا ضعیف و نحیف ملا تھا جس کی پیری میں آزادی کا رنگ شباب تھا جس کے ہر چھوٹے اور سیدھے لفظ میں شیریں صداقت تھی آہنی عزم تھا اس ملا کے مختصر سے خطبہ نے وہ روح پھونکی جو عمر بھر کی تعلیم نے خواب میں بھی نہ دیکھی۔ یہ دیوبند کا ملا محمود الحسن تھا جس کے انتظار میں نرگس ہزاروں سال روئی تھی اور جس نے ہم کو اس تجربے پر اس طرح آمادہ کیا گویا برسوں کی تمنا پوری ہو رہی تھی اور برسوں کے انتظار کے بعد دیوبند اور علی گڑھ میں اتصال قائم ہو رہا تھا جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عملی شکل میں رونما ہوا۔

واقعات کی تفصیل ذرا بڑھ گئی لیکن تعلیم کے اس کھوکلے نظام کو واضح کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی اور پھر قومی اور بین الاقوامی حالات جس طرح ذوق آزادی کی پرورش کر کے اس کو شہنشاہیت سے ٹکرا رہے تھے وہ اسی کے مقتضی تھے کہ تعلیم کو سیاست سے آشنا کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کاشی ودیا پیٹھ قائم کئے جائیں تاکہ ان کے طالب علم ترقی پسند سیاست کا ساتھ دیکر ملک کو آزاد کرا سکیں اور اس کو خوش حال کر سکیں۔

(سید محمد ٹونکی)

جامعہ ملیہ

جیسا کہ میں نے اُسے دیکھا اور پایا

میں ہائی اسکول کی آخری جماعت میں تھا کہ تحریک ترک موالات اور عدم تعاون شروع ہوئی میں بالعموم سیاسی معاملات سے الگ تھلگ رہتا تھا اور اپنے پڑھنے لکھنے سے واسطہ رکھتا تھا، لیکن اخبارات کے مطالعہ اور جلسے جلوسوں نے بالآخر مجھ پر بھی اثر ڈالا، مگر میں اپنی تعلیم چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، بالخصوص اس خیال سے کہ یہ میرا اسکول کی تعلیم کا آخری سال تھا اور میرے والدین اور اساتذہ سب چاہتے تھے کہ میں اپنی تعلیم ختم کرلوں اور اس تحریک میں حصہ نہ لوں۔ لیکن اسکول کے طلبہ میں سخت ہیجان تھا اور وہ کسی لیڈر کی گرفتاری پر اسکول چھوڑ بیٹھے۔ چار، پانچ سو کی تعداد میں یہ طلبا، آخری جماعت کے ہم چند طلبہ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ ہم بھی اس تحریک میں حصہ لیں اور ان کی رہبری اور قیادت کا فرض انجام دیں۔ میں ان کا ساتھ دینے میں آخر تک ہچکچاتا رہا اور یہ ڈرتا تھا کہ یہ لوگ کہیں ساتھ نہ چھوڑ بیٹھیں، پھر بھی بالآخر ان کا ساتھ دینا پڑا اور اس تحریک میں شدومد سے حصہ لیا۔ ہائی اسکول کی دیواریں ہلنے لگیں اور شہر کے جتنے ہائی اسکول اور مدارس تھے وہ سب اس تحریک میں شریک ہوئے۔ شہر میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اسکول کے منتظمین ہمارے پاس پیامات بھیجنے لگے اور ہم سے دریافت کرنے لگے کہ ہمارا مطالبہ کیا ہے، جس سے ہم پھر اسکول میں آسکتے ہیں۔ ہم نے اپنا مطالبہ پیش کیا کہ اس اسکول کو قومی اسکول بنادیا جائے یعنی یہ کہ اس کی سرکاری گرانٹ واپس کردی جائے اور اسکا الحاق ہائی اسکول بورڈ سے توڑ دیا جائے۔ لیکن منتظمین نے ہمارا یہ مطالبہ منظور نہ کیا

پھر ہم نے شہر کے بعض لیڈروں کی مدد سے ایک نیشنل اسکول قائم کیا، اور نیشنل اسکول کا الحاق بنارس کے کاشی ودیا پیٹھ سے کیا جو جامعہ ملیہ کی طرح ایک قومی یونیورسٹی کی حیثیت سے قائم ہوئی تھی۔ دسویں جماعت کے چند مہینے جو باقی رہ گئے تھے وہ اس قومی مدرسہ میں گذارنے کے بعد، میں نے میٹرک کا امتحان اسی قومی یونیورسٹی سے دیا جو بنارس میں قائم ہوئی تھی۔

اس عرصہ میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ مولوی سعدالدین انصاری صاحب جو جامعہ میں میرے بہت گہرے دوست تھے، اس زمانہ میں ندوہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد مولوی عبدالباری صاحب ندوی سے ملنے کے لئے گئے جو دارالمصنفین اعظم گڈھ میں بحیثیت مصنف کام کرتے تھے سعد صاحب سے سب سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی اور اثنائے ملاقات میں چونکہ ہم دونوں اپنی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتے تھے، یہ طے پایا کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی چاہئے جہاں ہم قومی لائن پر اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اس وقت جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا، دو درس گاہیں قائم ہوئی تھیں، جو ہم سے نسبتاً قریب تھیں۔ ایک تو بنارس میں ودیا پیٹھ اور دوسری علی گڈھ میں جامعہ ملیہ۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ تعلیم ان دونوں میں کہاں اچھی ہوتی ہے۔ طے یہ پایا کہ ہم میں سے ایک بنارس جائے اور دوسرا علی گڑھ، اور ایک دوسرے کو حالات سے مطلع کرے۔ سعد صاحب چونکہ اس سے پہلے ہی علی گڑھ جانے کا قصد کر چکے تھے، وہ علی گڑھ روانہ ہوئے۔ اور بنارس چونکہ میرے وطن سے قریب تھا، اس لئے میں بنارس روانہ ہوا۔ چھ مہینے کا زمانہ مشکل سے گذرا تھا کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی درسگاہوں کے حالات سے مطلع کیا۔ میں نے سعد صاحب کو لکھا کہ اگرچہ یہاں تعلیم اچھی ہوتی ہے، اور اساتذہ اچھے اچھے ہیں لیکن ساری فضا ہندوانہ ہے اور زندگی کی سادگی اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ زمین پر سونا ہوتا ہے اور معمولی کھانا ملتا ہے۔ آپ شاید یہاں آنا پسند نہ کریں۔ سعد صاحب نے مجھے یہ لکھا کہ اگرچہ جامعہ ملیہ میں بڑی چہل پہل ہے اور تمام فضا اسلامی اور مذہبی ہے۔ لیکن سیاست کا رنگ چھایا ہوا ہے اور باقاعدہ تعلیم مشکل سے ہوتی ہے لیکن جنوری سال آئندہ سے باضابطہ تعلیم شروع ہونے کی پوری امید ہے۔ اس لئے تم چاہو تو

یہاں چلے آؤ۔ مجھے اگرچہ ہندوانہ فضا سے نفرت نہ تھی لیکن اسلامی رنگ کی ایک تلاش ضرور تھی اس لئے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملا، اور میں جنوری ۱۹۲۲ء سے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں چلا آیا۔

جامعہ کی ابتدائی زندگی بڑی پرکیف اور روح افزا تھی چھوٹی سی جماعت تھی اور سب ایک ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ بڑے چھوٹے کا کوئی فرق اور امتیاز نہ تھا جس دارالاقامہ میں آکر ہم اُترے اس کا نام "بنگالی کوٹھی" تھا۔ اُس کے ایک بڑے کمرے میں یہی ذاکر صاحب اور ان کے دو چھوٹے بھائی یوسف صاحب اور محمود صاحب رہا کرتے تھے۔ اس سے ملحق ایک دوسرے کمرے میں جس میں مجھے جگہ ملی۔ سعد صاحب اور ان کے ساتھ ایک اور ندوی محمد خلیل رہا کرتے تھے۔ اِن ندوی ساتھیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ایک بڑی دلچسپ غلط فہمی میرے معاملہ میں یہ ہوئی کہ میں بھی ندوی سمجھا جانے لگا۔ میرے انگریزی اور تاریخ وغیرہ کے اساتذہ کو میری انگریزی کی استعداد اور تاریخی واقفیت پر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ اس غلط فہمی میں ایک وجہ خود میرا اپنا میلان بھی تھا یعنی مجھے عربی اور اسلامیات پڑھنے کا شروع ہی سے بہت شوق تھا اور اسی شوق کی بنا پر جماعت کے کاموں یا امتحان کے پرچوں میں میرے عربی اور اسلامیات کے اساتذہ کو میری استعداد پر حیرت ہوتی تھی۔

غرض جامعہ ملیہ کی تعلیم میرے لئے ایک بڑے شوق و ذوق کی تعلیم تھی۔ میں نے یہاں آکر اپنے کو ایسا پایا جیسے اندھے کو دو آنکھیں مل گئی ہوں، یا ایک پیاسے کو پانی کا چشمہ۔ اس تمام عرصہ میں علاوہ باضابطہ تعلیم اور یہاں کی عام فضا کے جس چیز کا مجھ پر اثر ہوا وہ ذاکر صاحب کی زندگی، صحبت، اور سلوک کا تھا۔ ذاکر صاحب کی زندگی اُس زمانہ میں مجھے ایک سربستہ راز نظر آتی تھی جو ہیہم کسی خیال اور عمل کی کوشش میں رواں دواں رہتی ہے میں انھیں اپنے ساتھیوں میں "جمال الدین افغانی" کہا کرتا تھا، جن کے حالات کا میں نے اُس زمانے میں خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ ان کی زندگی میں مجھے ایک خاص کشش اور جذب محسوس ہوتا تھا جس کو میں اس شعر سے زیادہ اور کسی طرح بیان نہیں کر سکتا ہوں :۔

نہ جانے حسن تھا یا عشق اتنا جانتے ہم ہیں

ہمیں کھینچے لئے جاتا ہے کوئی جذبِ پنہانی

ذاکر صاحب کی صحبت سے بھی کبھی مستفید ہونے کا شاذ ہی موقع ملتا تھا وہ ٹھیرے مصروف آدمی اور ہمیں اپنے لکھنے پڑھنے سے کام لیکن سر راہے گاہے جب کبھی بھی مل جاتے کوئی اچھی بات بتا جاتے کوئی اُبھارنے والی بات کر جاتے۔ سلوک ایسا کہ ہمیشہ دل جوئی اور وابستگی کا خیال یوں اور تو کوئی کام پڑتا نہیں تھا لیکن ہم سب مل کر ایک قلمی پرچہ نکالتے تھے۔ جس کا نام پہلے "الرشید" تھا، پھر بعد میں بدل کر مولانا محمد علی کے تخلص پر اس کا نام "جوھر" رکھا گیا اور اس کے ساتھ مولانا کا یہ شعر بھی درج ہوتا جو اس کے مقاصد یا کارکنان کے جذبات کا ترجمان تھا۔

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر

کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

میں چونکہ اس زمانہ میں خوش خط لکھتا تھا اس لئے اس پرچہ کی تمام کتابت بھی مجھی کو کرنی پڑتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی ترتیب اور مضمون نگاری کا کام بھی میرے ذمہ پڑھتا گیا۔ ذاکر صاحب کو جوھر کا نکلنا بھی عزیز تھا۔ اس کے لئے ہر طرح کا مشورہ، اچھی اچھی خبریں اور مختلف طریقوں سے اس کی مدد کیا کرتے تھے۔ مجلس تعلیمی کے جلسوں میں جب سالانہ امتحانات کے نتیجہ پر غور ہوتا تو ذاکر صاحب سب سے پہلے کامیاب شدہ طلباء کی ایک فہرست لاکر جوہر میں شائع ہونے کے لئے دے جاتے۔ "جوہر" منتظمین جامعہ کی کسی امر کی طرف توجہ مبذول کراتا تو ذاکر صاحب سب سے زیادہ اس رائے کی قدر کرتے اور اس کی تعمیل کر کے اراکین "جوہر" کا دل بڑھاتے ایک آدھ بار طلباء کے اس کے خلاف احتجاجی جلسے ہوئے تو ذاکر صاحب بیچ بچاؤ کرا کے آپس میں میل جول کرا دیتے۔

ذاکر صاحب کی ان تمام باتوں کا مجھ پر خاص اثر ہوا اس لئے کہ ان سے قریب تر آنے کی یہی صورتیں تھیں۔ اسی اثنا میں ذاکر صاحب جرمنی روانہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ وہاں پہنچکر بھی ہمارے

ان مشغلوں کو بھولتے نہیں۔ یہی جوہر قلمی سے مطبوعہ شکل میں نکالنے کو ہوا تو اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی گئی کہ جب تک اس کے خریداروں کی ایک تعداد نہ پیش کی جائے مجلس تعلیمی اس کی اجازت نہیں دے سکتی ہے چنانچہ اسی جوہر کے سابقہ مضمونوں کا ایک مجموعہ انتخاب جوہر کے نام سے شائع کیا گیا۔ جس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا: الملقب بہ نقیب جامعہ۔ اس انتخاب پر گیا کانگرس میں جاکر خریداروں کی ایک تعداد حاصل کی گئی اور رسالہ جامعہ نکلنا شروع ہوگیا ذاکر صاحب وہاں سے بھی رسالہ جامعہ کے لئے اچھے اچھے مضامین اور تصویریں بھیجتے رہے۔ اس خط وکتابت کا محرک خود اپنا جرمنی جانے کا ارادہ بھی تھا۔ چنانچہ ذاکر صاحب برابر وہاں کے حالات سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے اس ارادہ کی تعجیل سے خاص طور پر روکا اور یہ لکھا۔

سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا۔

چنانچہ سلوک کی یہ منزل بھی ان ہی کے مشورہ اور ہدایت سے طے پائی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

جامعہ میں بی۔ اے۔ تعلیم کے یہ چار سال آناً فاناً گذر گئے اس عرصہ میں جامعہ کی زندگی کے دو محرکات کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جس سے اپنی زندگی کی تشکیل میں بھی بہت مدد ملتی ہے جامعہ میں شروع ہی سے دو جماعتیں رہی ہیں: ایک تو وہ جو علی گڑھ کالج سے آئی اور جو اپنے کو حاوی اور علی گڑھ کی تمام روایات کا حامل سمجھتی تھی، دوسری جماعت وہ جو مختلف جگہوں سے آئی اور علی گڑھ کی تاریخ سے نابلد اور ایک نئی جامعہ بنانا چاہتی تھی ان دونوں جماعتوں کی کشمکش ڈائننگ ہال کے جلسوں دارالاقامہ کی تقریبوں اور جامعہ کے ہر شعبہ زندگی میں نظر آتی تھی لیکن اس کا سب سے بڑا مظاہرہ اس وقت ہوتا جب جامعہ کے مقاصد اور اس کے مستقبل پر بحث وگفتگو ہوتی۔ جامعہ کے متعلق اس کشمکش کا سب سے بڑا انکشاف اس وقت ہوا جب ایک موقع پر مولانا محمد علی کی خدمت میں ان کی ایک طویل عرصہ کی جدائی کے بعد واپسی پر ایک سپاسنامہ انجمن اتحاد کی طرف سے پیش کیا گیا تھا جس میں مولانا کی طویل غیر حاضری سے جامعہ کو جو نقصان پہنچا تھا اس کا دبی زبان سے شکوہ کرنے کے بعد اپنے جذبات کا اس مصرعہ کے ذریعہ اظہار

کیا گیا تھا۔ ۶

وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے۔

مولانا یہ مصرعہ سنتے ہی بپھر اٹھے اور جواب میں بولے۔ "ہم نے تعمیر کا ارادہ ہی کب کیا تھا جو آپ لوگ اس کی حسرت دل میں رکھتے ہیں"۔ اور پھر جامعہ اور علی گڑھ کی تشریح ان لفظوں میں فرمانے لگے۔ "بھئی ہماری حالت تو اوائل مسلمانوں کی سی ہے۔ ہمارا اصل کعبہ تو علی گڑھ کالج ہے۔ جامعہ کی زندگی تو ہجرت کی زندگی ہے۔ ہمیں پھر مکہ کو دوبارہ فتح کرنا ہے"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قومی تحریک کی حالت روز بروز سقیم ہوتی جارہی تھی طلبا نے ڈرتے ڈرتے عرض کی کہ "مولانا ہماری جماعت تو روز بروز کمزور ہوتی جارہی ہے ہم میں اب اتنے لوگ اور وہ قوت کہاں باقی کہ علی گڑھ کالج پر قبضہ کرسکیں"۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ "اگر مادی قوت سے نہیں تو اخلاقی قوت سے فتح کرسکتے ہو"۔ اس سوال وجواب سے ہمیں بانیانِ جامعہ کی دونوں قوتوں کا حال معلوم ہوگیا۔

جامعہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی اور ۲۵ء میں اس کی حالت اتنی سقیم ہوگئی کہ جاں بر ہونے کی توقع نہیں رہی ہم چند طلبہ مل کر شیخ الجامعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے سنبھالنے کی کچھ کوشش کریں۔ انھوں نے کانوں پر ہاتھ دھرا اور کہا "نا بابا مجھ سے اب یہ بار نہیں اٹھایا جاسکتا ہے ہاں اگر تم چند لوگوں کے لئے کہو تو میں کوئی تصنیف وتالیف کا شعبہ قائم کردوں جس میں تم لوگ بھی لگ جاؤ اور اس کا خرچ بھی اتنا ہوگا کہ میں آسانی سے اس کا انتظام کرسکوں گا"۔ لیکن ہمیں تو اپنی نہیں، جامعہ کی پڑی تھی اس لئے کہ اسی کے ساتھ ہماری زندگی بھی وابستہ تھی۔ ہم نے پھر مجبور ہوکر ایک تار ڈاکٹر صاحب کو جرمنی دیا ۲۲ یا ۳۲ روپے اس بحری تار کے ہوئے تھے نہ جانے کس کس سے قرض دام لے کر یہ تار دیا تھا جس کی ادائیگی بھی شاید اب تک نہیں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تار کے جواب میں جو لکھا وہ فقرہ ابھی تک حافظہ میں محفوظ ہے Keep tails up جس کا مطلب ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم لوگوں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رہنا چاہئے۔

اس دوران میں انجمن اتحاد کی مجلس منتظمہ نے یہ طے کیا کہ ایک وفد بانیانِ جامعہ کے پاس بھیجا جائے تاکہ انھیں صحیح حالات سے مطلع کیا جائے اور جامعہ کے آئندہ چلنے کے متعلق ان سے گفتگو کی جائے۔ چنانچہ چند طلبہ کی ایک جماعت جس میں خاکسار بھی تھا دلی آئی اور یہاں علی برادران، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں صاحب سے ملی۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی صاحبان کی خدمت میں اگرچہ ان کی سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے باریابی دیر میں ہوئی لیکن جو گفتگو ہوئی وہ کچھ بہت نتیجہ خیز نہیں ہوئی۔ دورانِ گفتگو میں جامعہ کی سقیم حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہیں ہماری زبان سے یہ نکل گیا کہ "جب سے خلافت کمیٹی نے ہاتھ کھینچا .... اس سے آگے بڑھنے بھی نہیں پائے تھے کہ مولانا شوکت علی صاحب نے خفا ہوکر کہا کہ "خلافت کمیٹی نے ہاتھ کھینچا! اس کا ہاتھ اب رہا ہی کہاں!" ہم نے بھی کچھ وضاحت کی کوشش کی کہ اس سے ہمارا منشا خدا نخواستہ مجلس خلافت کو الزام دینا نہیں ہے .... لیکن بیچ میں مولانا محمد علی صاحب بات کاٹ کر بولے "تم سب لوگ خواجہ (عبدالمجید) کے بھیجے ہوئے ہو تمام ڈسپلن جامعہ کا اسی سے خراب ہو رہا ہے .... بس یہ گفتگو اسی کوں کوں اور جھوں جھوں میں ختم ہوگئی اور ہم لوگ دل شکستہ اور دل گرفتہ واپس لوٹے۔ اس کے بعد ڈاکٹر انصاری صاحب سے ملنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اُن سے اپنے پیشہ کی مصروفیت کی وجہ سے ملاقات کا موقع نصیب نہ ہو سکا۔ ۳ بجے سہ پہر میں حکیم صاحب سے وقت مقرر تھا ہم لوگ نوکر کی ہدایت کے بموجب بالاخانہ پر پہونچے۔ حکیم صاحب ٹھیک وقت پر اندر سے تشریف لائے اور ہم سے صرف چند باتیں پوچھیں: "آپ لوگ کس غرض سے تشریف لائے ہیں" ہم نے اپنا مقصد بیان کیا۔ "اچھا تو آپ لوگ کیا چاہتے ہیں" ہم نے عرض کیا کہ جامعہ چلتی رہے" "پھر آپ لوگ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں" ہم نے یقین دلایا کہ جو آپ فرمائیں "کیا آپ اپنے اساتذہ سے یہ کرا سکتے ہیں کہ اگر چند مہینے تنخواہوں میں دیر ہو تو وہ گھبرائیں نا" ہم نے کہا کہ یہ کیا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے فرمایا "اچھا تو آپ لوگ

اب علی گڑھ واپس چلے جائیں"۔ آپ یقین کیجئے کہ ان چند جملوں کے بعد ہم اطمینان اور سکون کی جو دولت لے کر اٹھے اس کا عشر عشیر بھی ہم در بدر کی گدائی سے نہ پا سکے تھے۔

ادھر ہم لوگ علی گڑھ لوٹے ادھر دہلی میں جامعہ کی مجلس امناء کا جلسہ ہوا جس میں علی گڑھ اور غیر علی گڑھ کی کش مکش نے اپنا پورا معرکہ دکھایا۔ اور یہ کشاکش آخری بار اس شکل میں طے ہوئی کہ جامعہ کو علی گڑھ سے منتقل کر کے دہلی لایا جائے اور چونکہ اس تجویز کے محرک جناب حکیم صاحب تھے اس لئے اس کے اخراجات کی کفالت حکیم صاحب کے سر آئی۔ ڈاکٹر انصاری مجلس امناء کی طرف سے بھیجے گئے کہ وہ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کو جا کر یہ پیام سنائیں اور اسے علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کا انتظام کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے نہ صرف یہ فیصلہ سنایا بلکہ جامعہ کے لئے دہلی آنے کا ایک نہایت دلکش نقشہ کھینچا۔ جو لوگ علی گڑھ کے دلدادہ اور مولانا محمد علی کے گرویدہ تھے وہ جامعہ کے ساتھ نہیں آئے لیکن اور بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے رشتے اور ناتوں کو چھوڑ کر اس میں شرکت کی۔ اور اگست ۲۵ء میں جامعہ علی گڑھ سے دہلی آگئی۔)

دوسری کش مکش میری اپنی ذات سے تعلق رکھتی تھی جامعہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد تو باہر کام کرنے کے کوئی بہت امکانات میسر تھے اور نہ جامعہ کے اندر۔ جامعہ کی فضا ان دونوں کام کرنے والے کے نقطۂ نظر سے مجھے بہت تنگ اور محدود نظر آتی تھی۔ جامعہ میں رہ جانا گویا اپنے اوپر بہت بڑے احسان کا بار لینا ہے اور کارکنان جامعہ کا زر خرید غلام بن جانا ہے حسن اتفاق کہیئے کہ بی اے کے آخری سال میں الناظر بک ایجنسی کی طرف سے ایک انعامی مضمون کا اعلان ہوا میرے ایک محسن استاد سید محمد صاحب نے مجھے بھرنا شروع کیا کہ میں امتحان کی تیاری کے بجائے اس مضمون کی تیاری کروں۔ میں ان کے اس چکر میں آگیا۔ اور امتحان تو جیسے تیسے پاس کر لیا لیکن اس تیاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون اچھا خاصا ہو گیا اور عجیب اتفاق کہ ملک کے دوسرے کہنہ مشق لکھنے والوں کے مقابلہ میں یہی مضمون قابل انعام

سمجھا گیا۔ انعام یوں نقد میں تو تھوڑا ہی تھا لیکن اس کا چرچا اتنا ہوا کہ کئی جگہوں سے کام کرنے کے بلاوے آنے لگے۔ ایک گریجویٹ کے لئے عام طور پر اور پھر ایک جامعہ کے فارغ التحصیل کے لئے اگر کام خود کام کرنے والے کو تلاش کرنے لگے تو اس تعلیم کی میرے نزدیک بڑی کامیابی ہے۔ غرض ان چند جگہوں میں سے میں نے اپنے بزرگ مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کی ہدایت کے مطابق "ہمدرد" میں جانا قبول کرلیا۔ مولانا محمد علی صاحب سے یا تو سال بھر پیشتر جامعہ کے قیام کے سلسلہ میں شرف نیاز حاصل ہوا یا اب اس ضمن میں حاضر ہونے کا یہ موقع ملا۔ بڑی محبت اور پیار سے ملے اور خوش ہوئے کہ جامعہ کا ایک طالب علم ان کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے شریک ہوا ہے۔ غرض ۱۲۵ روپیہ پر ایک سب اڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا تقرر ہوگیا۔ یہ بھی جامعہ کے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے ورنہ دوسرے گریجویٹ کو وہ اس سے کہیں زیادہ دیتے۔ یہ بھی exploitation کی ایک قسم ہے جس کا انسان نادانستہ طور پر اور پورے خلوص و محبت کے ساتھ مرتکب ہوتا ہے۔

لیکن جامعہ سے میرا تعلق ٹوٹا نہیں تھا۔ میں ہر جمعرات کی شام کو قرول باغ چلا جایا کرتا تھا اور جمعہ کی چھٹی کا پورا دن گذار کر ہفتہ کی صبح کو پھر دفتر آجایا کرتا تھا۔ اس لئے میں جامعہ کے تمام حالات اور کاموں سے اسی طرح باخبر رہتا تھا جیسا کم و بیش جامعہ میں رہنے کی صورت میں ہوتا۔ علی گڑھ سے دہلی آنے کے بعد بڑی کش مکش اس بات کی تھی کہ کون شیخ الجامعہ رہے۔ خواجہ صاحب الہ آباد میں پریکٹس شروع کرنے کا سامان کر چکے تھے لیکن حکیم صاحب کے خیال سے بالکل قطع تعلق بھی نہیں کرنا چاہتے تھے غرض کبھی وہ ہوتے اور کبھی عبدالعزیز صاحب انصاری ان کی جگہ کام کرتے۔ آخر میں تو تنگ آکر جامعہ کے اساتذہ میں سے ایک صاحب یعنی طاہر ایس محمدی صاحب کو جامعہ کا مستقل شیخ الجامعہ بنا دیا گیا۔ ان کا نہ اوائل عہد سے کوئی تعلق تھا اور نہ اوائل عہد کی شخصیتوں سے۔ اور جامعہ کا اندرونی انتظام ان کے ہاتھ میں اچھا خاصہ چلیتارہا۔ (اس اثناء میں حکیم صاحب یورپ کے سفر کے لئے جاتے ہیں اور پیرس میں ذاکر صاحب

اپنے ساتھ ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب کو لے کر ملتے ہیں۔ یہاں کیا باتیں ہوئیں اور کیا معاملات طے ہوئے اس کا علم خود ان حضرات کو ہوگا لیکن اس گفتگو کے نتیجہ کے طور پر یہ ہوا کہ اگلے سال ۱۹۲۶ء میں یہ تینوں حضرات تعلیم سے فراغت کے بعد جامعہ تشریف لائے اور عجیب بات ہے کہ ان کی تشریف آوری پر سب سے زیادہ جسے مسرت ہوئی وہ مولانا محمد علی کی ذات تھی میں اس وقت "ھمدرد" میں موجود تھا بلا کر مجھے ان کی آمد کی اطلاع دی اور بتایا کہ کس طرح ان کی آمد کی خبر کو شائع کرنا۔

ہمدرد ۱۹۲۶

غرض ان لوگوں کے آنے کے بعد سے جامعہ کے دن پھر گئے۔ ان حضرات کا ایک ساتھ تقرر ہوا۔ اور ہر ایک نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اپنے کام کا انتخاب کر لیا۔ اس ضمن میں ایک ہلکی سی چوک بھی ہوگئی اور وہ یہ کہ اس ہڑبونگ میں طاہر ایس محمدی صاحب کی خدمات کا اعتراف نہ کیا گیا اور چارج ان کے ہاتھ سے اس طرح لے لیا گیا جیسے وہ بھرتی کے طور پر تھے۔ ہمیں بعض وقت اپنے کارکنوں کی خدمات کا خواہ وہ حقیر سے حقیر کیوں نہ ہوں خیال رکھنا چاہیے اور ان کو دل شکنی کا موقع نہ دینا چاہیے۔

(ذاکر صاحب وغیرہ کی آمد سے حقیقت میں جامعہ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اور پچھلا دور ایک طرح سے ختم ہوتا ہے پچھلا دور اگرچہ مالی اور انتظامی اعتبار سے ایک انتشار اور پریشانی کا دور تھا لیکن تعلیمی اعتبار سے اس دور میں بعض خصوصیتیں تھیں جنھیں ہم آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس دور کی دو بڑی تعلیمی کمزوریاں تو یہ تھیں کہ ایک تو بانیاں جامعہ کے نزدیک واضح طور پر جامعہ کا کوئی نصب العین معین نہ تھا اگر ہلکا اور دھندلا سا کوئی خاکہ تھا بھی تو وہ یہ کہ ایک پوری جامعہ کا مع اپنے لوازم اور سامان کے قیام۔ علی گڑھ کالج سے جسمی طور پر نکلنے کے ساتھ یہ لوگ ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس سے الگ نہیں ہوئے تھے۔ وہ جب سوچتے تھے تو علی گڑھ کالج ہی کی شکل میں اور جب کوئی منصوبہ باندھتے تو انھیں اغراض و مقاصد کے اندر رہ کر انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ایک پورا پھیلا ہوا جوان درخت مع اپنے

تمام برگ و بار کے کیسے ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ نصب کیا جا سکتا ہے! جامعہ ملیہ کے قیام کی کوشش مع اپنے تمام لوازم و سامان کے ایک ایسے ہی درخت کے نصب کرنے کی کوشش تھی۔ اور پھر جبکہ مٹی اور آب و ہوا بھی سازگار نہو تو یہ کوشش اور بھی بے سود ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ شروع سے کوئی شخص جامعہ ملیہ کو ایسا کام کرنے والا نہیں ملا۔ جو اسی کام کو اپنا مقصد زندگی بناتا یا اپنے اور کاموں سے بالکل قطع تعلق کر لیتا کسی نے مصلحت وقت کی خاطر اس کا کام اپنے ہاتھ میں لیا کسی نے اپنی آئندہ زندگی کی کامیابی اسی میں دیکھی لیکن سابقہ زندگی کے تختے اور سامان کو جلا کر نہیں۔ غرض جامعہ ایک کھلونے کی طرح کبھی ایک کے اور کبھی دوسرے کے ہاتھ میں یوں ہی چلتی رہی ....

لیکن ان کمزوریوں کے باوجود اس زمانہ کا ایک تعلیمی نصب العین اور ایک تعلیمی رنگ واضح نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی نے اسی زمانہ میں اپنی ایک اسکیم شائع کی تھی جس میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا نقشہ تھا اس نقشہ کی تکمیل میں غلطی بس یہ ہوئی کہ کام دوسرے سرے سے شروع کیا گیا۔ اگر ابتدائی منزل سے یہ کام منزل بہ منزل ترقی کرتا تو شاید اس کی بنیاد اس قدر کمزور نہوتی۔ جامعہ کے اس دور میں یوں ہونے کو کالج کی اعلیٰ جماعتوں کے ساتھ ایک ہائی اسکول بھی خاصی نیچی جماعتوں تک تھا اور ان سب منزلوں میں بہت حد تک مولانا محمد علی کی اسی اسکیم کے مطابق تعلیم ہوتی تھی۔ اس تعلیم کی چند ایک بڑی بنیادی خصوصیتیں بھی تھیں ان میں سے ایک تو یہ کہ ساری تعلیم اردو زبان میں تھی اس وقت اردو ہندوستانی اور ہندی ہندوستانی کا جھگڑا نہ تھا اس لئے یہ تعلیم خالص اور بے آمیز اردو میں تھی۔ دوسری بڑی خصوصیت یہاں کی ذہنی اور مذہبی تعلیم تھی۔ اس تعلیم کا مقصد مولانا محمد علی نے اپنی اسکیم میں خود ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

" ہمارا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو نہ صرف حسب معیار زمانۂ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کئے جانے کے مستحق

ہوں بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں، جن میں اسلام کی روح ہو اور
جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے اس قدر بہرہ اندوز ہو چکے ہوں کہ مبلغین اسلام
کی فوج میں دوسروں کی امداد سے مستغنی و بے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر
کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے
کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے ......"

اس مقصد کے تحت جامعہ میں مادری زبان، اردو کے بعد عربی کی تعلیم
شروع ہی سے لازمی تھی، کہ بچے جلد سے جلد اس قابل ہو سکیں کہ دینی تعلیم
کے سرچشمہ یعنی قرآن شریف تک براہِ راست پہنچ جائیں اور پھر رفتہ رفتہ
اونچی جماعتوں میں قرآن پاک کے علاوہ احادیث اور فقہ کی تعلیم بھی آتی تھی اور
ان میں بھی زیادہ زور فروع سے اس کے اصول اور مبادیات پر دیا جاتا تھا۔

پھر ان سب کے علاوہ دینی علوم کی چند ایسی متبحر اور مبدا رفیض ہستیاں
بھی ہوتی تھیں جن سے طلبہ کسب فیض کرتے، اور وہ انھیں اپنے علم کے سرچشمے
سے سیراب کرتیں۔ اور ان سب سے زیادہ یہ کہ دینی زندگی کی ایک ایسی
فضا ہوتی جس سے طلبہ کی زندگی عملی اعتبار سے بھی رنگین ہوتی اور علم کی
تحصیل بے عمل کے نہ ہوتی۔

(ایک اور بڑی خصوصیت اس زمانہ کی یہ تھی کہ طلبہ کو اپنی درس گاہ کے ساتھ
ایک غیر معمولی تعلق خاطر اور محبت ہوتی تھی۔ وہ کسی مستقبل کے خیال یا شخصیت
کی کشش سے نہ آتے، بلکہ جامعہ کو کچھ اغراض و مقاصد کا حامل جانتے اور اس
کی فضا میں جینا ان مقاصد کی تکمیل سمجھتے۔

(پھر ایک بات اور بھی تھی اور وہ یہ کہ طلبہ اور اساتذہ کا ملک کی عام ملی اور
قومی زندگی سے ایک گہرا رشتہ اور تعلق ہوتا تھا، جس سے وہ کسی وقت

بھی ملّی ضرورتوں سے بے خبر اور غافل نہ ہونے پاتے تھے۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ وقت اور جگہ کی تنگی سے جامعہ کی یہ چند خصوصیتیں نہایت سرسری اور مختصر طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ؎

گہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

ایک پُرانا ورق

اپنی زندگی کی کہانی کے تیئس چوبیس برس پرانے اوراق کو آج اُلٹ کر دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد مغلیہ کی کسی رنگین مصور کتاب کے ورق ہیں۔ سب سے تیز اور شوخ رنگ ان میں میری قوم پرستی اور حب وطن کے ہیں۔ اچھے پھول پتے میری کتب بینی اور مضمون نویسی کے۔ اپنی اٹھتی ہوئی جوانی کے زمانہ میں مجھے دو چیزوں کا از حد شوق تھا۔ ایک تو پڑھنے لکھنے کا، کالج کے کورس سے باہر کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا اور پروفیسروں کے بتائے ہوئے مضمونوں کو چھوڑ کر ہر طرح کے مضمونوں پر قلم اٹھانے کا۔ دوسری قوم کی ترقی اور ملک کی آزادی کے موضوع پر کچھ سننے اور اگر موقعہ مل جائے تو کچھ دینے کا۔

اُن دنوں میں الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھا کرتا تھا اور الہ آباد میں رہتے تھے۔ پنڈت موتی لعل نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو جن کی زبردست شخصیتوں نے گاندھی جی کی طوفانی، سیاسی تحریکوں سے وابستہ ہو کر شہر میں ہلچل ڈال دی تھی۔ مجھ پر اس ہلچل کا یہ اثر ہوا کہ میں نے کالج چھوڑ دیا اور قسم کھائی کہ پھر کبھی مڑ کر کسی سرکاری کالج کو (اُن دنوں سرکاری کالجوں کو غلام خانے کہا جاتا تھا) نہ دیکھوں گا۔ باریک بدیشی کپڑوں کی ہولی جلا کر میں نے ٹاٹ سا کھردرا کھدر کا کرتہ پہنا جس کے دھاگے دور سے بتا دیں کہ میں بڑا جوشیلا دیش بھگت ہوں۔ ویسی ہی دھوتی دھارن کی اور کتابوں کو طاق پر رکھ کر میں نے ملک کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا۔

ان دنوں عدالتوں کا بائیکاٹ ہو رہا تھا اور کالجوں میں پکٹنگ ہو رہی تھی۔ برف جیسے ٹھنڈے دلوں میں بھی حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ میں جو پہلو میں دل کی جگہ انگارا لئے ہوئے تھا کیونکر

چین سے بیٹھ سکتا تھا۔ بس میدان میں کود ہی تو پڑا۔ چھ سات مہینے یا شاید اس سے بھی زیادہ میں دن رات سیاسی کاموں کے لئے وقف رہا۔ آج والنٹیر بھرتی کر رہا ہوں، کل شراب کی دکان پر دھرنا دئے بیٹھا ہوں، پرسوں کسی گاؤں میں کسانوں کا سنگٹھن کر رہا ہوں۔ اکثر میرے لئے دو چار جھپکیوں کا نام نیند تھا اور دو چار امرودوں کا نام کھانا۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نے ہر طرح کے غیر قانونی قانون توڑے مگر گرفتار نہیں ہوا۔ جب کبھی کسی گرفتاری کا موقعہ آتا تھا تو ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ گرفتاری بند ہو جاتی تھی۔ میرے سارے ساتھیوں کو دیش بھگتی کا سرٹیفکیٹ مل گیا پر مجھے نہ مل سکا۔ اتنے میں چوری چورا کا قصہ ہو گیا اور گاندھی جی نے ایک دم لگام کھینچ لی۔ چلتی گاڑی چرمرا کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کتنے باغی طالب علم اپنی بغاوت کا جھنڈا پست ہمتی کی باڑھ میں بہا کر سرکاری کالجوں میں پھر سے داخل ہو گئے۔ مگر میں اپنی قسم نہ بھلا سکا۔ میں سمجھتا تھا کہ کسی سرکاری کالج میں لوٹ کر جانا کال کی کوٹھری میں گھسنے کے برابر ہے جس سے منہ ہی نہیں سارا جسم کالا ہو جائے گا۔

میں ایک بات اور بھی محسوس کرتا تھا۔ میری پڑھائی لکھائی پوری نہیں ہوئی تھی پر کچے گھڑے کی بسا ط ہی کیا۔ ڈر تھا کہ کہیں زمانے کے جھٹکے کھا کر ٹوٹ نہ جائے۔ اس لئے میں کاشی ودیا پیٹھ میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر بھگوان داس جیسے پرنسپل اور اچاریہ نریندر دیو جیسے پروفیسر پا کر میں خوش تو ہوا پر مجھے ایسا لگا کہ ودیا پیٹھ کی زندگی کا بیسویں صدی کی زندگی سے ذرا سا بھی تعلق نہیں ہے وہاں تو پرانی چال کے نوجوان ہی آسانی سے کھپ سکتے تھے۔ یہ نہیں کہ مجھے زمین پر چٹائی بچھا کر سونے سے انکار تھا، ان دنوں تو میری وہ عمر تھی جس میں کنکر پتھر کے بستر پر بھی آدمی میٹھی نیند سو جاتا ہے۔ اور میری سادگی کا بھی یہ حال تھا کہ میں "اسٹوو" پر کھچڑی اُبال کر اسی پتیلی میں جس میں یہ پکتی تھی، مزے سے کھا لیتا تھا۔ پر مجھے لمبی چوٹیا اور آدھی ننگی پیٹھ اور چھاتی والی سادگی اچھی نہیں لگتی تھی۔ بہت سے طالب علم وہاں اسی وضع قطع کے تھے۔ پھر بھی میں شاید ودیا پیٹھ میں ٹک جاتا، کیونکہ مجھے کہانیاں لکھنے اور کچھ تک بندی کرنے کی لت تھی اور اس

لت کو پاس ہی بہتی ہوئی گنگا کی لہروں سے مدد ملتی تھی۔ پر سرکاری کالجوں کے کورس کا میں ایسا عادی ثابت ہوا کہ مجھے وہاں کا کورس بالکل نہیں بھایا اور بھاگ کر علی گڑھ پہونچ گیا، جہاں ہماری پیاری جامعہ کا جنم ہوا تھا۔ میں جامعہ کے بی۔ اے کلاس میں بھرتی ہو گیا۔

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ چاروں کوٹھیاں پھر رہی ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کا شاندار منظر دکھاتی تھیں۔ ان کوٹھیوں میں ہم لوگوں کا ہوسٹل تھا۔ ایک کوٹھی ہماری ستی کے رکھوالے، ڈاکٹر صاحب کو ملی ہوئی تھی اور باقی کوٹھیوں میں لڑکے رہتے تھے۔ ان میں دس پانچ نہیں درجنوں ہندو طالب علم تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا صوبہ ہو گا جس کے نوجوان نمائندے ان طالب علموں میں نہ موجود ہوں۔ آسام، بنگال اور بہار، پنجاب، مدراس اور مہاراشٹر سبھی صوبوں کی قومیت کی پیاسی جوانی کا جامعہ کے پنگھٹ پر میلا لگ گیا تھا۔

ہوسٹل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باورچی خانے تو الگ الگ تھے مگر ساتھ کھانے پینے میں کسی قسم کا پرہیز نہ تھا۔ دعوتوں اور ضیافتوں میں سب کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھتے تھے اور ایک ہی جگہ سے چپاتی، دال، ترکاری، اور گوشت لے کر کھاتے تھے۔ اسی کو بھائی چارہ اور دانت کاٹی روٹی کہتے ہیں۔ اُن دنوں کی جامعہ میں اسکا کیا خوب سماں بندھا تھا۔

والی بال وغیرہ انگریزی کھیلوں کے ساتھ کبڈی اور دوسرے دیسی کھیل بھی برابر چلتے تھے۔ اس چہل پہل میں میل ملاپ خوب پھولتا پھلتا تھا۔ پوشاک میں بھی یکسانی تھی۔ ہر شخص سفید کھدر کا کرتہ اور پاجامہ یا دھوتی (دھوتی ہندو لڑکوں میں بھی کم ہی چلتی تھی) پہنتا تھا۔ جو ذرا شوقین تھے وہ ذرا نفیس کھدر استعمال کرتے تھے۔ اوپر سے بڑھیا اچکن ڈانٹتے، اور اپنے تنگ پائجامے کی چوڑیاں اچھی طرح چن کر چنبیلی سی بناتے تھے۔ یہی نہیں، وہ اپنی ٹوپی پر ذرا سی بھی شکن نہیں آنے دیتے تھے اور اُسے پہنتے بھی تھے ٹھسّے کے ساتھ۔ آخر تھے تو اُن میں زیادہ تر وہی لوگ جو ابھری ہوئی شان وشوکت اور نکھری ہوئی لطافت و نزاکت کے گھر، علی گڑھ یونیورسٹی، کو چھوڑ کر جامعہ میں آئے تھے۔ جامعہ کے ہوسٹل کو بھی اپنے منجھے ہوئے مذاق کے مطابق انھوں نے سجایا۔ اگر غالیچوں

کی جگہ سادی دریاں رکھیں اور رل کی بنی ہوئی چاندنی کی جگہ کھدر کی سفید چادریں بچھائیں۔ دروازوں کو بھی اُنھوں نے ننگا نہیں رہنے دیا۔ اُن کی برہنگی کو پردوں سے چھپایا مگر وہ پردے کھدر ہی کے تھے۔ ہاں ان کے چھاپے میں سادہ پن نہیں بلکہ بھڑکیلا پن تھا مگر وہ سودیشی کے اصول کو نہیں توڑتا تھا۔ سودیشی اور سودیشی پریم دونوں ہی کے جامعہ والے دل سے قائل تھے۔ دن رات انھیں باتوں کا چرچا ہوتا رہتا تھا اور ہندو اور مسلمان طالب علم ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان استاد بھی ان چیٹ پٹی باتوں میں بڑے چاؤ سے حصّہ لیا کرتے تھے۔

جامعہ میں ہندو طالب علموں ہی کی نہیں، ہندو اُستادوں کی بھی خاصی بڑی تعداد تھی۔ ان میں زیادہ تر وہ پروفیسر تھے جو سرکاری کالجوں کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ میرے رہتے رہتے ان میں سے دو ایک صاحب چلے گئے۔ پروفیسر ڈے بیچارے پیپل کے پتے کی طرح لاغر تھے۔ ان کو تو ملازمت بھی مشکل سے پچتا تھا۔ پڑھاتے محنت سے تھے مگر ان کی نازک صحت انھیں زیادہ محنت نہیں کرنے دیتی تھی۔ وہ مجبور ہو کر جامعہ سے چلے گئے، ان کا جامعہ کے ساتھ ایسا لگاؤ تھا کہ جامعہ چھوڑتے وقت اُن کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ کچھ دنوں کے بعد اس دنیا ہی کو چھوڑ گئے۔ ایک آسامی پروفیسر تھے۔ شاید پروفیسر بروا ان کا نام تھا۔ اُن کے تلفظ پر ہم چھپ کر ہنستے تو ضرور تھے مگر ساتھ ہی ان کی قربانی کی تعریف بھی کیا کرتے تھے۔ کہاں آسام اور کہاں یوپی۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک دلکش خیال کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہونچ گئے تھے۔ اور اُس دلکش خیال کے پالنے پوسنے میں مست تھے۔ پروفیسر گپتا سائنس پڑھاتے تھے۔ پروفیسر سنگھل اکنامکس اور گپتا۔ اور شری سوریا کانت شاستری، سنسکرت۔ شاید جامعہ کے علی گڑھ چھوڑ کر دہلی آنے سے پہلے ہی یہ سب تتر بتر ہو گئے۔ پروفیسر گپتا دہرہ دون کے کسی کالج میں چلے گئے، اب نہ جانے کہاں ہیں؟ پروفیسر سنگھل شاید ہولکر کالج میں ہیں اور شاستری جی اب آکسفورڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر بن کر لاہور کے اورنٹیل کالج میں پڑھا رہے ہیں۔ پروفیسر ہادی حسن کو میں کبھی نہیں بھول سکتا وہ شکسپیر پڑھایا کرتے تھے۔ ایکسنٹ ان کا کیمرجی تھا۔

سندر آواز کے سانچے میں ڈھل کر الفاظ جاندار چیز کی طرح ہمارے سامنے آتے تھے۔ اُن کے گلابی تن پر کھدر کا باریک لباس کھل اٹھتا تھا مگر ان کی طبیعت کھدر پر نہیں جمتی تھی۔ وہ آخر بک گئی۔ اور ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر علی گڑھ کے سرکاری کالج میں لے گئی۔

پروفیسر طاہر بمبئی سے آئے تھے۔ جتنے دبلے پتلے تھے اتنے ہی تیز طرار تھے۔ پڑھاتے بڑا اچھا تھے۔ مگر سب سے اچھا پڑھاتے تھے پروفیسر کیلاٹ۔ وہ تو شاید اب بھی جامعہ میں ہیں۔ کئی برس ہوئے میں اُن سے قرول باغ میں ملا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے لگ بھگ بال پک گئے ہیں۔ جب وہ علی گڑھ میں آئے تھے تب ان کے سر میں شاید ہی کوئی سفید بال ہوگا۔ میں نے اُن کا جیسا پڑھانے کا ڈھنگ کسی کا نہیں دیکھا۔ ادھر وہ سیاہ تختے پر جملے لکھتے تھے ادھر وہ جملے ہم لوگوں کے ذہن پر نقش ہو جاتے تھے۔ کسرتی۔ گٹھیلے جسم والے پروفیسر کیلاٹ، ہم لوگوں کے دماغ کو خوراک مل جانے پر بس نہیں کرتے تھے۔ ہیں ٹوک ٹوک کر اپنا جیسا تندرست جسم بنانے کے لئے ہمارے دلوں میں ڈمبل کے اسپرنگ جیسی اچھلنے والی خواہش پیدا کیا کرتے تھے۔ پروفیسر کیلاٹ کے لئے دنیا میں جامعہ کے سوائے اور کچھ نہیں تھا! یہی ان کی دنیا تھی۔ پھر کیوں نہ جامعہ کے لڑکے اُن پر ہزار جان سے نثار ہوتے! ہم اپنے پرنسپل خواجہ صاحب کی بھی بڑی عزت اور اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی نیشنلزم خالص دودھ کی سی تھی۔ اس میں تو اب بھی کسی اوچھے جذبے کی ایک بوند نہیں پائی جاتی۔ وہ سدا ہنستے رہتے تھے اور اُن کی ہنسی کی چاندنی میں ہم ہندو اور مسلمان سبھی طالب علم پریم کا گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔

جامعہ میں سرکاری کالجوں کی طرح پروفیسروں کے لئے میز اور کرسی اور لڑکوں کے لئے ڈسک اور بنچیں نہیں تھیں چٹائیوں پر کھدر کی چادریں بچھی رہتیں اور بعض وقت چادریں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ استاد اور شاگرد انھیں پر بڑی خوشی سے ڈٹ جاتے تھے اور پڑھائی بڑے مزے میں ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے رجسٹرار صاحب یعنی حیات صاحب یاد آ گئے۔ انھوں نے اپنے کمرے میں چھانٹ کر اول درجے کی دری بچھا رکھی تھی۔ اس پر شاید دو ایک غالیچے بھی تھے۔

چادریں وہ ان پر بے داغ بچھایا کرتے تھے۔ خود بھی بے داغ اور بے شکن کپڑا پہنا کرتے تھے۔
وہ جب کام کرنے بیٹھتے تھے تو کام کی طرف ان کا اتنا دھیان نہیں ہوتا تھا جتنا کہ کپڑوں کی طرف
اُن کی شوقینی میں جو صفائی تھی وہ ضرور اپنانے کی چیز تھی۔ مسٹر ڈی جی ایسن کو جو جامعہ کے جرنلزم
ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے نہ اپنے کپڑوں کے میلے ہونے کا خیال ہوتا تھا اور نہ اُن کی شکنوں کے
ٹوٹنے کا۔ وہ پھٹی پرانی چٹائی پر بھی بڑی بے تکلفی سے لڑکوں کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ مسٹر
ایسن اینگلو انڈین سے مسلمان ہو گئے تھے مگر زیادہ تر کوٹ پتلون ہی پہنتے تھے۔ جامعہ میں اچکن
اور چوڑی دار یا ڈھیلا پائجامہ پہننے کا رواج تھا۔ مسٹر ایسن کے لئے زمین پر بیٹھنا ایک مصیبت
کا سامنا تھا۔ کبھی وہ اکڑوں بیٹھ جاتے اور کبھی پاؤں پسار کر ایک ہاتھ کے اوپر سارے جسم کا
بوجھ ڈال دیتے تھے۔ خوش مزاج وہ ایسے تھے کہ اپنی ہنسی آپ ہی اڑاتے رہتے تھے۔ ان کی
اینگلو انڈین بیوی بڑی خوبصورت تھی اور خود ان کی صورت بڑی بھونڈی تھی۔ مگر اُنھوں نے
اس مضمون کو دل بستگی کا مضمون بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے کو چوپایہ (Beast) کہا کرتے
تھے اور اپنی بیوی کو پری (Beauty) وہ بدشکل ہی نہیں تھے بہرے بھی تھے۔ اور اشاروں
سے باتیں کیا کرتے تھے۔ مگر اُن کی قابلیت کے سامنے اُن کی سب خامیاں چھپ جاتی تھیں۔
اپنے زمانے کے ہندوستانی اخبار نویسوں میں جہاں تک چٹ پٹے چٹکلے لکھنے کا تعلق ہے وہ
اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یوں تو وہ اپنے عجیب قلم سے لوگوں کو کراری چوٹیں بھی لگا سکتے تھے۔
مگر اُس سے جب وہ لوگوں کو گدگدانا شروع کرتے تھے تو پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ جاتے
تھے۔ وہ کئی چوٹی کے اخباروں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ہندوستان کی اخبار نویسی کی تاریخ
میں اُن کا نام اس لئے بھی ہمیشہ زندہ رہے گا کہ وہ اس ملک میں جرنلزم کی باقاعدہ تعلیم
جاری کرنے والوں میں سب سے آگے تھے اُن سے اخبار نویسی کا جو ہنر میں نے سیکھا وہ
اس لائن میں میری پہلی پونجی تھی۔

جامعہ سے بی۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد میں نے مولانا محمد علی کی قدمبوسی کی اور ان کے

مشہور اخبار "کامریڈ" کا سب ایڈیٹر بنا۔ ڈیڑھ دو سال کے تھوڑے عرصے میں ہی میں نے مولانا کی صحبت سے اتنا کچھ سیکھ لیا کہ اُس کے بل پر بڑے اطمینان سے میں اخباری دنیا کے دنگل میں کود پڑا۔ میں نے ہفتہ وار اور روزانہ "نیشن" دونوں کی ایڈیٹری کی اور اس شان سے کی کہ سب نے تعریف کی۔ مولانا محمد علی ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارے سنسار کے چنے ہوئے اخبار نویسوں میں سے تھے۔ وہ بڑے زبردست اور کمال کے لکھنے والے تھے۔ جامعہ کے ناتے سے مجھے ان کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا اور یہ اُنھیں کا طفیل ہے کہ آج میں ٹریبون میں چوٹی پر پہونچ کر یہ محسوس کرتا ہوں کہ اخباری دنیا میں جتنا اونچا اڑنا چاہوں اڑ سکتا ہوں۔

میں تو کہانی ختم کرنے لگ گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی تو پرانے ساتھیوں کا ذکر باقی ہے۔ ایک شکل کے بعد دوسری شکل آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ہوسٹل کے کمرے میں دو بلدیو رہتے تھے۔ ایک چھوٹے اور ایک بڑے۔ دونوں ایک دوسرے کے اوپر جان دیتے تھے۔ شاید یہ ہم نام ہونے ہی کا اثر تھا کہ وہ یک جان دو قالب بن گئے تھے۔ امتحان ہوا اور جوڑا بچھڑا۔ بڑے بلدیو تورڑ کی چلے گئے وہاں اُنھوں نے ایک اسکول چلانا شروع کر دیا اور چھوٹے بلدیو پٹنہ چلے گئے۔ وہاں انھوں نے پبلک کی سیوا کرنی شروع کر دی۔ برّوا اور نیّن بھی اب تک یاد آتے ہیں۔ پتہ نہیں کہ یہ دونوں ہیں کہاں۔ یوں تو کرشن نائر، چندر بھال جوہری اور کیلاش ناتھ کول سے بھی میرا قریب کا تعلق تھا۔ مگر میرا سب سے زیادہ یارانہ ایشور ناتھ ٹوپا سے تھا۔ ایشور اور کیلاش اکثر اپنا کھانا الگ بناتے تھے لیکن جب سب کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھتے تو مہاراج سے، غبارے جیسے گرما گرم پھلکے لینے کے لئے اُلجھ جاتے تھے۔ میں اور جوہری دونوں ان کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اس لئے ہم دونوں کو بھی ہمارے لیڈروں کی طرح نخرے باز سمجھا جایا کرتا تھا۔ جوہری بیچارے کو تو جامعہ چھوڑنے کے بعد کئی بار دیش کی آزادی کے لئے لڑتے لڑتے جیل جانا پڑا اور غبارے سے پھولے ہوئے گرما گرم پھلکوں کی جگہ ٹھیکرے جیسے چپٹے اور سخت روٹ کھانے پڑے۔

اس دیس سیوا کا صلہ انھیں اس طرح ملا کہ لوگوں نے انھیں سنٹرل اسمبلی کا ممبر چنا۔ لیکن جیل سے ایسی حالت میں چھوٹے کہ انھیں دہلی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ جامعہ میں انھوں نے ایثار و قربانی کا جو سبق پڑھا تھا اُسے اپنی زندگی میں سچ کر دکھایا اور اپنے آپ کو ملک پر قربان کر دیا۔

ناٹر کی زندگی بھی تو قربانی کی ایک لمبی کہانی ہے۔ نہ جانے وہ کتنی بار جیل ہو آئے ہیں سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں جن دیش بھگتوں نے حصّہ لیا۔ وہ ان میں آگے آگے تھے۔ ابھی ابھی جیل سے چھوٹ کر آئے ہیں۔ ایشورا اور کیلاش میری طرح قلم دوات اور کتاب کے غلام بن گئے ایشور جرمنی سے ڈاکٹریٹ لے کر عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے اور کیلاش لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر کچھ سال کے بعد انگلینڈ چلے گئے۔ اب تو شاید وہ انگلینڈ سے واپس آ گئے ہیں۔ اور حضرت انت رام کہاں ہیں؟ جامعہ نے علی گڑھ چھوڑ دیا مگر اُنھوں نے نہیں چھوڑا۔ اب بھی شاید وہیں ہوں۔ اُن کی یاد اس لئے ابھی تک تازہ ہے کہ اُن کے کھڑاؤں کی کھٹر پٹر آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور مونچھ کو بھلا کیسے بُھلا سکتا ہوں۔ سبھی تو اُن سے یہ کہا کرتے تھے کہ ذرا سی دید و تو برش بنالیں۔ اُن کی مونچھوں کے ایک ایک اکڑے ہوئے بال ہم لوگوں کو اس لئے بھی چبھتے تھے کہ ہم لوگ زیادہ تر مُچھ منڈے تھے۔ ہمارے مسلمان ساتھیوں نے ان کی مونچھ پر کبھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ انھوں نے مونچھیں تو مونچھیں ایسی داڑھیاں اگا رکھی تھیں کہ حضرت انت رام کی مونچھ کا ان میں پتہ بھی نہ چلتا۔ یہ داڑھیاں خلافت تحریک کی دین تھیں۔ اور ان کی ہمارے دوست بڑی دیکھ بھال کرتے تھے۔ لیکن سب نے شفیق کی طرح داڑھی کو بالکل آزاد نہیں چھوڑ رکھا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو جعفری کی طرح ان کو قابو میں رکھتے تھے۔

جامعہ سے نکلنے کے بعد دلّی میں پھر میرا اور جعفری کا ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں ایک سال مولانا محمد علی کے پاس رہے۔ کیا خوب تھے وہ دن۔ دن میں کپوز ٹھاٹ کرتے رہتے تھے۔ کیونکہ مولانا صاحب کو گپیں مارنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اور رات میں اوور ٹائم کام ہوتا

تھا۔ اور میں پتھر کے فرش پر کاغذ کے ٹکڑے بچھا کر پروفوں کا انتظار کرتے کرتے لیٹ جایا کرتا تھا۔ جعفری سنا ہے، اب بھی، اس بُرے فرقہ پرستی کے زمانے میں، اپنے اخبار کے ذریعہ لوگوں کو ابھی قوم پرستی کا سبق سکھاتے رہتے ہیں۔ جامعہ کے کئی پُرانے طالب علم اخبار نویسی کے آسمان پر چاند کی طرح چمکے۔ جعفری، انصاری، باقی وغیرہ۔ ان طالب علموں میں قلم کے دھنی نوجوان ہی تھے، اشرف جیسے زبان کے دھنی نوجوان بھی تھے۔ جامعہ کے طالب علموں کی انجمن کے جو جلسے ہوتے تھے وہ دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں اچھے بولنے والوں میں گنا جاتا تھا۔ لیکن یہاں کے جوشیلے مقررین کی تقریروں کے سامنے میری تقریر ایسی ہی لگتی تھی جیسے گنگا کے سامنے گومتی۔ ڈاکٹر اشرف کی آواز، جب کمیونزم کا زور تھا، کہاں نہیں گونجتی تھی۔ کچھ نوجوان جامعہ میں ایسے تھے جو دن رات دنیا کو چھان ڈالنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ ان میں کئی نے اپنے خواب کو عملی جامہ پہنایا۔ رؤف نہ جانے کتنی بار یورپ گئے ایک دن میں نے ان کی آواز برلن ریڈیو سے سنی اور پھر برابر اُس وقت تک سنتا رہا جب تک کہ روسی توپوں کی گرج میں وہ ڈوب نہیں گئی۔ حال میں اخباروں میں یہ پڑھا کہ برلن ریڈیو والے رؤف بہادر گڑھ کیمپ میں قید ہیں۔

نوجوان محمد علی جامعہ میں کئی تھے۔ پنجابی محمد علی تو آج کل جالندھر میں کوئی خاصہ کاروبار کر رہے ہیں اور بنارسی محمد علی لاہور میں مال روڈ پر فوٹوگرافی کی ایک بڑھیا دوکان چلا رہے ہیں۔ سلامت اللہ شہر بھر کا فرنیچر اِدھر سے اُدھر کیا کرتے ہیں۔ میرے، جیسے چھوٹے چھوٹے حرفوں کی تجارت کرنے والے اولڈ بوائز جب ان بھاری بھرکم چیزوں کی تجارت کرنیوالے اولڈ بوائز کو دیکھتے ہیں تو حیرت کرتے ہیں۔ یہ گر تو جامعہ میں سکھایا نہیں گیا تھا۔ انھوں نے اسے کہاں سے سیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جامعہ کی فضا میں وہ جادو تھا جس کے اثر سے جوانی کے پہلو میں چھپی ہوئی تمام خصلتوں کو کلیوں کی طرح چٹک کر کھلنے کا موقعہ ملتا تھا۔ اسکے پھول ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہیں۔ وہ جوبلی کے موقعہ پر جمع ہونگے تو بڑا خوشنما گلدستہ بن جائے گا۔

(جنگ بہادر سنگھ)

"جامعہ"

زندگی نازو نیاز و سوز و ساز دل میں ہے
ہائے وہ زندہ کہ جو مدفون آب و گل میں ہے
بو پریشان ہو کے نکلی خیمۂ گلزار سے
کب سبک روحوں کو آسائش کسی منزل میں ہے
بادیہ گردی ہے مجنوں کے لئے سامانِ زیست
ایک جانِ تازہ ہر نظارۂ محمل میں ہے
پوچھ آسانی پسندوں سے ہے آسانی کہاں؟
جو نہیں مشکل میں ہے وہ بھی بڑی مشکل میں ہے
عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو
وہ مزا جو کوہ کن کی سعیِ بے حاصل میں ہے
شیخِ ہند و اجمل و جوہر کی روحِ انقلاب
جامعہ ملیہ کے سر میں، جگر میں، دل میں ہے
گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

(اسلم جیراجپوری)

جامعہ ملّیہ کے مقاصد

نفسیات کا مسلمہ اصول ہے کہ ہر شعوری عمل کا محرک اس کی غایت کا تصور ہوتا ہے جسے مقصد کہتے ہیں۔ یہ تصور کبھی واضح ہوتا ہے کبھی مبہم، کبھی مربوط اور کبھی غیر مربوط۔ انفرادی عمل کے لئے جسے ایک فرد تنہا انجام دیتا ہے اور جس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے، ایک واضح اور مربوط مقصد کا ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا اجتماعی عمل کے لئے جو متعدد افراد کی شرکت چاہتا ہے اور پوری جماعت کی زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اس لئے انفرادی فعل میں عموماً فاعل کی شخصیت خود بخود ایک اندرونی وحدت پیدا کر دیتی ہے مگر اجتماعی فعل میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کے ذہن میں ابتدا سے اس کی غایت کا کم و بیش واضح شعور موجود ہو۔

جامعہ ملیہ کا قیام نتیجہ تھا ایک تعلیمی تحریک کا جو ۱۹۲۰ء کی قومی تحریک کے ساتھ ساتھ اٹھی۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ خود قومی تحریک یعنی ہندو مسلمانوں کو متحد کر کے ایک متحدہ قومیت کی تعمیر کی کوشش چند سال کے بعد سرد پڑ گئی لیکن وہ تعلیمی تحریک جو اس کے ساتھ شروع ہوئی تھی، کم سے کم مسلمانوں میں جامعہ ملیہ کے ذریعہ سے خاصی کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ اس کے وجوہ پر غور کیا جائے تو سب سے بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ قومی تحریک کے مقاصد واضح اور متعین نہ تھے یہاں تک کہ خود قومیت کا کوئی متفقہ اور مسلمہ تصور موجود نہ تھا۔ جو مختلف جماعتوں کے عمل میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرتا بخلاف اس کے جامعہ ملیہ کے سامنے ابتدا سے ایک واضح اور مربوط مقصد تھا جس نے اس کے کارکنوں کی وحدت عمل کو قائم رکھا

اس مضمون میں ہم جامعہ ملیہ کے اس بنیادی مقصد سے اور ان ضمنی مقاصد سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو اس کے اندر شامل تھے۔ اس تعلیمی تحریک کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے بحیثیت جماعت اپنی تعلیم کو ریاست کی مداخلت سے محفوظ رکھا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں تو معاشرہ اور ریاست میں کوئی فرق ہی نہ تھا لیکن بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں، جب ریاست نے ایک جداگانہ ادارے کی شکل اختیار کر لی، اس کی اور عامۂ مسلمین کے اغراض و مقاصد میں ہم آہنگی نہیں رہی تو مجموعی طور پر تعلیم کو حکومت کے اثر سے آزاد رکھا گیا۔ مسلمانوں کو یہ تعلیمی آزادی اس قدر عزیز تھی کہ جب پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) میں حکومت کی طرف سے پہلی یونیورسٹی "نظامیہ بغداد" کے نام سے قائم ہوئی تو اہل علم کے حلقہ میں ماتم کیا گیا کہ اب علم آزاد نہیں رہا۔ مگر سرکاری مدرسے تعداد میں کبھی اتنے زیادہ نہیں ہوئے کہ تعلیم عامہ حکومت کی پابند ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ اسلامی ملکوں میں مجموعی طور پر بدستور آزاد تعلیم کا دور دورہ رہا۔ ہندوستان میں ہمیشہ سے تعلیم حکومت کی مداخلت سے آزاد چلی آتی تھی۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بھی عام طور پر یہ آزادی قائم رہی اور ہر فرقہ کے لوگ اپنے اپنے نظام تعلیم کو اپنی مخصوص ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق چلاتے رہے۔ حکومت مدرسوں کو مالی امداد دیتی تھی مگر ان کے کام میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

انگریزوں کے عہد میں ابتدا میں یہی پالیسی جاری رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو اٹھارویں صدی میں جنوبی ہندوستان اور بنگال و بہار کی حاکم بن گئی تھی وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اس کا کام صرف رعایا کو لوٹنا نہیں بلکہ اس کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا بھی ہے اس سلسلہ میں تعلیم کی طرف بھی توجہ کی گئی کلکتہ میں عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے اور بنارس میں سنسکرت کی تعلیم کے لئے کالج قائم کئے گئے۔ علوم مشرقی کی ترقی کے لئے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف

بنگال کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور مطبعوں کے قیام نے اشاعت علوم میں آسانی پیدا کردی۔ وارن ہیسٹنگز علم دوست اور وسیع النظر حاکم تھا۔ اس کی پالیسی یہ تھی کہ علوم مشرقی کی ہمت افزائی کی جائے۔ انھیں جدید رجحانات سے آشنا کیا جائے۔ حکمراں قوم ہندوستانیوں کی تہذیب سے واقفیت حاصل کرے اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرے۔

مگر انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں جو سامراجی تخیل پیدا ہوا تھا اس کے اثر سے ہندوستان میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی بالکل بدل گئی اور لارڈ ولیم بنٹنگ نے یہ فیصلہ کردیا کہ حکومت مشرقی علوم کے بجائے مغربی علوم کو ہندوستان میں رواج دے گی اور تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان ہوگی اسی کے ساتھ ساتھ تعلیم عامہ میں حکومت کی مداخلت رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پالیسی اور زیادہ واضح اور شدید ہوگئی اور رفتہ رفتہ تعلیم کا سارا نظام بدیسی حکومت کے ہاتھ میں آگیا۔

انگریزوں کی نئی پالیسی ہندوستان کی تاریخ میں ایک انوکھی چیز تھی۔ اس سے پہلے جتنی حکمراں قومیں باہر سے ہندوستان آئیں انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنالیا۔ اور یا تو اس کی عمرانی زندگی میں جذب ہوگئیں یا باہمی تاثیر و تاثر کے ذریعہ ایک مشترک تہذیب کی تعمیر کا باعث ہوئیں۔ انگریزوں کا رجحان بھی ابتدا میں تہذیبی امتزاج کی طرف تھا مگر آگے چل کر نئے سامراجی تخیل کے ماتحت جو انتہائی قومی نخوت پر مبنی تھا انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں ہمیشہ بدیسی حکمرانوں کی حیثیت سے رہیں گے۔ اپنے آپ کو ہندوستانیوں کی صحبت سے اور ہندوستانی تہذیب کے اثرات سے الگ رکھیں گے اور ہندوستان کے ذہن کو مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔ انگریزی حکومت جانتی تھی کہ یہ غیر فطری عمل آزاد تعلیم کی فضا میں انجام نہیں پاسکتا۔ اس لئے اس نے تعلیم کا سارا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

انگریزی حکومت کی تعلیمی پالیسی ہندووں میں تو کسی قدر مقبول ہوئی مگر مسلمانوں میں

ایک مدت تک بالکل مقبول نہ ہو سکی۔ ایسی تعلیم جس کی باگ حکومت کے، اور وہ بھی بدیسی حکومت کے ہاتھ میں ہو، جس پر ایک اجنبی تہذیب کا رنگ چھایا ہوا ہو، جو ایک غیر زبان کے ذریعہ دی جائے مسلمانوں کی قومی روح کے لئے مہلک تھی اور ان کی حمیت کسی طرح گوارہ نہیں کرتی تھی کہ خوف یا لالچ سے اپنی روح کو ہلاک ہو جانے دیں۔ چنانچہ مسلمان بحیثیت جماعت ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریزی تعلیم سے دور رہے اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک دور رہنے کی کوشش کرتے رہے۔

مگر ۱۸۵۷ء کی کوشش کو دبانے کے سلسلہ میں انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو اس بے دردی سے کچلا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے شل ہو کر رہ گئے ان کے اونچے طبقوں کی معاشی حالت اس قدر ابتر ہو گئی کہ اب ان کے لئے حکومت کی سرپرستی سے بے نیاز رہنا مشکل تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ جدید علوم کی کشش سے مجبور ہو کر انھیں انگریزی تعلیم کی طرف جھکنا پڑا۔ پھر بھی سرکاری مدرسوں سے ان کو وحشت ہی رہی اور سرسید نے ان کے لئے علی گڑھ کالج قائم کیا۔ جس میں دوسری انگریزی تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں سرکاری مداخلت کم تھی اور تھوڑا سا مشرقی اور اسلامی رنگ بھی موجود تھا۔ مگر متوسط طبقے جن میں مذہبی اور ملی جوش زیادہ تھا اب بھی سرکاری تعلیم سے متنفر رہے وہ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے عربی مدارس میں خالص دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بعض علماء نے جو عہد حاضر کی ضرورتوں کو محسوس کرتے تھے ندوۃ العلماء کا مدرسہ قائم کیا جس میں ایک حد تک جدید علوم کو اور برائے نام انگریزی زبان کو جگہ دی گئی۔

اگرچہ سرسید مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کے دل سے حامی تھے لیکن مسلمانوں کی تعلیم میں حکومت کا دخل انھیں کسی طرح پسند نہ تھا۔ انھوں نے اسے مجبوری سے قبول کیا اور اپنی زندگی میں ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ان کے اور ان کے ساتھیوں کے لئے یہ امید باعث تسکین تھی کہ جب علی گڑھ کا مدرسہ ترقی کر کے یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچ جائے گا

تو اسے تعلیمی خود مختاری حاصل ہو جائے گی۔

سرسید کے جانشینوں کو بہت جلد یہ بات محسوس ہوگئی کہ وہ صرف نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کے بارے میں حکومت کی مرضی کے پابند ہیں بلکہ عام ملکی مسائل میں سرکاری پالیسی سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے۔ سرسید کو اس کی اجازت تھی کہ کانگریس کی مخالفت کی سیاسی تحریک کی قیادت کریں لیکن جب نواب محسن الملک نے ہندی کو صوبہ متحدہ کی عدالتی زبان بنانے کی مخالفت کرنی چاہی تو انھیں سختی سے روک دیا گیا۔ جنگ بلقان، جنگ طرابلس اور مسجد کانپور کے ہنگامہ کے دوران میں یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ علی گڑھ کے طلبا کو اپنے کالج کی چار دیواری کے اندر بھی ان مذہبی اور ملی جذبات کے اظہار کی آزادی نہیں ہے جو حکومت کی پالیسی سے متصادم ہوں۔

نواب وقار الملک کے زمانے میں اتنا ہوا کہ کالج کے یورپین اسٹاف کا زور ٹوٹ گیا۔ یہ گروہ اب تک حکومت کی پشت پناہی کے بل پر اپنے آپ کو کالج کا حاکم سمجھتا تھا۔ اور امنا اور سکرٹری کو اپنی مرضی پر چلانا چاہتا تھا۔ نواب وقار الملک مسلمانوں کی رائے عامہ کی مدد سے اسے "ایاز قدر خود بشناس" کا سبق دینے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ حکومت کو مسلمان اسٹاف اور خود امنا کی جماعت میں انگریزوں سے زیادہ مفید آلۂ کار مل گئے۔

اس امید پر کہ کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر پہنچانے کے بعد تعلیمی آزادی حاصل ہو جائے گی۔ نواب وقار الملک اور ان کے رفقا نے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو بڑے زور شور سے اٹھایا۔ آغا خاں کی سرپرستی، علی برادران اور دوسرے فرزندان کالج کی کوشش سے معقول سرمایہ جمع ہو گیا۔ ایک اسکیم مرتب کی گئی جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ یونیورسٹی تعلیمی اور انتظامی معاملات میں خود مختار ہو اور اسے اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کا اختیار حاصل ہو۔ حکومت کی نگرانی صرف اس حد تک رہے کہ گورنر جنرل کو یونیورسٹی کا چانسلر بنا دیا جائے لیکن

حکومت نے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کو اندرونی آزادی اور بیرونی مدارس کے الحاق کا حق دینے سے انکار کر دیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کی برسوں کی آرزو اور امید خاک میں مل گئی۔

نواب وقار الملک مرحوم نے حکومت کی طرف سے مایوس ہو کر ایک آزاد جامعہ اسلامیہ کے قیام کی تجویز پیش کی لیکن علی گڑھ کالج کے امنا میں سے معدودے چند کے سوا کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ علی گڑھ کے لائق فرزند ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے ہز ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیٔ بھوپال اور پرنس حمید اللہ خاں (موجودہ والیٔ بھوپال) کی سرپرستی میں دہرہ دون میں مسلمانوں کا ایک آزاد تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا مگر ڈاکٹر صاحب کی ناوقت موت سے یہ خیال بھی عمل کا جامہ نہ پہن سکا۔

ادھر مسلمانوں کا جدت پسند طبقہ تعلیم کو حکومت کے اثر سے کسی حد تک آزاد کرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اور اُدھر قدامت پسند علماء نے دیوبند دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دوسرے عربی مدارس میں کامل آزاد تعلیم کے عملی نمونے پیش کر دئے تھے۔ یہ مدارس جو بہت سی باتوں میں نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے تھے کم سے کم ایک بات میں انگریزی مدرسوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ وہ غلامی کی زہریلی ہوا سے پاک تھے اور آزادی کی صحت بخش فضا میں سانس لے رہے تھے۔

مگر جنگ بلقان، جنگ طرابلس اور پہلی جنگ عظیم کے دوران میں انگریزی مدارس کے مسلمان طلبا بھی ان جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جو عام مسلمانوں کے دلوں میں برطانوی سامراج کے خلاف پیدا ہو رہے تھے یہاں تک کہ ان کا اثر علی گڑھ کے طلسمی حصار کے اندر بھی نفوذ کر گیا۔ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں جو رویّہ حکومت نے اختیار کیا تھا اُس نے علی گڑھ کے نوجوانوں کی آنکھیں کھول دیں اور ان پر یہ تلخ حقیقت منکشف ہو گئی کہ انگریز ان کی تعلیم کو اپنے سانچے میں ڈھالنا اور اُن کو بساط سیاست پر اپنے مہروں کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ملی خودداری کی روح جو اقبالؔ کی شاعری اور محمد علی کی شخصیت نے

ان میں پیدا کردی تھی حکومت کے ذہنی تسلط کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں برطانوی سامراج کی مشرقی پالیسی نے ہندوستانی مسلمانوں کو اس سے اور بھی بیزار کر دیا اور اس بیزاری کا اثر علی گڑھ پر بھی پڑا۔ سلطان عبدالحمید نے خلافت عثمانیہ کو عالم اسلام کا حقیقی مرکز بنانے کی جو تحریک اتحاد اسلامی کے نام سے شروع کی تھی اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے تخیل کو چھیڑ دیا تھا اور وہ اسلام کی عالمگیر نشاۃ الثانیہ کا خواب دیکھنے لگے۔ برطانوی سامراج اس تحریک کو اپنے لئے بہت خطرناک سمجھتا تھا اور اس کو ختم کرنے کے لئے ترکی کی قوت کو کچلنا چاہتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے اپنے آپ کو بچانے کی آخری مایوسانہ کوشش میں جرمنی کا ساتھ دیا۔ جس کا نتیجہ اس کے حق میں مہلک ثابت ہوا۔ جنگ کے بعد برطانیہ نے ترکی کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس کے مذہبی اثر کو زائل کرنے کی غرض سے خلافت کو ختم کرنے کے درپئے ہو گئی۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور اُنھوں نے خلافت عثمانیہ کی حمایت کے لئے خلافت کمیٹی کے نام سے ایک نیم سیاسی نیم مذہبی جماعت مولانا محمد علی کی قیادت میں قائم کی۔ خلافت کی تحریک نے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو علماء کے دوش بدوش ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا اور مسلمانوں میں ایک متحدہ ملت کی شان پیدا کر دی۔

برطانیہ کی مخالفت کے جذبے نے قدرتی طور پر مسلمانوں کی ملکی سیاست پر بھی اثر ڈالا اور انھیں ہندوؤں کے ساتھ مل کر تحریک آزادی میں حصہ لینے پر آمادہ کر دیا۔ وہ بہت بڑی تعداد میں انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو گئے اور خود خلافت کمیٹی ہندوستان کی اندرونی سیاست میں کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنے لگی۔ چنانچہ جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو خلافت کمیٹی نے اُسے چلانے میں کانگریس کا پورا پورا ساتھ دیا، بلکہ مجموعی طور پر اُس سے زیادہ جوش اور سرگرمی دکھائی۔

سیاسی آزادی کی اس ہوا نے تعلیمی آزادی کی خواہش کو جو علی گڑھ کالج کے بہت سے

نوجوانوں کے دلوں میں دس بارہ سال سے سلگ رہی تھی، بھڑکا دیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ کالج کے ٹرسٹیوں نے مولانا محمد علی اور دوسرے آزاد خیال لیڈروں کا یہ مطالبہ نامنظور کر دیا کہ کالج حکومت سے مدد لینا بند کر دے اور اس کی مداخلت سے آزاد ہو جائے تو اُن کی عزت وحمیت اور جوشِ عمل نے ضبط کی زنجیریں توڑ دیں۔ انھوں نے مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی اور ابوالکلام آزاد کو اپنی یونین میں بلا کر ان کا ترک موالات کا پیام سنا اور اس پر لبیک کہی۔ مگر اس شرط پر کہ اُن کی تعلیم کے لئے ایک آزاد یونیورسٹی قائم کی جائے۔ یہ بات عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے کہ طلبا کی ایک جماعت نے جس کی رگوں میں جوانی کا گرم خون دوڑ رہا تھا، عین سیاسی ہیجان کے زمانے میں ایک آزاد درسگاہ کی تعمیر کا سنجیدہ، خشک اور صبر آزما نصب العین اختیار کیا۔ لیکن حقیقت میں یہ ملت اسلامی کی شدید ضرورت اور دیرینہ آرزو تھی جس کا عکس اُن نوجوانوں کے حساس قلب کے آئینہ میں نظر آیا۔ شاید ارباب سیاست نوجوانوں کے اس "بے ہنگام" مطالبے کو ٹال دیتے لیکن ارباب علم نے اُن کی دستگیری کی اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم کے دستِ مبارک سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح ہوا۔

اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جامعہ ملیہ دو تحریکوں کے ملنے سے وجود میں آئی۔ ایک تو تعلیمی آزادی اور ذہنی آزادی کی تحریک جو مسلمانوں کے دینی مدارس میں، عملی شکل میں اور دنیوی مدارس خصوصاً علی گڑھ کالج میں ایک نصب العین کی صورت میں موجود تھی۔ دوسرے سیاسی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تحریک جسے مسلمانوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد اختیار کیا۔

ابتدا میں جامعہ ملیہ کا کوئی دستور مرتب نہیں ہوا جس میں اس کے اغراض ومقاصد وضاحت سے بیان کئے جاتے لیکن اُس کے بانیوں یعنی شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی تقریروں اور تحریروں میں جن مقاصد کا اظہار کیا گیا وہ یہ تھے:۔

(۱) یہ تعلیم گاہ حکومت کے اثر سے آزاد قومی اور ملّی مصالح کی پابند ہو۔
(۲) اُس کی تعلیم میں دینی اور دنیوی، قدیم اور جدید عناصر کا صحیح امتزاج ہو۔
(۳) وہ ملک کی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تحریک میں حصہ لے۔

پہلے چند سال کے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا کہ تیسرے مقصد کی وجہ سے جامعہ کے اصل تعلیمی مقصد کو بہت سخت نقصان پہونچتا ہے۔ اس عرصہ میں جامعہ کو خلافت کمیٹی کی طرف سے 'مالی امداد ملتی تھی' اور گو' وہ اصولاً خلافت کمیٹی کے ماتحت نہ تھی لیکن عملاً اُس کی سیاسی اغراض کا آلہ کار بن گئی تھی۔ ترکِ موالات کے دور میں جامعہ کالج کے طلباءٗ سے زیادہ تر سیاسی تبلیغ کا کام لیا گیا۔ اُن کی ایک بہت بڑی تعداد ہندوستان کے مختلف حصوں میں دورے پر بھیج دی گئی جس میں سے بہت کم لوٹ کر آئے۔ باقی یا تو گرفتار ہو کر جیل چلے گئے یا جامعہ سے قطع تعلق کرکے گھر بیٹھ رہے۔ جوں جوں، تحریک خلافت کا زور گھٹتا گیا، جامعہ میں طلباء کی تعداد کم ہوتی گئی اور اُس کی مالی اور تعلیمی حالت بگڑتی گئی۔ یہاں تک کہ جامعہ کے سرپرستوں میں سے اکثر کی یہ رائے ہوئی کہ اُسے بند کر دیا جائے مگر جامعہ کالج کے من چلے طلبہ کے جوشِ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا۔ اُنھوں نے مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی تائید حاصل کی کہ جامعہ کو جاری رکھا جائے۔ اور ذاکر حسین صاحب کو برلن تار بھیج کر اُن سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ اور اُن کے بعض رفیق یورپ سے واپس آکر اپنے آپ کو جامعہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گے۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ ملیہ علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دی گئی اور ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے دو ساتھیوں کو لے کر یورپ سے آئے اور انھوں نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

دہلی آنے کے بعد جامعہ ملیہ کے مقاصد اور اُس کی تنظیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ بدستور اُسی مجلس امناء کے ماتحت تھی، جس کے اکثر ارکان سیاسی لیڈر تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی کوشش سے اُس کی تعلیمی حالت سدھرنے لگی لیکن وہ اب بھی

کسی حد تک مسلمانوں کی سیاسی تحریک سے وابستہ تھی، اور اُس کی مالی حالت اس تحریک کے حال زار کا آیینہ تھی ۔ تحریک خلافت کے ناکام ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ کانگریس کے ساتھ تھے، کچھ اُس سے الگ ہو گئے تھے۔ انگریزی داں طبقے اور علماء کے اتحادِ عمل کا دور ختم ہو گیا تھا اور ان دونوں میں اختلافات بڑھتے جاتے تھے۔ سرکار پرست طبقہ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر زور پکڑ رہا تھا اور مسلمانوں کو بہلا پھسلا کر انگریزوں کے قدموں پر ڈال دینا چاہتا تھا۔ عام مسلمان سیاسی لیڈروں سے خواہ وہ کسی جماعت کے ہوں بدظن ہو گئے تھے، چنانچہ حکیم اجمل خاں صاحب کے انتقال کے بعد جب جامعہ ملیہ کی امداد کے لئے اجمل میموریل فنڈ قائم ہوا اور ہر خیال کے ہندو مسلمان لیڈروں نے متفقہ طور پر اُس کی تائید کی تو نتیجہ بہت، مایوس کن، نکلا۔ جامعہ ملیہ کی مجلس امناء کو جو بڑے بڑے سیاسی لیڈروں پر مشتمل تھی یہ محسوس ہو گیا کہ وہ جامعہ کو کسی طرح نہیں چلا سکتی۔

اس وقت جامعہ ملیہ کے اساتذہ نے (ان میں سے اکثر وہی نوجوان تھے جنھوں نے ۱۹۲۵ء میں طالب علموں کی حیثیت سے جامعہ کی کشتی کو ڈوبنے سے بچایا تھا) عجیب جرأتِ رندانہ سے کام لیا۔ انھوں نے مجلس اُمناء سے درخواست کی کہ جامعہ کو اُن کے سپرد کر دے اور اُنھیں اُس کے چلانے کا موقع دے۔ یہ درخواست منظور ہو گئی۔ مجلس امناء نے اپنے آپ کو توڑ دیا اور جامعہ کی امانت "انجمن تعلیم ملی" کے حوالہ کر دی گئی۔ اس انجمن کے بیشتر ارکان جامعہ ملیہ کے اساتذہ تھے جنھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ بہت قلیل تنخواہوں پر بیس سال تک جامعہ کی خدمت کریں گے۔ اُن کے علاوہ پرانی مجلس امناء کے معدودے چند غیر سیاسی ارکان بھی تھے جو اب تک جامعہ کے لئے مالی امداد فراہم کر رہے تھے۔

جامعہ کے باہمت اساتذہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی سرکردگی میں جس طرح بغیر سرکاری امداد، اور بغیر قومی لیڈروں کی امداد کے اس درس گاہ کو چلایا، جو تکلیفیں اٹھائیں، جن مشکلات کا مقابلہ کیا ان کا ذکر ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ یہاں تو یہ دکھانا ہے

کہ جب جامعہ کی باگ سیاسی لیڈروں کے ہاتھ سے نکل کر معلموں کی ایک جماعت کے ہاتھ میں آگئی
تو اس کے مقاصد میں سے سیاسی مقصد خارج کر دیا گیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جامعہ کے استادوں
اور طالب علموں کے دل میں قومی آزادی کی لگن اور قومی اتحاد کا جوش نہیں رہا بلکہ یہ ہیں کہ وہ
عملی سیاست سے یعنی سیاسی تبلیغ، سیاسی احتجاج اور سیاسی جدوجہد سے کنارہ کشی اختیار
کرکے اپنی ساری کوشش تعلیمی کام میں صرف کرنے لگے۔ یہ تبدیلی دفعتاً نہیں بلکہ دس سال
کے عرصہ میں رفتہ رفتہ واقع ہوئی (۱۹۳۹ء میں جب "انجمن تعلیم ملی" نے "انجمن جامعہ ملیہ"
کا نام اختیار کیا اور ایک نیا دستور مرتب کیا تو اس کا بنیادی مقصد اور اس کے بنیادی
اصول ان الفاظ میں ظاہر کئے گئے:۔

"(۱) اس انجمن کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے:۔

(الف) ہندوستانیوں، خصوصاً مسلمانوں میں ایسی دینی اور دنیوی تعلیم کو
جو قومی اور ملی ضرورتوں کے مطابق اور صحیح اصول تعلیم پر مبنی ہو، رواج دینا اور اس مقصد
کے لئے مناسب تعلیمی ادارے قائم کرنا، ان کا انتظام کرنا اور ان کی نگرانی کرنا۔

(ب) امتحان لینا اور سند اور تصدیق نامے دینا۔

(ج) اشاعت علوم کا کام کرنا۔ علمی تحقیقات کا انتظام کرنا اور اس میں مدد دینا۔

(د) تعلیمی تجربات کرنا۔

(۲) اپنے فرائض کی ادائگی اور اپنے مقاصد کے حصول میں انجمن مندرجۂ ذیل بنیادی
اصولوں کی پابند ہوگی۔

(الف) یہ ایک خودمختار تعلیمی جماعت ہوگی، جو اپنے دستور اور قواعد و ضوابط اور نصاب
تعلیم کے بنانے اور ان میں ترمیم و تنسیخ کرنے میں حکومت کی مداخلت یا کسی اور بیرونی مداخلت کو
گوارا نہیں کرے گی۔

(ب) یہ کوئی ایسی امداد قبول نہیں کرے گی جس کے ساتھ کوئی شرط، اس کے کسی مقصد

یا اصول کے خلاف لگائی گئی ہو۔

(ج) اس کی تعلیم گاہوں میں عام طور پر ذریعۂ تعلیم اول سے آخر تک اُردو ہوگی۔
البتہ خاص صورتوں میں دوسری زبانوں میں بھی تعلیم دی جا سکے گی۔

(د) یہ ہندوستان کے مختلف مذاہب کے پیرووں میں باہمی رواداری اور
دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔"

جامعہ ملیہ کے سیاسی مقصد کو ترک کرنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ اصولاً اس بات کو غلط سمجھتی تھی کہ کوئی تعلیمی ادارہ بحیثیت ادارے کے عملی سیاست میں حصہ لے۔ اس لئے کہ تعلیم کا خاموش کام، سیاست کی ہنگامہ خیز فضا میں انجام نہیں پا سکتا۔ خصوصاً ایک چھوٹی سی جماعت کے لئے جو آزاد تعلیم کے تجربے کو انتہائی مشکل اور ناساز گار حالات میں کامیاب بنانا چاہتی تھی، یہ ناگزیر تھا کہ اپنی ساری توجہ اپنے تعلیمی کام پر مجتمع کر دے۔

مگر اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جس سے جامعہ کے لوگ سیاست سے اس قدر بھڑک گئے کہ اب وہ اس سے دور کا واسطہ بھی رکھنا نہیں چاہتے۔ جس وقت جامعہ قائم ہوئی ملک میں بظاہر یکدلی یکجہتی کا دور دورہ تھا۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ قومیت کے جذبے سے سرشار اور قومی آزادی کے نصب العین کے پرستار تھے۔ سیاسی اسٹیج قومی وحدت کا ایک شاندار منظر پیش کرتا تھا۔ جو نوجوانوں کے قلب کو گرماتا اور روح کو تڑپاتا تھا۔ جامعہ کے بہت سے طالب علموں نے ملک کے اور لاکھوں نوجوانوں کے ساتھ اپنی زندگی کے سب سے قیمتی سال اسی جوش میں ہندوستانی قومی تحریک کی نذر کر دئے۔ مگر دفعتاً ہوا جو پلٹی تو قومی وحدت کا تار و پود بکھر کر رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ قومیت جس کا اس قدر زور شور تھا کوئی واضح اور معین چیز نہیں بلکہ ایک مبہم جذبہ ہے جس کے ساتھ مختلف فرقوں کے مختلف تصورات وابستہ ہیں۔ خود مسلمانوں میں اس مسئلہ کے متعلق سخت اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ مختلف سیاسی پارٹیوں میں بٹ گئے۔ ان میں مسلم لیگ سب سے بڑی اور سب سے منظم پارٹی تھی۔ اور کسی دوسری پارٹی کو تعداد اور

تنظیم کے لحاظ سے اُس سے کوئی نسبت نہ تھی۔ لیکن مسلم لیگ کی طرح چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں بھی، اور کانگریس میں ایسے مسلمان موجود تھے جنھوں نے اپنی ساری عمر ملت اسلامی کی خدمت میں صرف کی، تکلیفیں اُٹھائیں، قربانیاں کیں۔ خصوصاً علمائے دین کا طبقہ جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو بیدار کیا تھا اور انھیں سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی آزادی کی راہ دکھائی تھی۔ ان بزرگوں کے خلاف سب و شتم کا جہاد جاری تھا اور اُن کی طرف سے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جاتا تھا۔ طرفین ایک دوسرے پر مکروہ سے مکروہ اور گندے سے گندے الزام لگاتے تھے جن کو سُن کر دل دہل جاتے تھے۔

یہ تھی مسلمانوں کی سیاست جس سے جامعہ ملیہ نے دور رہنے کا فیصلہ کیا۔ اُس کا یہ فیصلہ یاس پر نہیں بلکہ امید پر مبنی تھا۔ اگر جامعہ کے لوگ ان اخلاق سوز باتوں کے دسویں حصے پر بھی یقین کرتے جو فریقین ایک دوسرے کے متعلق کہتے تھے تو وہ انسانی فطرت سے یا کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جاتے اور اُن کی خدمت کا ارادہ ترک کر دیتے۔ مگر وہ جانتے تھے کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔ البتہ ایک الزام مسلمانوں پر مجموعی طور پر لگایا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کا جوشِ جذبات، بندِ مصلحت، سے اور زورِ تخیل، قیدِ حقیقت سے نا آشنا ہے۔ خصوصاً سیاست کے ہنگامہ خیز میدان میں قدم رکھتے ہی وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ اپنوں کو غیر اور دوستوں کو دشمن سمجھ لیتے ہیں اور اپنی قوت کا بڑا حصہ باہمی مناقشے اور مجادلے میں صرف کر دیتے ہیں۔ اہل جامعہ کو یہ اُمید واثق تھی کہ یہ کیفیت کچھ عرصے کے بعد دور ہو جائے گی اور وقت کا تقاضا مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو اس پر مجبور کرے گا کہ وہ ایک دوسرے پر اعتبار کریں، ایک دوسرے کے خیالات سمجھیں، ایک نصب العین، ایک لائحہ عمل پر جمع ہو جائیں اور مسلمانوں کی یہ متحدہ قوت ہندوستان میں حقیقی اتفاق، حقیقی جمہوریت، حقیقی عدل و مساوات قائم کرنے میں اہم حصہ لے گی۔ انھوں نے یہ طے کیا کہ اس ہیجان و انتشار کے دور میں سیاست سے بالکل الگ رہیں، آنے والے بہتر زمانہ کا انتظار کریں، اپنی بساط کے مطابق مسلمان بچوں اور

نوجوانوں کو اُس زمانے کے لئے تیار کریں اور اس طرح اُس کے قریب لانے میں مدد دیں۔

غرض جامعہ ملیہ نے ایک عرصہ کے لئے سیاست سے قطع تعلق کر کے اپنے آپ کو خالص تعلیمی اصول و مقاصد کا پابند بنا لیا جو انجمن جامعہ ملیہ کے دستور میں بیان کئے گئے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ اُس نے اب تک اِن اصول کی پابندی کہاں تک کی اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا اور اب کیا کرنا چاہتی ہے۔

جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ اپنی آزاد حیثیت کو باقی رکھے۔ اس کی پابندی میں اُسے بڑی زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت کی مداخلت کو نہ منظور کرنے کی وجہ سے نہ تو اُسے سرکاری امداد مل سکتی تھی اور نہ اُس کی سند اور تصدیق نامے تسلیم کئے جا سکتے تھے۔ اُس کے اُستادوں کو انتہائی عسرت کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ اُس کے طالب علموں پر نہ صرف سرکاری نوکری اور وکالت کے بلکہ انجنیری، طبی، ڈاکٹری، زراعت، تجارت اور دوسرے پیشوں کی اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند تھے۔ اُس کے پاس اپنی عمارت نہ تھی۔ وہ عام تعلیم اور علمی تحقیقات کے لئے ضروری سامان بھی فراہم نہیں کر سکتی تھی۔ ترکِ موالات کا جوش ٹھنڈا پڑ جانے کے بعد جامعہ میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ جس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ کی باگ سنبھالی، اسکول اور کالج میں ملا کر سو سے زیادہ طالب علم نہ تھے۔ جامعہ کے کارکنوں کے لئے یہ بڑے امتحان کا وقت تھا۔ اپنی آزادی کے بدلے سرکاری امداد حاصل کر کے وہ مالی مشکلات سے نجات پا سکتے تھے، جامعہ کو مروجہ طرز کی اعلیٰ تعلیم گاہ بنا سکتے تھے۔ مگر اُن کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وسائل کی کمی سے ہار کر مقصد بدل دیں۔ انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ صرف نجی امداد سے جامعہ کو چلائیں گے۔ بظاہر یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی کہ جو کام قوم کے سربرآوردہ رہنماؤں سے نہ ہوا وہ چند گمنام معلم کر سکیں گے یعنی اپنے گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر، مسلمان پبلک سے جامعہ کو چلانے کے لئے کافی مدد حاصل کر سکیں گے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

مگر خدا کی قدرت سے یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ قفس پر خس کی بارش ہونے لگی، اور آشیاں بن گیا۔ پہلے غریب مسلمانوں نے جامعہ کی مدد کے لئے ہاتھ بڑھایا پھر اربابِ دول اور مسلمان ریاستوں نے توجہ کی۔ جامعہ کے مدارس میں طلبہ کی تعداد پانچ، چھ سو تک پہونچ گئی۔ ان کی اپنی عمارتیں بن گئیں، ضروری تعلیمی سامان مہیا ہو گیا' اور جامعہ کے کارکنوں کو اپنی تنخواہیں' جو جینے کے لئے نہ سہی، سانس لینے کے لئے کافی ہیں باقاعدہ ملنے لگیں۔ جامعہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ۱۹۴۲ء میں حکومت نے جامعہ جونیر اور معلمی کے تصدیق ناموں کو بغیر کسی شرط کے تسلیم کر لیا۔ تعلیمی آزادی کی جنگ میں پہلا معرکہ سر ہو گیا۔

لیکن غیروں کے اثر سے آزاد ہونا آزادی کا محض منفی پہلو ہے، جس میں مثبت قدر و قیمت اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب اُسے کسی اعلیٰ مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جامعہ نے اپنی آزادی سے کیا کام لیا۔

سب سے اہم مقصد جسے جامعہ نے سامنے رکھا یہ تھا کہ اپنی تعلیم و تربیت میں اسلامی روح پیدا کرے۔ نظری حیثیت سے، اسلامیات کی تعلیم پر زور دیا گیا۔ نصاب میں سب سے اہم جگہ تفسیر قرآن کو، اس کے بعد سیرت نبوی اور پھر تاریخ اسلام کو دی گئی حدیث اور فقہ کا بھی تھوڑا سا جز شامل کر لیا گیا۔ عربی زبان کی اتنی تعلیم لازمی قرار پائی کہ فارغ التحصیل طالب علم قرآن پاک کو ترجمے اور تفسیر کی مدد سے سمجھ کر پڑھ سکے۔ عملی حیثیت سے، یہ کوشش کی گئی کہ طلبہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو محسوس کریں اور ادا کریں جامعہ کے استادوں کو یہ دعویٰ نہیں کہ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں یا انھیں اپنی کوششوں میں پوری کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن خود ان کا اور دوسروں کا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جامعہ کے بچے اور نوجوان، دوسرے دنیوی مدارس کے طلبہ کے مقابلے میں

اپنے مذہب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں، اور اُن کی زندگی میں مذہبیت کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔
لیکن جامعہ کے استادوں کے ذہن میں اسلامیت کا تصور صرف اس چیز تک محدود نہیں جسے عرف عام میں مذہبیت کہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک روح اسلامی روحِ انسانیت کے مترادف ہے اور اسلامی سیرت، عام انسانی فضائل کا مجموعہ ہے۔ جس کی بنیاد انفرادیت اور اجتماعیت کے صحیح امتزاج پر ہے۔ تعلیم و تربیت کا اصل مقصد آزادی اور ضبط میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں، انفرادی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیجائے مگر انھیں اجتماعی مقاصد کے تابع رکھا جائے۔ فرد کی آزادئ فکر اور آزادئ عمل کو زیادہ سے زیادہ اُبھارا جائے مگر ایک اجتماعی قانون کے دائرے کے اندر، جو قانونِ فطرت اور قانونِ الٰہی کے مطابق ہو۔

عہد جدید میں تعلیم کے لئے نئے نئے طریقے اختیار کئے گئے ہیں جن کا اصل اصول یہ ہے کہ بچے کی شخصیت کو ایک جامد پتھر سمجھ کر، معلم کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق تراشنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ ایک نمو پذیر پودا سمجھ کر، اُس کی اندرونی قانونِ ارتقاء کے مطابق بڑھنے اور پنپنے کا موقع دیا جائے۔ مدرسہ اُس کے لئے مناسب زمین اور آب و ہوا مہیا کرے، معلم اس کی حفاظت اور پرداخت کرے مگر اس بات کو خود اس پر چھوڑ دے کہ وہ مٹی، پانی، ہوا، اور روشنی سے اپنی فطری غذا حاصل کرتا رہے۔

جامعہ نے اپنی تعلیمی آزادی سے سب سے بڑا فائدہ یہ اٹھایا کہ تعلیم کے فرسودہ طریقے کو چھوڑ کر ان نئے طریقوں کا تجربہ کیا۔ اُس نے ابتدائی منزل میں جہاں بچے کی شخصیت زیادہ تر اجتماعی ماحول کا سہارا چاہتی ہے، عام درسی تعلیم کے ترقی یافتہ طریقوں کے ساتھ ساتھ منصوبی طریقِ تعلیم اختیار کیا، جس میں انفرادی اُپج، اشتراکِ عمل اور امداد باہمی کی محتاج ہوتی ہے۔ ثانوی منزل میں جہاں بچہ نوجوانی کی سرحد میں قدم رکھتا ہے اور اُس کی انفرادیت بیدار ہونے لگتی ہے، منصوبی طریق کی تکمیل کے لئے تفویضات کا انفرادی

طریقہ بھی جاری کیا گیا۔

منصوبی اور انفرادی طریقے، تعلیمی حلقوں میں معروف ہیں۔ ان کے علاوہ جامعہ اوکھلا گاؤں کے مدرسے میں جو دہلی ڈسٹرکٹ بورڈ نے اُس کے سپرد کر دیا ہے، بنیادی طریق تعلیم کا تجربہ کر رہی ہے۔ اور اپنے ٹریننگ اسکول میں اس طریق کے مطابق تعلیم دینے کے لئے معلم تیار کر رہی ہے۔ سات برس کے قلیل عرصہ میں اس تجربہ میں بہت کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ جامعہ کے ٹریننگ اسکول نے گذشتہ سال اپنے ڈپلوما کو حکومت ہند سے غیر مشروط طور پر تسلیم کرالیا ہے۔ اور بنیادی تعلیم کو جو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس میں اس ادارے کا بہت بڑا حصہ ہے۔

منصوبی طریق اور بنیادی طریق میں مشترک عنصر، تعلیم بالعمل ہے۔ دونوں میں ایک واضح عملی مقصد کے پیش نظر ہونے کی وجہ سے بچے کی دلچسپی اور توجہ جاگ اٹھتی ہے۔ اُس کے جسم اور دماغ میں ایک غیر معمولی چستی اور مستعدی پیدا ہو جاتی ہے۔ فعالی ادراک اور تخلیقی عمل کے سوتے کھل جاتے ہیں۔ اپنی اپج سے اور اپنی ذمہ داری پر کام کرنا اس میں آزادی اور خود اعتمادی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور اپنے کام کو دوسروں کے کام سے ہم آہنگ کر کے ایک اجتماعی مقصد کی تکمیل میں مدد دینا اُسے ضبط اور تعاون سکھاتا ہے۔

(تربیت کے معاملے میں جامعہ کا اصول یہ ہے کہ مدرسے اور دارالاقامہ کو متنوع، معقول اور صالح زندگی کا نمونہ بنا دیا جائے تو یہ زندگی خود بہترین اخلاقی مؤدب اور معلم کا کام دیتی ہے۔ ذہنی تعلیم کی طرح اخلاقی تربیت کا بھی مؤثر طریقہ یہی ہے کہ بچے کی عملی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے بہترین محرکات اور اُن کے ظاہر ہونے کے لئے بہترین مواقع فراہم کئے جائیں۔

(تعلیم و تربیت کے ان اصولوں پر جامعہ کے استاد عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کی قابلیت محدود اور وسائل قلیل ہیں مگر اس کے باوجود جو نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ وہ قابل فخر نہ سہی مگر حوصلہ افزا ضرور ہیں۔ ذہنی قابلیت کے لحاظ سے جامعہ کے طالب علم

اوسط درجے کے اور اخلاقی سیرت کے لحاظ سے اوسط درجے سے اونچے ہوتے ہیں۔ انسانیت ہمدردی، سادگی، جفاکشی، خودداری اور غیرت، حیا اور حمیت اُن کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ خلوص، سچائی، صاف دلی، صاف گوئی۔ فرض شناسی اور ذمہ داری، اخلاقی جرأت اور استقلال کی صفات بھی ان میں عام معیار سے کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہیں۔ ابھی وہ ملک میں اتنی بڑی تعداد میں نہیں پھیلے کہ عام قومی زندگی کو متاثر کر سکیں۔ مگر اُن میں سے بہت سے اپنے اپنے دائرۂ عمل میں محسوس طور پر مفید اثر ڈال رہے ہیں۔

لڑکوں کی تعلیم میں جامعہ کو جو تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے اُس نے اُس کے کارکنوں میں یہ حوصلہ پیدا کیا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا کام بھی شروع کرے۔ چنانچہ وہ بہت جلد ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول قائم کرنا چاہتی ہے جس میں مسلمانوں کی مخصوص ضرورتوں کے پیشِ نظر تعلیم کے جدید ترین طریقوں کے مطابق دینی اور دنیوی تعلیم دی جائے گی۔ اُس کا ایک مختصر خاکہ چھوٹے سے رسالے کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

علمی دیانت داری کے خلاف ہوگا اگر تصویر کے روشن رخ کے ساتھ اس کا تاریک رخ نہ دکھایا جائے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں جامعہ آہستہ آہستہ ترقی کی کشادہ شاہراہ پر گامزن ہے۔ مگر اعلیٰ تعلیم میں ایک بند گلی میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ جامعہ کی سند کے حکومت اور یونیورسٹیوں کی طرف سے تسلیم نہ کئے جانے کی وجہ سے کالج کے طالب علموں پر صرف سرکاری نوکری کے نہیں بلکہ اعلیٰ صنعتی اور فنی تعلیم کے اور بہت سے پیشوں کے دروازے بند ہیں۔ اس لئے جامعہ کالج میں طالب علموں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ دوسرے ایک بے دلی اور بے چارگی کی فضا پیدا ہو گئی ہے جو اُن کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی نشوونما کے لئے ناسازگار ہے۔ اس مشکل کے آسان ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو حکومت جامعہ کی سند کو غیر مشروط طور پر اُس کی تعلیمی آزادی پر ذرا سی بھی پابندی عائد کئے بغیر تسلیم کرے یا جامعہ خود صحافت، تجارت، صنعت و حرفت اور دوسرے آزاد پیشوں کی اعلیٰ تعلیم کا

انتظام کرے ۔ پہلی صورت تو آئندہ سیاسی حالات پر منحصر ہے۔ جن کا ابھی کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بالفعل دوسری صورت پیش نظر ہے اور اس پر عمل کرنے کے لئے وہ پہلا قدم اٹھانے والی ہے۔ وہ جوبلی کے بعد ایک پولی ٹکنک قائم کرنا اور اُسے جلد سے جلد ٹیکنیکل کالج کے درجے پر پہونچانا چاہتی ہے۔

جامعہ نے اپنی تعلیمی کوششوں کو صرف اپنی چار دیواری تک محدود نہیں رکھا بلکہ جہاں تک اُس کے محدود وسائل نے اجازت دی اُس نے جمہور مسلمین کی تعلیم و تربیت کا کام بھی انجام دیا۔ اُس نے اُن بچوں اور بالغوں کے لئے جو باقاعدہ مدرسوں میں تعلیم نہیں پا سکتے ، ادارۂ تعلیم و ترقی کے ذریعے سے ذہنی تعلیم کا ، اور "جامعہ اسکاؤٹنگ" کے ذریعہ سے جسمانی اور اخلاقی تربیت کا انتظام کیا۔ "تعلیم و ترقی" کی تحریک شہر دہلی میں کامیابی سے چل رہی ہے اور رفتہ رفتہ اپنے دائرہ عمل کو وسعت دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُس نے تعلیم بالغان کا جو وسیع اور جامع تصور پیش کیا ہے وہ ملک کے تعلیمی حلقوں میں بہت قدر کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ "جامعہ اسکاؤٹنگ" کی تحریک ابھی تھوڑے ہی دن پہلے شروع ہوئی ، مگر اس قلیل عرصہ میں دہلی بمبئی اور بعض اور شہروں میں بہت مقبول ہوئی ہے

علمی تحقیق اور اشاعت علوم کے میدان میں بھی جامعہ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ "مکتبۂ جامعہ ملیہ" نے اردو کے ایک ممتاز اور مؤقر دارالاشاعت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اُردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے "اردو اکاڈمی" اور علوم اسلامی کی تحقیق کے لئے "بیت الحکمت" چھوٹے سے پیمانہ پر قائم ہیں۔ جوبلی کے بعد جو کام پیش نظر ہیں ، ان میں ان دونوں اداروں کی نئی اور وسیع تر تنظیم اور کتب خانۂ جامعہ کی توسیع بھی شامل ہے۔

یہ ہے ایک سرسری خاکہ جامعہ ملیہ کے مقاصد کا اور اُن کوششوں کا جو اُس نے

پچھلے پچیس سال میں ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کی ہیں۔ جامعہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کامل تعلیمی آزادی چاہتی ہے اور اس آزادی کا یہ استعمال کرنا چاہتی ہے، کہ مسلمانوں کو ان کی ضرورت، مصلحت اور مذاق کے مطابق دینی اور دنیوی تعلیم دےکر اس قابل بنادے کہ وہ ہندوستان کی زندگی میں اپنی شایان شان جگہ لے سکیں اور ہندوستان کو اقوام عالم کی صف میں اس کی شایانِ شان جگہ دلاسکیں۔

(سید عابد حسین)

جامعہ ملّیہ کا نصبُ العین

ذاکر صاحب کے خیالات کی روشنی میں۔

دہلی سے آٹھ میل دور اوکھلے کے چھوٹے سے گاؤں کے قریب، ایک درس گاہ ہے
جس کی ابتدا آج سے پچیس۲۵ سال پہلے علی گڑھ کے شہر میں چند پرانی کچی پکی عمارتوں میں
ہوئی تھی۔ آج اس کی اپنی خوبصورت اور عالیشان عمارتیں ہیں۔ لیکن انقلاب اور خدمت
کی جو روح اس میں پہلے دن کارفرما تھی وہی آج بھی کام کر رہی ہے۔ اس درس گاہ
میں خاموشی اور متانت کے ساتھ ہندوستان، بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں
کے تعلیمی مستقبل کی تشکیل ہو رہی ہے۔ یہ درس گاہ مالی اعتبار سے نادار ہے اور اس کو
اپنے فقر پر فخر کرنے کا حق بھی ہے لیکن اس کے پاس عین پسندی اور بلند نظری کی وہ
دولت ہے جو اس کو دوسری بڑی اور دولت مند درسگاہوں کے مقابلے میں امتیاز
بخشتی ہے۔ اس جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچیس۲۵ سالہ جوبلی کے موقع پر میں اس کے کارکنوں
اور اس کے نصب العین کے حضور میں اپنا ہدیہ عقیدت و احترام پیش کرتا ہوں۔

مغلوں کی تہذیب کا چراغ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اٹھارویں صدی
کے شروع ہی میں بجھنا شروع ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ علم اور تعلیم و تہذیب کی
شمعیں بھی بھڑکنے لگی تھیں۔ جس وقت تک انگریزوں نے ملک میں اپنا اقتدار مستحکم کیا
ملک میں بڑی حد تک جہالت کی تاریکی چھا چکی تھی اور کمپنی کی حکومت اور برطانوی حکومت
کو شروع میں نہ تعلیم کی ضرورت کا احساس ہوا نہ انھوں نے اس کے لئے کوئی منظم کوشش کی

انھیں اگر کوئی فکر تھی تو اتنی کہ ان کے دفتروں اور ادنے درجے کی ملازمتوں کے لئے پڑھے لکھے ہندوستانی مل جائیں تاکہ ان کا روزمرہ کا کام چل سکے۔ جہانتک مسلمانوں کا تعلق ہے اس تاریکی میں امید کی پہلی کرن اس وقت پھوٹی جب سرسید نے ۱۸۷۵ء میں ایک اسلامی درسگاہ کی بنیاد ڈالی۔ اس زمانے کے جو سیاسی حالات تھے اور قومی زندگی جس انتشار اور مایوسی کے دور میں سے گذر رہی تھی اس کے پیش نظر وہی کچھ ہو سکتا تھا جو سرسید نے کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مغرب کی برتری کا دور آرہا ہے اور مستقبل میں میدان مغربی علوم و فنون مغربی سائنس اور صنعت و حرفت کے ہاتھ ہوگا اس لئے ہندوستانیوں کو بالخصوص مسلمانوں کو جن کی بہبودی کی انھیں فکر تھی، چاہیئے کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں اور خود کو اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں جس کا سکہ رواں ہونے والا ہے بے شک اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو قائم رکھنے کے لئے مذہب اور بعض مشرقی علوم اور زبانوں کی تعلیم بھی ضروری ہے اور سرسید نے اس کا انتظام بھی کیا لیکن اس کی حیثیت زیادہ تر دفاعی تھی۔ خطرہ تھا کہ مغربی خیالات مذہبی عقائد پر چھاپہ نہ ماریں اس لئے مذہبی تعلیم کا دینا بھی ضروری سمجھا گیا لیکن اصلی زور اس "انگریزی" تعلیم کے حاصل کرنے پر تھا جس کے خول میں آج تک ہمارے مدرسے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آج کے بے صبر نقاد کو یہ نصب العین اور یہ نقطہ نظر تنگ اور محدود اور سرسید کا کارنامہ حقیر معلوم ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کے جمود اور بے حسی میں اتنی حرکت اور ترقی کا ولولہ پیدا کر دینا بھی ایک بڑا کام تھا۔ اگر سرسید اس تعلیمی جہاد میں غیر معمولی کوشش اور انتظامی قابلیت اور مصلحت شناسی سے کام نہ لیتے تو شاید ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ بہت مختلف ہوتی وہ بیدار تو دیر سویر ضرور ہوتے لیکن بہت ممکن تھا کہ اس میں نہایت خطرناک تاخیر ہو جاتی ان کے کام کی عظمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ علی گڑھ کالج کے قیام کے پچاس سال بعد تک باوجود اعتراض اور مخالفانہ تنقید کے کوئی شخص تعلیم کے میدان میں

کوئی بہتر چیز پیش نہ کرسکا۔ ۱۹۱۸ء میں جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی ہے اس وقت تک
تعلیم کا وہی محدود تصور اپنی جگہ پر قائم تھا جو ہر معاملے میں نگاہ شوق سے مغرب کی
دریوزہ گری کرتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اعتراض کرنا آسان ہے، کسی نئی اور بہتر چیز کو بنا کر پیش
کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے لوگ آسان بات کرتے رہے، مشکل کام نہ کرسکے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک اس صورت حال کا ردعمل تھی جو بیسویں صدی کے
آغاز سے، مختلف سیاسی اور معاشرتی وجوہ کی بدولت ہندوستان میں پیدا ہو رہی تھی
اور جس کو جنگ عظیم کے اثرات نے زیادہ اجاگر کر دیا تھا۔ اس عرصے میں ہندوستان اپنی
کھوئی ہوئی روح، اپنی لٹی ہوئی خودداری اور اپنی تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش کی عظمت
سے واقف ہو چلا تھا اور اُن کو دوبارہ حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں چٹکیاں
لینے لگی تھی۔ اس کو تعلیم کی ضرورت تھی، شدید ضرورت تھی۔ لیکن حساس اور زمانہ شناس
طبیعتوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ملک کی نجات کے لئے وہ مروّجہ تعلیم کافی نہیں جو خواص
تک محدود ہو اور عوام کی زندگی پر اس کی چھوٹ بھی نہ پڑے۔ جو ان میں غلامی کی ذہنیت
کو پختہ کر دے، جو ان میں سوال کی عادت پیدا کر کے ان کی قومی خودی کو کمزور کر دے۔
اب ایک ایسی تعلیم درکار تھی جو قومی زندگی کے نئے تقاضوں اور نئے مطالبوں کے ساتھ
ہم آہنگ ہو، جو مدرسوں کو محض امتحان پاس کرانے کی مشین نہ سمجھے۔ بلکہ ان کے ذریعہ
طلبہ کی فطری صلاحیتوں کی بہترین تربیت کرے، جو انھیں افراد کا سبہ بنائے، ان کا
اور ان کے سماج کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑے، جو ان کو ذہن بیدار اور قلب گداز کی دولت
سے مالا مال کرے، جس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہو کہ عوام کی زندگی کے اندھیرے کو
اجالے میں تبدیل کرسکے۔ اس دھندلے سے احساس کی بدولت، ہندوستان میں بہت
سے نئے تعلیمی ادارے قائم کئے گئے لیکن ان میں سے چند کے سوا، جن میں ٹیگور کا شانتی
نکیتن خاص طور پر قابل ذکر ہے، کسی کو بھی استقلال نصیب نہیں ہوا۔ یا تو انھیں اچھے

کارکن نہیں ملے یا وہ زمانے کی صحیح نباضی نہ کر سکے، بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، اُن کو قومی زندگی میں کوئی مستقل جگہ نہ مل سکی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا امتیاز یہ ہے کہ یہ گذشتہ پچیس سال سے باوجود ہر قسم کی مشکلات اور مایوسیوں کے، باوجود اہل دولت اور حکومت کی دستگیری سے محروم ہونے کے برابر اپنا کام کئے جا رہی ہے۔ اس طویل عرصے میں، جو اس کے لئے سراسر دورِ ابتلا رہا ہے، اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی ذہنی دیانت اور تعلیمی قیادت کو قائم رکھا ہے۔ اور مصلحت وقت کی خاطر اپنے مقصد اعلیٰ کو آلودہ نہیں کیا۔ اسی وجہ سے بیشتر لوگ ابھی تک اس کی تعلیم کی سچی قدر سے ناواقف ہیں اور معمول پسندی یا سرکاری ملازمت کے شوق میں گرفتار مروجہ تعلیم کو اس پر ترجیح دیتے ہیں مگر جامعہ نے کبھی سستی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ باوجود اس کے رفتہ رفتہ اس کا اثر اور اس کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے اور جس طرح صبح کے سورج کی روشنی آہستہ آہستہ اندھیرے مکانوں اور بازاروں اور گلیوں اور کونوں میں اپنی جگہ پیدا کر لیتی ہے اسی طرح جامعہ بھی اپنی عمل پسندی، اپنی دیانت عمل اور اپنے ایثار کی بدولت رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہے۔

جامعہ کا نصب العین کیا ہے؟۔ اس کا مفصل جواب دینا تو جامعہ کے کارکنوں کا کام ہے۔ البتہ اُس کے نصب العین کی ایک جھلک جو میں خود ذاکر صاحب کے خیالات کی روشنی میں دیکھ سکا ہوں، اس مضمون میں دکھانے کی کوشش کروں گا۔ کئی سال ہوئے ذاکر صاحب نے ایک مختصر سے رسالے میں، یہ بتایا تھا کہ ان کے خیال میں " جامعہ کیا ہے"۔ اس بحث کے دوران میں وہ لکھتے ہیں :-

"جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی

بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب و خیال معلوم ہوتا ہے۔ مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت، خلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔ اگر ہم میں یہ صفات تھوڑی بہت بھی موجود ہیں تو ہمارا یہ خواب بھی سچا ہو کر رہے گا۔ جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں، تعلیم دے۔ علم محض روزی کی خاطر، جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا، دونوں اس کی نظر میں بہت تنگ اور محدود ہیں۔ وہ علم زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے دسیع دائرے میں مذہب، حکمت، صنعت سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانی چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لئے مفید ہو...... اس کے نصاب کے تین اہم اجزا ہیں: مذہب کی تعلیم، فطرت اور انسانی زندگی کا مطالعہ، ایمان اور عقیدے، عقل و فہم کی تربیت کے ساتھ ادب اور مصوری کے ذریعے سے تخیل اور جذبات کی تربیت اور دستکاری کے ذریعہ سے ہاتھ کی تربیت کی جائے گی ''

ان مختصر الفاظ میں ذاکر صاحب نے جامعہ کے نصب العین اور اس کے طریقۂ کار دونوں پر بہت مفید روشنی ڈالی ہے جب تک ہم اپنے ذہن میں اس تصور کا مقابلہ اس تصور سے نہ کریں جو ہمارے عام سکولوں کی تعلیم پر حاوی ہے اس وقت تک یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ ان بظاہر سیدھی سادھی باتوں اور واضح اصولوں میں کتنا زبردست تعلیمی انقلاب مضمر ہے۔ اس میں گویا انسانی قدروں کو پرکھنے کے لئے ایک نیا معیار پیش کیا گیا ہے۔ ملک اور ملت کے مفاد ایک دوسرے کے منافی نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں، قومی تہذیب میں وہ رنگ بھرنا چاہیئے جو انسانی تہذیب کی رنگارنگی کے ساتھ میل کھا جائے۔ تعلیم میں مقام اعزاز علم کو نہیں بلکہ زندگی کو حاصل ہے جس کی وسعت میں دین اور دنیا، سیاست اور سماج سبھی کچھ سما جاتے ہیں۔ علم کو علم کی خاطر پوجنا، یا اس کو ایک بازاری جنس سمجھنا جس کی قیمت ہر دفتر کا افسر لگا سکتا ہے غلط ہے۔ اس کو زندگی کا خادم بنانے کی ضرورت ہے۔ انسان کا سب سے بڑا شرف کام کرنا ہے۔ بشرطیکہ وہ اسے دیانت داری کے ساتھ انجام دے اور وہ سماج کے لئے فائدہ کا باعث ہو۔ اس کی تعلیم اس وقت مکمل ہوگی جب دماغ اور دل کے ساتھ ساتھ اس کی قوت عمل اور دستکاری کی صلاحیت بھی تربیت پائے گی تاکہ اس کی متنوع شخصیت کا ہر پہلو اجاگر ہو سکے۔ جو لوگ تعلیم جدید کے نئے تقاضوں سے باخبر ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہی وہ بنیادی قدریں ہیں جن کو اس زمانے میں نئی تعلیم رائج کرنے کی کوشش کر رہی ہے جہاں ذاکر صاحب علم کو زندگی کا خادم بنانا چاہتے ہیں وہاں وہ اسے دولت کا مخدوم دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس خطرے کا شدید احساس ہے جو علم پر ثروت کے حاوی ہو جانے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اہل ثروت اپنے اثر اور رسوخ سے فائدہ اٹھا کر تعلیمی نصب العین کو اپنے اغراض کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ذاکر صاحب نے اصولاً اور عملاً ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ دولت کو علم کا خادم ہونا چاہیئے، علم کو ہرگز دولت کا دست نگر نہیں بنانا چاہیئے۔ اگر ارباب دولت

حکومت اپنی دولت یا قوت کے زور پر کسی تعلیم گاہ یا تعلیمی نظام پر قابض ہو جائیں اور اس کی داخلی آزادی کو چھین کر اسے اپنا آلہ کار بنالیں تو تعلیم کی روح مردہ ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے اصلی مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتی۔ ہندوستان میں تعلیم پر حکومت کا تسلط اور یورپ اور امریکہ میں دولت اور حکومت دونوں کا تسلط رہا ہے اور اس کے نتائج نگاہ عبرت سے بار بار دیکھے ہیں جامعہ ملیہ میں انھوں نے ہمیشہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا ہے یہاں تک کہ چندہ کرنے میں اس بارے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جامعہ کو اپنا خرچ چلانے کے لئے ہمیشہ چندہ جمع کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کا چندہ کرنے کا بھی ایک نرالا انداز ہے۔ اور انھوں نے اس گداگری تک میں جامعہ کی روح کی عفت کو قائم رکھا ہے۔ اول تو انھوں نے اس مقصد کے لئے صرف ارباب ثروت کی طرف رجوع نہیں کیا بلکہ غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کا ایک ایسا حلقہ قائم کر لیا ہے جو تھوڑا تھوڑا چندہ باقاعدگی کے ساتھ دیتے ہیں اور رسالہ "ہمدرد جامعہ" کے ذریعہ جامعہ کے حالات اس کی مشکلات اور اس کی ترقی سے آگاہ رہتے ہیں۔ اس طرح جامعہ کا تعلق عوام کے ساتھ قائم ہو گیا ہے جو ہر قومی ادارے کی صحت کے لئے ایک شرط لازم ہے ورنہ اندیشہ یہ ہوتا ہے (جیسا بعض اداروں میں ہوا) کہ وہ ایک مخصوص اور غیر ذمہ دار گروہ کی اجارہ داری بن کر رہ جائے گا اور زندگی کی صالح تحریکیں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں گی ذاکر صاحب نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ دولت کی نجات اور سعادت اسی میں ہے کہ وہ علم کی خدمت کرے اور اچھے کاموں کے قدم چومے ورنہ وہ دولت مند کے گلے میں لعنت کا طوق ہے ایک دفعہ ایک رئیس نے جامعہ کو امداد دینے کا وعدہ کر کے پورا نہیں کیا رقم اچھی خاصی تھی اور اس کے نہ ملنے سے ان کے رفقائے کار کو پریشانی ہوئی اور انھوں نے مشورہ دیا کہ دوبارہ ملئے اور تقاضا کیجئے لیکن ذاکر صاحب کی پیشانی پر استغنا پر شکن نہ پڑی اور انھوں نے صرف اتنا کہا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ لوگ خود خوشامد کریں گے اور

چندہ دیں گے۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ اگر نہ دیں گے تو؟ ذاکر صاحب نے فوراً اپنے مخصوص انداز میں جس میں ظرافت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کوئی پتے کی بات چھپی ہوتی ہے۔ جواب دیا "نہ دیں گے تو۔ خود ان کی ہوا خیزی ہو جائے گی!" یہ بات نہیں کہ ان کو روپیہ کی قدر یا اس کی پروا نہیں۔ جن لوگوں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر قومی اداروں کو چلایا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے کارکنوں کو روپیہ کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے اور کس طرح اس فکر میں ان کا دن کا آرام اور رات کی نیند جاتی رہتی ہے۔ جامعہ پر بارہا ایسے کٹھن وقت آئے ہیں جب بے زری کی پریشانی ایمان کی قوت سے ٹکرائی ہے لیکن یہ مردِ مومن کبھی اس بات کے لئے تیار نہیں ہوا کہ روپیہ کی خاطر جامعہ کے مخصوص اور آزاد نصب العین پر آنچ آنے پائے۔ ایک موقعہ پر جامعہ کا اصول حیات خود انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:۔

> "مستقل سرمایہ جامعہ کا ہے نہ کبھی ہوگا۔ اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمت اور ایثار اور قوم کی عام ہمدردی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں مگر میرے نزدیک تو یہ سرمایہ لازوال سرمایہ ہے۔ اگر جامعہ ملک اور قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی۔ لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانونِ قدرت اسے زندہ رکھے گا اور دنیا کی کوئی قوت اُسے فنا نہیں کر سکے گی۔"

شاید ذاکر صاحب ان الفاظ کو کہتے وقت شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن شریف کے اس اٹل اصول کی تفسیر کر رہے تھے۔ فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض! اسی قسم کی ایک دل میں چبھنے والی بات انھوں نے اس یادگار موقع پر کہی تھی جب اوکھلے میں جامعہ کی شاندار عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا! ذاکر صاحب کے ندرت تخیل کا ایک اظہار یہ بھی تھا کہ انھوں نے سنگِ بنیاد مشاہیر ہند میں سے کسی سے نہیں رکھوایا بلکہ یہ عزت جامعہ کے سب سے کم سن طالب علم کے سپرد کی! اس سے یہ دکھانا مقصود تھا

ِ کی نظر مستقبل کی طرف ہے جس کی تعمیر اس نژاد نو کا کام ہے جو آج مدرسوں میں تعلیم پا رہی ہے)
ِ موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا (الفاظ کی
ِت کی ضمانت نہیں کرتا لیکن مفہوم یہی تھا)

" بڑی بڑی شاندار عمارتوں کے بنانے میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں تعلیم کی روح ان میں قید ہو کر نہ رہ جائے اور ساز و سامان کی فراوانی تعلیم گاہ کے نصب العین کو دبا کر فنا نہ کر دے، آپ کو معلوم ہے کہ جامعہ کو چھوٹی چھوٹی کچی عمارتوں اور جھونپڑیوں میں شروع کیا گیا تھا لیکن اس کے کارکنوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس مادی بے سرو سامانی کی حالت میں بھی اس کی آزادی اور نصب العین کی بلندی کو قائم رکھا جائے، اگر ان نئی عمارتوں کے بننے سے یہ اندیشہ ہو کہ جامعہ اپنے نصب العین پر قائم نہ رہ سکے گی تو میں دعا کروں گا کہ یہ عمارتیں تیار ہونے سے پہلے ہی برباد ہو کر زمین میں مل جائیں !"

جس زمانے میں افراد کی عظمت کا اندازہ ان کے لباس اور نمائشی شان سے اور درسگاہوں کی حیثیت کا اندازہ ان کی عمارتوں اور ساز و سامان سے کیا جاتا ہو۔ اس قسم کا خیال ایک غیر معمولی صاحب نظر انسان کے دماغ ہی میں پیدا ہو سکتا ہے !! لیکن مجھے یقین ہے کہ جس درسگاہ کے کارکنوں کو اس اندیشہ کا احساس ہو اور جس کا راہبر ذاکر حسین ہو اس کو یہ مصیبت پیش نہیں آسکتی کیونکہ ہر درسگاہ میں وہی روح اور وہی جذبہ اور وہی نظر کام کرتی ہے جو اس کے کارکنوں کے دل اور دماغ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور ذاکر صاحب کے حریم ذات میں جو چراغ روشن ہے وہ صرف جامعہ ہی کو نہیں بلکہ تمام ملک اور قوم کو روشن رکھنے کی امنگ اور صلاحیت رکھتا ہے۔

(جامعہ کی علمی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں ذاکر صاحب نے قابل، مستعد اور پر خلوص کارکنوں کی ایک ایسی جماعت اکٹھی کر لی ہے جس کے ساتھ وہ احترام خلوص

اور رفاقت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اور جس کو ان کی ذات کے ساتھ عقیدت ہے ان کی ذاتی کشش کا فیض ہے کہ جامعہ میں گزشتہ بیس سال سے بہت سے ایسے معلم کام کر رہے ہیں جن کو باہر بہترین مواقع مل سکتے تھے۔ لیکن ان کے دل میں انھیں قدروں کی لگن ہے اور اسی عشق کا چراغ روشن ہے جو ذاکر صاحب کے سینے میں فروزاں ہے۔ اس لئے وہ جامعہ کو چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں۔ انھیں کبھی معاش کی طرف سے اطمینان خاطر نصیب نہیں ہوا لیکن اس کے بدلے انھیں اعتماد، رفاقت، عین پسندی اور احساس خدمت کی وہ دولت ملی ہے جو بعض "مصلحت ناشناس" لوگوں کے نزدیک مالی فراغت سے بھی زیادہ قابل قدر چیز ہے! اگر ذاکر صاحب کی شخصی کشش ان کے دلوں کو جامعہ کی طرف نہ کھینچتی تو اس درسگاہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان درجنوں قومی درسگاہوں کا ہوا جو ۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریک کے دوران میں قائم ہوئی تھیں۔ قوم کے جوش اور ولولے نے ان کو وجود بخشا تھا اور قوم ہی کی غفلت اور استقلال کی کمی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں جب ذاکر صاحب نے جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اس وقت وہ تقریباً نیم جاں تھی اور اس کے بانیوں اور کارکنوں تک کے ذہن میں اس کا کوئی واضح تصور اور نصب العین نہ تھا۔ بعض لوگ اس کو ایک تعلیمی درسگاہ بنانا چاہتے تھے، بعض کی خواہش تھی کہ اس میں سیاسی کارکنوں کی تربیت کی جائے۔ لیکن جہاں تک اس کی مالی اور انتظامی ذمہ داریوں کا تعلق ہے کوئی شخص بھی (سوائے دو تین بندگان خدا کے جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی مدد کی) اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔ حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد ایک وقت آزمائش کا ایسا آیا تھا جب تمام عمائدین ملک کی یہ رائے تھی کہ اس ادارے کے چلنے کا امکان نہیں ہے اس کو بند کر دینا چاہیئے۔ لیکن ذاکر صاحب کی اولوالعزمی اور بلند نظری اور ان کے ساتھیوں کے ایثار نے اس شکست خوردہ رائے کو نہیں مانا اور خود اپنے بل بوتے پر نہ صرف وہ سخت کڑیاں جھیل گئے بلکہ جامعہ کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ آج موجود ہے اور ہند اور بیرون ہند کے اہل الرائے ماہرین تعلیم سے خراج تحسین وصول کرتی ہے۔

کارکنان جامعہ کی نظر میں جامعہ کا تعلیمی تصور اور مسلمانوں کی قومی زندگی میں اس کا وظیفہ کیا ہے؟
یہ بحث لمبی ہے اور اس کا مفصل جواب دینا انھیں کا کام ہے۔ میں تو جیسا عرض کر چکا ہوں۔
ایک جھلک جامعہ کے اُس نصب العین کی دکھانا چاہتا ہوں جو ذاکر صاحب کے ذہن میں ہے
کیونکہ ذاکر صاحب نے خود کو جامعہ کے ساتھ اس طرح مدغم کر لیا ہے کہ بقول ان کے ایک
دوست کے جامعہ اور ذاکر حسین ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ ذاکر صاحب کا خیال ہے کہ
علی گڑھ کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت کی اور ان کے متوسط اور اعلیٰ
طبقے کو نئی تعلیم اور علوم جدیدہ کی طرف مائل کیا اور انھیں ازمنہ متوسطہ کے جھٹپٹے سے نکال کر
عصر حاضر کا راستہ دکھایا۔ لیکن سر سید کے وقت سے اب تک زمانہ بہت بدل گیا ہے اور
تعلیم اور تہذیب، سیاست اور معاشرت کے مسائل کو نئے انداز نظر اور نئی تفسیر کی ضرورت ہے
اس وقت تعلیم کا مسئلہ ایک محدود سا مسئلہ سمجھا جاتا تھا یعنی اعلیٰ طبقے کے افراد کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا
بندوبست کر دیجے، ان کو اچھی نوکریاں دلا دیجے، انگریزی نصاب اور مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ
تھوڑی سی تعلیم دینیات کی دے دیجے اور بس! دین و دنیا دونوں کے مسئلوں کا حل ہو جائے گا۔
لیکن عصر حاضر کے مسائل اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اب کسی خاص جماعت کی تعلیم اور تہذیب
کا سوال نہیں۔ عوام کی تعلیم کا سوال ہے۔ اب چند تعلیم یافتہ لوگوں کو نوکریاں دلانے کا سوال
نہیں بلکہ قوم کے تمام افراد کی علمی، عملی اور فنی صلاحیتوں کی تربیت کر کے انھیں افراد کار بنانا ہے
اور زندگی کے تقاضے اس قدر شدید اور اس کا مقابلہ اس قدر سخت ہو گیا ہے کہ محض
امتحان پاس کر لینے سے صلاحیت عمل کی سند نہیں ملتی بلکہ بہت بہتر اور مناسب تعلیم کے
ذریعے ذہنی تربیت کا انتظام کرنا ہے۔ اب درسی تعلیم کی کچی پکی عمارت بنا کر اس پر دینیات
کی سفیدی کا ایک ہاتھ پھیر دینے سے کام نہیں چلے گا بلکہ دنیا کو "ادب خوردہ" دین بنا کر
زندگی کی گہرائیوں میں سے نصاب تعلیم کے لئے مواد فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ ماضی کی
فرسودہ روایات اور قدامت پرستی نے اس کھلی ہوئی حقیقت کو، اس بین انقلاب کو،

نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کی تیز اور نکتہ رس نگاہ نے اس کو بے نقاب دیکھا اور اسی کی روشنی میں انھوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو مرتب کیا۔ ان کی درسگاہ ایک معمل یا تجربہ گاہ ہے جہاں عوام، بالخصوص عام مسلمانوں، کے لئے صحیح اور اچھی تعلیم کا پیکر تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ چاہتے ہیں کہ اُستاد طالب علم اور منتظمین سب مل کر آزادی کی فضا میں تعلیم کے حقیقی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ ان بندشوں اور ذہنی پابندیوں سے آزاد ہوں جن میں ہندوستانی تعلیم نے گذشتہ سو سال سے نشو و نما پائی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ استاد کی نظر امتحان اور نتائج کی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ گئی ہے، طلبہ کا تخیل حصول ملازمت کے چکر سے باہر نہیں نکلتا اور منتظمین افسران محکمہ کو خوش رکھنا اور اُن سے مالی امداد حاصل کرنا اپنا مقصود اعلیٰ سمجھتے ہیں! ذاکر صاحب نے جامعہ کی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے پہلا بنیادی اصول یہ قائم کیا کہ اس کے لئے نہ حکومت کی امداد قبول کی نہ اس کا چارٹر، جس کی جلو میں مختلف قسم کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، حالانکہ کم سے کم گذشتہ چند سال میں اس کا برابر امکان رہا ہے کہ ان کو یہ چیزیں مل جاتیں اس انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے بقول شخصے "چوری کا کھٹکا" نہ رہا اور وہ علم کو علم کی خاطر اور تعلیم کو تعلیم کی خاطر حاصل کرنے کا مطلب سمجھنے لگے اور اُستادوں کو یہ موقع ملا کہ وہ تعلیم میں ان چیزوں پر زور دیں جو قومی سیرت کی تعمیر اور عوام کی زندگی کو بنانے میں مدد دے سکتی ہیں اسی طرح قومی تعلیم کے میدان میں جامعہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اسے ایک محدود اور روایتی تنگنائے سے نکال کر زندگی کے سمندر میں لا ڈالا تاکہ وہ ان تحریکوں سے متاثر ہو سکے جو زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہو کر اس کو نئے تقاضوں سے مالا مال کرتی رہتی ہیں۔

ذاکر صاحب کا ایک بنیادی اصول جو جامعہ کی تعلیم میں کارفرما ہے یہ ہے کہ تعلیم کے عمل میں فرد اور جماعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ذہن کو اپنی تربیت اور نمو کے

سے جو غذا حاصل ہوتی ہے وہ "جماعت کے تمدن اور اس کی مادی اور غیر مادی تحصیلات سے
تی ہے یعنی اس کے علم سے، اس کی زبان سے، اس کے ادب سے اس کی صنعت و
دست کاری سے، اس کے نظام اخلاق سے، اس کے رسم و رواج سے، اس کے سماجی
زندگی کے نمونوں سے، اس کے گاؤں، شہروں اور قصبوں کی تنظیمات سے، اس کی
موسیقی سے، اس کی مصوری سے، اس کی تعمیرات سے، اس کی دوکانوں سے، اس کے
کارخانوں سے، اس کی بڑی شخصیتوں کی زندگی کے نمونوں سے، غرض اس کی تمام رنگا رنگ
تخلیقات سے" لہذا "جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو
ان میں سوئی ہوئی توانیاں اس ذہن میں جاکر بیدار ہو جاتی ہیں اور اس کے لئے یہ دفینے
اپنے منھ کھول دیتے ہیں"! جو تعلیم ان تمدنی خزانوں سے بیگانہ اور ذہن اجتماعی کی ان
زندہ تخلیقات سے بے نیاز ہوگی اس میں نہ حقیقت کا جلوہ دکھائی دے گا نہ زندگی کا
شیرازہ وہ موجودہ ہندوستانی تعلیم کی طرح بالکل سطحی اور رسمی ہوکر رہ جائے گی۔ ہندوستان
کی تعلیمی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے ملک کی
متنوع تہذیب کے سرچشموں سے کام نہیں لیا گیا بلکہ مغرب کی سطحی تقلید کی کوشش کی
گئی جس کی وجہ سے قوم کے تخلیقی سوتے خشک ہوکر رہ گئے اور تعلیم سوائے دفتری کاروبار
سکھانے کے کچھ نہ کر سکی اور قومی زندگی کا دھارا اس سے متاثر نہ ہو سکا۔ ذاکر صاحب نے
اپنے خطبات میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کو جماعتی تہذیب و تمدن اور اس کے
مادی اور غیر مادی مظاہر کے خزینوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ساتھ ہی ذاکر صاحب کو
اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہے کہ افراد کی ذہنی، جمالی اور عملی صلاحیتیں بہت مختلف ہوتی
ہیں اس لئے مختلف ذہنوں کو ایک ہی غذا راس نہیں آسکتی ہر ذہن کو "وہی چیز بھاتی ہے
جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت سے مطابق ہو" اس حقیقت کو بھولنا،
بقول ان کے، ایسا ہے جیسے "اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت

دینے کی کوشش کی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بہت سی جدید تحریکیں جنہوں نے مغربی ملکوں کی تعلیم میں جان ڈال دی ہے اسی اصول کی تفسیر ہیں اور ہندوستان میں ثانوی تعلیم کی تعمیر نو کے لئے جو اسکیم بنائی گئی ہے اس میں بھی اس اصول کو صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

جامعہ کی ایک تعلیمی خصوصیت یہ ہے کہ ذاکر صاحب کی سرکردگی میں اس نے تعلیم میں ہاتھ کے کام کی صحیح اہمیت کو پہچانا ہے اور اس پر عمل کیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں علم و عمل، کتاب اور فعالیت کی یہ جنگ عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہے لیکن ہندوستان میں جو ہمیشہ روایتی علم کا پجاری رہا ہے، جہاں ہاتھ کے کام کو اکثر ذلیل سمجھا گیا ہے جہاں ذات پات کی مقدس تقسیم اسی بنا پر کی گئی ہے، ابھی تک تعلیم کتاب اور الفاظ کے گورکھ دھندے میں گرفتا ہے اور بچوں کو ایک ایسے ناقص اور نامکمل نصاب کی پابندی کرنی ہوتی ہے جس میں نسل انسانی کے بعض نہایت اہم اور بیش قیمت تجربات کے لئے گنجائش ہی نہیں! ذاکر صاحب نے پہلے جامعہ کی تعلیم میں اور اس کے بعد بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم کے ذریعے یہ انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا کہ جو تعلیم ہاتھ کے کام کو اس کا صحیح درجہ نہیں دیتی اور اس کو انسانی تربیت کا ذریعہ نہیں بناتی وہ سراسر ناقص ہے۔ اس خیال کی وضاحت، اور علم اور تجربے کے رشتے کی تفسیر جس انداز سے ذاکر صاحب نے کی ہے اس کا مطالعہ نہ صرف تعلیمی بصیرت پیدا کرتا ہے بلکہ ادبی لطف اندوزی کا سرمایہ بھی ہے۔ سنئیے :۔

" ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جس کے لئے دوسرے کام کرتے ہیں، ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے خبر کی حیثیت سے۔ ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ جزو ذہن بنتی، ذہن کو روشن کرتی۔ اس میں نظر پیدا کرتی ہے...... روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے، نہ روح کو بالیدگی۔ اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لئے اِک خوش نما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا، آواز بہت دیتا ہے

مگر مدرسے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار ذہن کو تربیت دیتا ہے، روح کی پرورش کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے ...... جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے اس کی تعلیم گاہوں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا کہاں کی دانش مندی ہے۔ سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی وقت ممکن ہے جب یہ مدرسے گنتی کے چند خود غرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سواد اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں۔"

جامعہ کے نزدیک یہ کافی نہیں کہ افراد کی صلاحیتوں کی پوری نشوونما کی جائے اور اس کے بعد انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس طرف وہ چاہیں اُدھر کا رخ کریں، اور ان کی سعی وعمل کی کوئی منزل معین نہ ہو۔ دراصل صحیح مقصد کا تعین ہی انسان کی صلاحیتوں اور ہنرمندیوں کو فرد اور سماج دونوں کے لئے برکت کا باعث بناتا ہے۔ ورنہ محض ذہانت اور چالاکی کا اظہار سٹے بازی میں بھی ہوسکتا ہے۔ اور سائنس کے کمالات جس زور شور سے جنگ کی غارت گری میں دکھائے جاتے ہیں ان کی نظیر کسی امن کے شغل میں نہیں ملتی اگر یہ صلاحیتیں نسل انسانی کی خدمت کے لئے وقف نہ ہوں تو برکت نہیں لعنت ہیں!

خدمت کے نصب العین پر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو اس قدر اصرار کیوں ہے؟ نہ صرف اس لئے کہ اخلاقی زندگی کی عمارت اسی صالح بنیاد پر قائم ہوسکتی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ انھیں اپنے ملک کی بے شمار محرومیوں اور بدنصیبیوں کا اس کے جہل اور افلاس کا، اس کی بیماری اور بیکاری کا اور اس کی اور تمام بپتاؤں کا نہایت شدید اور گہرا احساس ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس عبرت ناک حال سے اس حیات بخش مستقبل تک پہنچنے کے لئے جس کی تصویر ان کے نہاں خانۂ دل میں کھچی ہوئی ہے، صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ اس

حال اور مستقبل کے درمیان خدمت کا ایک پل بنا دیا جائے۔ جب تک تعلیم یافتہ نوجوان ان تمام خرابیوں کے خلاف جہاد نہیں کریں گے اور قومی زندگی کو اس صدیوں کی غلاظت سے پاک نہ کریں گے، اس میں صفائی اور فراخی اور شرافت پیدا نہ ہو سکے گی۔ جو شخص باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اس جہاد سے جی چراتا ہے، جو شخص سماج سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن اس کی خدمت نہیں کرتا، جو شخص لینے کے لئے ہر وقت تیار ہے لیکن دینے کو آمادہ نہیں وہ نگاہ حقیقت شناس میں ذلیل ترین سماجی مجرم ہے۔ یہ امتحان جماعتوں اور افراد دونوں کے لئے ایک اٹل کسوٹی ہے، ایک پل صراط ہے جس پر لغزش ہوئی اور انسان دوزخ کی گہرائیوں میں پہنچا۔

ذاکر صاحب جامعہ ملیہ کو قومی تعلیم کے لئے ایک نمونے کی درس گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ جہاں ایک سازگار ماحول میں مختلف قسم کے تعلیمی تجربے کئے جائیں اور ان کی روشنی میں قومی تعلیم کے اصول اور مقاصد اور اس کے نصاب اور منہاج کا تعین کیا جائے۔ اسی وجہ سے جامعہ کی توسیع کی جو اسکیم اس وقت ان کے پیش نظر ہے اس میں مختلف درجے کی درس گاہوں کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ مثلاً ایک چھوٹے بچوں کا اسکول، ایک مثالی بنیادی مدرسہ، ایک ثانوی مدرسہ جس میں مختلف نوع کا تعلیمی نصاب رائج کیا جائے، ایک ٹکنکل اسکول، ایک کالج، ایک تصنیف و تالیف کا ادارہ، چند تحقیقاتی ادارے جس میں تحقیق کرنے والے علماء ملک کی تہذیب کے مختلف عناصر کا مطالعہ کر سکیں۔ ملک میں توسیع تعلیم کے سلسلے میں مختلف قسم کے ہزاروں ادارے قائم ہوں گے لیکن ان سب میں تجربے کرنے کی گنجائش اور صلاحیت نہ ہوگی۔ اس لئے ذاکر صاحب کی آرزو ہے کہ جامعہ ایک ایسا مرکزی قومی ادارہ بنایا جائے جو اپنے تعلیمی تجربوں کے نتائج سے تعلیمی کارکنوں کو اسلوب مناسب واقف کرتا رہے اور اس طرح ملک کی تعلیمی خدمت اور قیادت کر سکے۔

یہ تو ہوا جامعہ کا تعلیمی نصب العین اور پروگرام۔ لیکن جب تک کسی تعلیمی نصب العین

کو قوم اور ملت کے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی نصب العین کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے اس وقت تک اس میں معنویت اثر اور گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس بحث کے ساتھ ساتھ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل جامعہ کے ذہن میں مسلمانوں کی سیاست کا کیا تصور ہے اور وہ ہندوستان میں ان کے لئے کس مقام کی توقع رکھتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کو اس تہذیب و تمدن سے گہری اور سچی محبت ہے جو ہندوستان میں اسلام کے حیات بخش اثر سے پیدا ہوا ہے اور ان کے دل میں اس فلسفۂ حیات کا، اس ادب اور فلسفے کا، اس معاشرتی نظام کا زبردست احترام ہے جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں اس تہذیب و تمدن اور اس معاشرت اور فلسفے کے اصولوں اور قدروں کو پرکھنے اور ان کی مبصرانہ تفسیر کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے، جو ایک نادر چیز ہے۔ وہ ایک صاحب نظر مفکر کی طرح لفظوں کی سطح سے نیچے اتر کر معنی کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے اسلامی تصور حیات میں جہاں ایک سچے اور راسخ مسلمان کا عقیدہ جھلکتا ہے وہاں اس میں عصر حاضر کی تحریکوں اور تقاضوں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت بھی ہے۔ عقیدہ ان کو بتاتا ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول چودھویں صدی ہجری میں بھی ایسے ہی سچے اور قابل عمل ہیں جیسے وہ پہلی صدی میں تھے لیکن عقل اور تجربہ اور حالات حاضرہ کا گہرا مطالعہ انھیں یہ بھی بتاتا ہے کہ چودھویں صدی میں ان اصولوں کا اطلاق اور ان کی تفسیر چودھویں صدی کے مسائل اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہئے۔ اسی وجہ سے سیاسی، معاشرتی، اور اقتصادی مسائل میں وہ "ترقی پسند" ہیں لیکن یہ وہ "ترقی پسندی" نہیں جو مستقبل کی بے صبری میں ماضی کے سرمائے کو ٹھکرا دیتی ہے۔ یہ تو جرأت کے ساتھ ماضی اور حال دونوں کا محاسبہ کرتی ہے اور اپنی تمدنی میراث کے بہترین عناصر کو لے کر ان سے مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اسی راہ "وسط" کو اختیار کرنے کی وجہ سے، جو بالعموم دو انتہائی راستوں کے بیچ کا راستہ

ہوتا ہے، جامعہ کو کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ وابستہ کرنا مشکل ہے۔

جامعہ کا سیاسی عقیدہ (اگر اسے سیاسی عقیدہ کہا جا سکتا ہے) یہ ہے کہ قوم کی ترقی کے لئے اس کی تمام جماعتوں کو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی مکمل نشوونما کا موقع ملنا چاہیئے کیونکہ انھیں کی ہم آہنگ تربیت میں قومی فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔ ہندوستانی تہذیب ایک مشترک کارنامہ ہے۔ اس کی نشوونما میں مختلف جماعتیں اور قومیں اور مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ شریک ہیں۔ اس اجتماعی کارنامے میں، جو ایک ہزار برس کے میل جول کا نتیجہ ہے، مسلمانوں نے بہت نمایاں اور قابل قدر حصہ لیا ہے اور ذاکر صاحب چاہتے ہیں کہ وہ اس مشترک ورثے کو قائم رکھنے اور اس کو مالا مال کرنے کے لئے پوری کوشش کریں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے یہ پوزیشن ہرگز شایان شان نہیں کہ وہ اپنی گذشتہ تاریخ اور روایات سے بے تعلقی اختیار کرلیں اور جس ملک میں انھیں جینا اور مرنا ہے اس کی سماجی اور سیاسی خدمت میں پیش پیش نہ رہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں ظلم ہے، بے انصافی ہے، جہالت ہے، توہمات ہیں، انسانوں میں نسل و رنگ کا امتیاز رائج ہے اس کو دور کرنا مسلمان کا مذہبی اور ملی فریضہ ہے۔ خدمت اس کی سب سے بڑی سعادت ہے اور اس خدمت میں ہندو اور مسلمان، سفید و سیاہ، مشرق و مغرب کی تمیز کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس لئے جامعہ کی تعلیم کا مقصد اعلیٰ بنی نوع انسان کی خدمت کو قرار دیا گیا ہے۔ اگر جامعہ کے صدر دروازے پر کوئی موزوں اور حسب حال شعر لگانا مقصود ہو تو میرے خیال میں اس کے نصب العین کی بہترین توضیح اقبال کے اس شعر سے ہوتی ہے:

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر

ذاکر صاحب کی گہری آرزو ہے کہ مسلمان ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں ایک نمایاں اور قابل فخر حصہ لیں اور اس مقصد کے لئے اپنے مذہب اور اپنی تہذیب اور تمدن کے

بہترین عناصر کو نہ صرف اپنی قومی خودی میں جذب کریں بلکہ ان کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کو بھی مالا مال کریں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اپنی حالت آج کمزور اور سقیم سہی لیکن اسلام کا کیسہ اخلاق اور عمل کے بے نظیر جواہر سے پر ہے جن کی اس دنیا کو، جو ظلم و جور سے بھر گئی ہے، بے حد ضرورت ہے۔ یوں تو ہر جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنی رہنمائی سے دنیا کو منور کرے لیکن مسلمان کو، جو دنیا میں حق کا مبلغ بن کر آیا ہے اور اپنی روشنی کا اس درجہ احترام کرتا ہے کسی طرح یہ حق نہیں کہ وہ اس کو تہِ دامن چھپا کر رکھے۔ اسی لئے وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک عزت کا مرتبہ چاہتے ہیں جس کو خدمت ایثار اور انسانیت کے اصولوں پر عمل کر کے حاصل کیا گیا ہو۔ مگر ذاکر صاحب کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ نہ صرف تمام مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی انصاف اور انسانیت کی اس جنگ میں کھلے دل سے حصہ لیں جو ہر ملک اور ہر قوم میں مختلف شکلوں اور مختلف انداز میں ہو رہی ہے۔ وہ تنگ نظر قومیت، مذہبی ناروا داری، نسلی تعصب، جغرافی حد بندیوں غرض ان تمام چیزوں سے بیزار ہیں جو انسان کو انسان سے جدا کر کے ان کی وحدت کو پاش پاش کرتی ہیں۔ افراد اور جماعتوں کا باہمی فرق ایک اچھی چیز ہے کیونکہ دنیا کی گوناگونی انھیں اختلافات سے عبارت ہے لیکن جب یہ اختلاف مخالفت اور تعصب میں تبدیل ہو جائے تو فتنہ کا باعث بن جاتا ہے۔ جو قتل سے بھی بدتر ہے! اس لئے رواداری اور انصاف کی تلقین صحیح تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے۔ ذاکر صاحب ہی کے الفاظ میں اس فرض کی پرجوش تفسیر کیوں نہ سنئے جو قدرت نے مسلمان کو سونپا ہے۔

"اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں، اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مامور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقوے کی شرافت کا

قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں؛ تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے۔ ... چنانچہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے اردگرد ان کے اپنے گھر میں غلامی رہیگی اور افلاس، اور فلاکت رہے گی اور جہل، بیماریاں رہیں گی اور بدکرداریاں پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں، یہ چین کی نیند نہ سوئیں گے اور پھر اپنے بس بھران کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے۔ یہ روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے، پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین کی اور اپنے وطن کی خدمت ہوگی، جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی۔ یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی (کہ کبھی دنیا اسے جنت نشان کہتی تھی پر آج وہ بے شمار انسانوں کے لئے دوزخ سے کم نہیں) سیوا کریں گے اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمٰن و رحیم، رزاق و کریم، حی و قیوم، خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ انھیں میں سے بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے، بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ ان کا وجود محدود نگاہوں کو اس کی شان ربوبیت پر ایک دھبہ سا معلوم ہوتا ہے۔"

ان الفاظ میں جامعہ کے بلند نصب العین کی کیسی دل کش تصویر نظر آتی ہے! اس لئے ایک طرف تو ذاکر صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف جماعتیں اپنی مخصوص انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک مؤثر روادارا در فراخ دل قومیت کی بنیا د ڈالیں اور

اپنے مخصوص تمدنی ورثے اور صلاحیتوں سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو فروغ بخشیں۔ چنانچہ انھوں نے جامعہ میں بیک وقت قومیت اور اسلامیت کی قدروں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ بے شک غلط قومیت اور اسلام، ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ لیکن سچی قومیت میں، جو وطن کی محبت اور اس کی خدمت کو ایمان کا جزو سمجھتی ہے اور مذہب کی حقیقی روح میں کوئی بنیادی تناقض نہیں۔ اس حقیقت کی شہادت جامعہ کی ساری زندگی اور تنظیم سے اور خود شیخ الجامعہ اور ان کے رفیقوں کی ذاتی مثال سے ملتی ہے۔ انھوں نے عمل سے اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے کہ بیک وقت ایک اچھا مسلمان اور اچھا ہندوستانی ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ دونوں چیزیں در اصل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جو شخص واقعتاً ایک اچھا مسلمان ہوگا وہ یقیناً ایسی صفات کا حامل ہوگا جو ایک اچھے شہری کے لئے ضروری ہیں۔ وہ غلط اور تنگ نظر قومیت کے لئے اپنے مذہب کا سودا کرے گا، نہ مذہب کو اپنی تنگ نظری اور ناروا داری کی آڑ بنا کر تاریخی ارتقا کے سلسلے میں حارج ہوگا۔ لیکن جہاں ذاکر صاحب ایک طرف اس بات کے مخالف ہیں کہ مسلمان خود کو قومی زندگی کے دھارے سے علیحدہ کر لیں وہاں وہ اسی قدر سختی اور خلوص کے ساتھ اس اندھی تحریک پر بھی احتساب اور تنقید کرتے ہیں جو ہندوستان کی زندگی اور تہذیب میں سے ان قابل قدر عناصر کو نکال دینا چاہتی ہے جو مسلمانوں نے گذشتہ آٹھ دس صدیوں میں ہندوستان کو بخشے ہیں اور انھوں نے اس خیال کو بھی ہر موقع پر نہایت صفائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چنانچہ کاشی ودیا پیٹھ کے جلسہ تقسیم اسناد میں انھوں نے ایک غیر مسلم مجمع کو مسلمانوں کا نقطۂ نظر ان واضح اور بے باک لیکن دل نشیں الفاظ میں سمجھایا تھا۔

> آپ سب مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے

اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان کے ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی، اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما گلستان میسر داگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لئے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کئے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندوستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارہ نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے۔ ہندوستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو۔ بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے، ان کے لئے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔"

ساتھ ہی ان کی انصاف پسندی اور بلند نظری مسلمانوں کو ان کے فرض کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلاتی ہے۔

"ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لئے بنائے ہیں۔ ان کو دیکھئے ہم کن معنوں میں انھیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں؟ کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے۔ جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے۔ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں اور ہزار بار نہیں! . . . ایک ایسی دنیا جو نسل، وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے، پھر ہم سے اسی حقیقی عدل و مساوات کی فرماں روائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لئے بے تاب ہے جو ایک نبی امی نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملت اسلامی اس تقدیر، اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی؟ . . . . . ایک بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خوددار اور آزاد جماعت کی طرح زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پچھتر سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا، پچھلی مساعی کی تہ میں جو نصب العین کارفرما تھا۔ اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی"

یہ نظر ثانی، یہ تنقید، جو انسان کو ماضی پرستی اور روایات کہنہ کی غلامی سے بچاتی ہے ہر بیدار مغز مفکر کا فرض ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر تعلیمی مفکر جزئیات اور غیر اہم مقاصد کے چکر میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ نہ بنیادی چیزوں کی طرف توجہ کر سکتے ہیں، نہ ان میں غالباً اس کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے۔ بیسویں صدی میں کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں میں شاید ذاکر صاحب ہی ایک ایسے تعلیمی مفکر ہیں جنھوں نے اس "فرض کفایہ" کو ادا کیا ہے۔ زمانہ کی ناسازگاری کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ ضرور ہے کہ اس وقت ان کی آواز

صدا ہمیشہ ثابت ہو لیکن ایک اچھے درخت کی طرح سچی بات میں بھی یہ صفت ہے کہ وہ آہستہ
آہستہ شور زمین سے سر نکالتی ہے اور کبھی نہ کبھی اپنا اثر پیدا کر کے دم لیتی ہے۔ لہٰذا
اس بات کی طرف سے ذاکر صاحب کو اطمینان ہے کہ حق کا بول بالا ہو کر رہے گا۔ لیکن
باوجود اس کے بتقاضائے انسانیت کبھی کبھی انھیں اور ان کے ساتھیوں کو اس بات سے
بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ملک کی سیاسی مخالفتیں اور چپقلش اُس تعلیمی اور تہذیبی کام کو اچھی طرح
بارآور نہیں ہونے دیتیں جو وہ اور ان کے ساتھی اس قدر صبر اور ایثار کے ساتھ سالہا
سال سے کرتے آئے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ تعلیم کا اصلی مقصد شریف، سچے اور دلیر افراد پیدا کرنا ہے جو بنی نوع
انسان کی خدمت کے لئے سربکف ہوں، اگر ایک اچھے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تہذیب
و تمدن اپنے مذہب اور فلسفے، اپنے ادب اور آرٹ کے خزانوں سے انسانی تہذیب کے
کیسے کو مالا مال کرے، اگر ایک اچھے ہندوستانی ہونے کا یہ مفہوم ہے کہ وہ ایک روادار
اور فراخ دل اور سچے معنے میں مہذب انسان ہو، اگر تعصب، تنگ نظری اور خود غرضی
افراد اور جماعتوں دونوں کے لئے بری ہیں، اگر حق کی حمایت انسان کا فرض ہے خواہ
اس میں اپنوں کا ساتھ چھوڑنا پڑے، اگر باطل سے جنگ کرنا ضروری ہی خواہ سارا زمانہ
اسی کی تائید کرتا ہو، اگر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنا اور غیروں کا احتساب سختی اور
غیر جانبداری سے کرے اور حق کے معاملے میں اس کے سامنے نہ اپنا اپنا ہو، نہ غیر غیر، اگر یہ
سب باتیں صحیح ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ تعلیم کے ذریعے ذاکر صاحب جن قدروں کی اشاعت
کرنا چاہتے ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے لئے بلکہ عالم انسانیت کے لئے قابل احترام ہیں
اور ذاکر صاحب اور ان کی جامعہ کا شمار ان تخلیقی اثرات میں ہونا چاہیئے جو ہماری تعلیم اور ہماری نئی نسل
کو ایک بہتر سانچے میں ڈھال رہے ہیں، اس خاموشی اور متانت اور خوش دلی کے ساتھ جس طرح سورج
کی روشنی مٹی کی تاریکی میں بیج کو پالتی ہے اور بارش کا پانی نازک پودوں کو پروان چڑھاتا ہے اور انھیں
تازگی اور توانائی بخشتا ہے!

خواجہ غلام السیدین۔

جامعہ کی ادبی خدمات

جامعہ کی تحریک ایک تعلیمی اور تہذیبی تحریک ہے، اس کے سامنے زندگی کا ایک خاص تصور اور تعلیم و تہذیب کا ایک خاص معیار ہے، جامعہ کی بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ہاتھوں رکھی گئی، اس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی تھے۔ یہ اُسی زمانہ کی یادگار ہے جب سارے ہندوستان نے پہلی دفعہ آزادی کا گیت گایا تھا اور اسی گیت کے نشے کے ساتھ مستیٔ کردار کا بھی ثبوت دیا تھا۔ جامعہ آزاد تعلیم، قومی تعلیم، اور مقصدی تعلیم کی علمبردار ہے۔ جامعہ شروع سے ایک طرف روایت پرستی سے اور دوسری طرف مغرب کی اندھی تقلید سے آزاد ہے۔ جامعہ نے شروع سے نئی تعلیم یافتہ نسل اور قدیم علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہا اور ایک نئی مشرقیت کو رواج دیا۔ جامعہ محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں رہی۔ ایک تہذیبی گہوارہ بھی بنی۔ اُس نے گذشتہ پچیس ۲۵ سال میں لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ اس مقبولیت میں اُس کے تعلیمی، تہذیبی اور سماجی نقطۂ نظر کا بہت بڑا حصہ ہے۔

یہ مقبولیت بغیر ایک اچھے ادبی تصور اور ایک معتدبہ ادبی سرمائے کے حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ حسنِ خیال کو حسنِ عمل بننے سے پہلے حسن کاری بھی کرنی پڑتی ہے۔ تصور کو زندگی بننے سے پہلے ادب بننا پڑتا ہے، تب جاکر وہ رگ و پے میں سرایت کرسکتا ہے،

ہر برگزیدہ تحریک ایک برگزیدہ ادبی سرمائے کے سہارے چلتی ہے۔ پہلے ادب کو ایک سہارے کی ضرورت ہوتی تھی، اب دوسری چیزوں کے فروغ کے لئے ادب کا سہارا ضروری ہے۔ یہاں میرا مطلب پروپگنڈے سے نہیں۔ پروپگنڈا ادب نہیں ہے پروپگنڈا وقتی اور عارضی چیزوں کی خاطر ابدیت کو قربان کر دیتا ہے۔ پروپگنڈا سطحی ہوتا ہے اور اس کا مقصد کاروباری۔ اس لئے اُس کی عمر بھی زیادہ نہیں۔ ادب گہرائی رکھتا ہے۔ وہ وقتی مقاصد کے بجائے زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور بلند خیالات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ وقتی حالات کی پیداوار ہوتا ہے مگر خود وقتی نہیں ہوتا۔ اسی لئے ہر پروپگنڈا ادب نہیں بن سکتا، نہ ہر تحریک ایک ادبی برادری کو ساتھ لے سکتی ہے۔ ادبی برادری اور ادبی سرمائے کے لئے ستاروں کی دنیا اور خاکِ راہ کے حسن، دونوں سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ ادبی تحریک بڑی شخصیتوں کے خونِ جگر اور بڑے خیالات کی ایندھن سے بنتی ہے۔ جامعہ کو خوش قسمتی سے یہ دونوں چیزیں میسر آئیں اسی وجہ سے اِس کے ادبی کارنامے قابلِ قدر اور اس کا ادبی معیار لائقِ تقلید ہے۔

جامعہ کو اچھی خاصی ادبی شخصیتیں میسر آئیں۔ مولانا محمد علی، جو سفر میں جاتے تو قرآن شریف کے ساتھ دیوانِ داغ بھی رکھ لیتے، جو طویل مضامین اس لئے لکھتے تھے کہ انھیں مختصر لکھنے کی فرصت نہ تھی، جن کے خلوص، ذہانت، گہرائی، حاضر جوابی کے دشمن بھی قائل تھے، جن کی لیڈری ادبیت کبھی ختم نہ کر سکی، جن کے قلم میں تلوار کی سی تیزی اور بے پھری تھی اور جن کی شخصیت میں حسینوں کے تبسم کی سی دل آویزی ——
ذاکر حسین، جن کی طبیعت بقول ایک صاحب کے افلاطونی ہے اور جن کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ رنگ، جن کے یہاں آئینے کی طرح روشن فکر کے باوجود جذبات کی آنچ ہے، جن کے عمل نے فکر کی بلندی کو اور جن کے فکر نے عمل کے گوشوں کو ہم آہنگ رکھا ہے، جو خواب بھی دیکھتا ہے اور انھیں حقیقت بھی بنانے میں لگا رہتا ہے، جو کبھی اپنی بڑائی

کو ظاہر نہیں کرتا، مگر دوسرے میں جو گہرائی چھپی ہوئی ہے اُسے ظاہر کر دیتا ہے ــــــ عابد حسین، جن کی تصانیف میں بہتے پانی کی سی روانی ہے، جن کا ذہن مرتب ہے اور جن کا خیال واضح، جو ترجمہ نہیں کرتا، تخلیق کرتا ہے، جس کی علمیت نے ادبیت کا اور جس کے فلسفیانہ مزاج نے شگفتگی اور رنگینی کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا ــــ اور مجیب، جس کا ذہن مغربی ہے اور مزاج مشرقی، جو سیاست، تاریخ اور واقعہ نگاری کو ادب بنا دیتا ہے، اور جس نے سادگی کو گہرائی اور گہرائی کو حسن بنا کر پیش کیا ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ جامعہ کی فضا میں خالدہ خانم، رؤف بے، اقبال، ابوالکلام آزاد اور عبیداللہ سندھی نے ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ علمی خطبات، سیاسی مقالوں، اور توسیعی لکچروں کے ذریعہ سے اُس نے مغرب اور مشرق قریب کے ذہنی افکار کی دولت کو ہندوستان میں عام کر دیا ہے، جس کی وجہ سے یہاں ایک نمایاں سنجیدگی، تازگی اور زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں ایک خاص علمی ماحول ہے جس کا اعتراف اکرام نے "موجِ کوثر"[1] میں اور اسمتھ نے "ہندوستان میں جدید اسلام"[2] میں کیا ہے۔

یہ علمی ماحول "سرکاری" اور "بازاری"[3] دونوں اثرات سے آزاد رہا ہے۔ یہ مشرقی ہونے کے باوجود، مغرب سے متاثر ہے۔ یہ اسلامی ہونے کے باوجود ہندو مسلم تہذیب کا قدردان ہے۔ اور ہندوستانی ہونے کے باوجود ترکی، مصری، چینی، روسی اثرات کا معترف۔ ان چیزوں کی وجہ سے یہاں ایک غیر معمولی زرخیز زمین تیار ہو گئی ہے۔ اس زرخیزی کا اثر کتابوں کی تعداد اور معیار دونوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] ۔ مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ۔ شیخ محمد اکرام، آئی، سی، ایس۔

[2] ۔

[3] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے (اکبر)

برنارڈ شا نے لکھا ہے کہ خالی جیب، بڑا اچھا ادب پیدا کرتی ہے۔ بات مضحکہ خیز انداز میں کہی گئی ہے مگر غلط نہیں ہے۔ رومیں رولاں کا خیال ہے کہ بڑا ادب، انسان کی تکلیف کا پیداوار ہے۔ جامعہ کے خواب کو حقیقت بنانے میں جو تکلیفیں، دشواریاں، آزمائشیں اور مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں، جو مشکل مقام آئے ہیں اور نازک لمحے گذرے ہیں، عام بے حسی، اور بے پروائی سے جو لڑائیاں لڑنی پڑی ہیں، اُن کی وجہ یہاں ایک صلابت، ایک آہنی عزم، ایک مقدس حرارت، پیدا ہوگئی ہے، اُس نے بھی ادبی کارناموں کی تخلیق میں مدد دی ہے

اور سب سے بڑھ کر اس کے اعلیٰ نصب العین، ایک آزاد فضا میں آزاد زندگی بنانے کی خواہش، چمن میں رہ کر، چمن کے خس و خاشاک سے دامن پاک رکھنے کے جذبے اور علمی اور تعلیمی کام کو ایک ناخوشگوار فرض سمجھنے کے بجائے، ایک عبادت اور ریاضت سمجھنے کے خیال نے، فکر کو روشنی اور قلب کو وسعت عطا کی ہے۔ بچوں کی تعلیم پر زور دینے سے اسے بنیادی مسائل کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہے، نوجوانوں سے تعلق نے اسے ...... تازہ خون دیا ہے۔ اس طرح یہاں ایک ایسا ادبی ماحول تیار ہوگیا ہے جسے قابلِ رشک کہہ سکتے ہیں۔

جامعہ کے ادبی کارناموں میں سب سے زیادہ قابلِ قدر بچوں کا ادب ہے۔ جامعہ نے بچوں کی صحیح تربیت اور تعلیم پر جو توجہ کی ہے اس کا لازمی نتیجہ بچوں کے ادب کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ بچوں کے لئے چیزیں اس سے پہلے بھی لکھی گئی تھیں۔ حالی، اسمٰعیل، عنایت اللہ اور دارالاشاعت لاہور کا کام کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں حالی اور اسمٰعیل نے افادیت پر اور دارالاشاعت لاہور والوں نے تفریحی ادب پر زیادہ زور دیا تھا۔ بچوں کی نفسیات کے مطالعے کے بعد، کہانیوں، ڈراموں، علمی مضامین، تصویروں، رسالوں، نظموں کا ایک بڑا ذخیرہ صاف ستھرے طریقہ سے جامعہ نے

پیش کرکے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ مرغی اجیر جلی، پوری جو کڑھائی سے نو بھاگی، بجلی کی کہانی، سونے کی چڑیا، مرغ آباد کا ڈراما، بچوں کی نظمیں اور شفیع الدین نیر کے مجموعے، وغیرہ بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہیں اور ان میں اچھی صلاحیتوں کو بھی ابھارتے ہیں۔ پیامِ تعلیم نے محض بچوں کے متعلق ادب فراہم نہیں کیا، بچوں کا ادب بھی فراہم کیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس تحریک کا اثر عام ہے اور آج ملک میں جگہ جگہ سے بچوں کے لئے دلچسپ قصے، تصویروں کے رسالے اور دنیا کے حالات کے متعلق کتابچے شائع کئے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بچوں کے لئے آسان زبان میں لکھنا کافی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ آسان زبان کو بچے پھیکا اور بے نمک جانتے ہیں، انھیں چٹخارے کی بڑی ضرورت ہے، وہ محاوروں اور استعاروں سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ تخیل سے خوب کام لے سکتے ہیں، بشرطیکہ اُن کے لئے وہ فضا پیدا کر دی جائے۔ اب ضرورت ہے کہ چھوٹے بچوں کے علاوہ، بڑے بچوں اور چودہ، پندرہ سال کے لڑکوں کے لئے اچھا اور معیاری ادب پیدا کیا جائے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ وہ پیامِ تعلیم اور تہذیبِ نسواں کی دنیا کے بعد فوراً ساقی اور ادبِ لطیف کی فضا میں پہونچ جاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

جامعہ کا دوسرا بڑا کارنامہ اردو میں اچھے ترجموں کی کمی کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام سب سے پہلے باقاعدہ طور پر انجمن ترقی اردو نے شروع کیا اور اُس کا احسان اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا مگر جامعہ نے ان ترجموں میں اور بھی تنوع ملحوظ رکھا ہے اور اس طرح ادبی نقطۂ نظر سے، یہ خدمت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین کے بعض ترجمے کلاسیکل حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ترجمہ کرنا محض مکھی پر مکھی مارنا نہیں ہے، نہ ایک زبان کے الفاظ کا دوسری زبان میں منتقل کر دینا ہے۔ یہ ان خیالات کو ایک نیا لباس، ایک نیا قالب دینا ہے۔ یہ ایک ملک کے

پودوں کو دوسری زمین میں لگانا اور سرسبز کرنا ہے۔ اس کے لئے دونوں زبانوں پر قدرت ضروری ہے، اور ایک اچھا ادبی شعور۔ فاؤسٹ اور افلاطون کی ریاست محض ترجمے نہیں ہیں مستقل کارنامے ہیں۔ جامعہ کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اُس کے ذریعہ سے روسو، اسٹوارٹ مل، برٹرینڈ رسل، اشپرانگر، خالدہ خانم، میکیاولی، جمیس جینس، مہاتما گاندھی، جواہر لال اور دوسرے مفکرین، اور مصنفین کے افکار اردو میں آگئے۔ علمی معیار اور علمی سرمائے دونوں سے ادب اور اُس کے معیار پر بہت خوشگوار اثر ہوتا ہے اور ہر ادب محض افسانوں کی پیداوار سے نہیں، اپنے علمی شہ پاروں سے پہچانا جاتا ہے جامعہ کے ترجمے نہ تو محض خلاصہ ہیں نہ دار الترجمہ حیدر آباد کی طرح درسی کتابیں، نہ ادب لطیف کے شہ پاروں کی طرح آزاد ترجمے۔ ان میں زبان، فن اور ادب تینوں کا حق ادا کیا گیا ہے

جامعہ نے تعلیمی اور تہذیبی ادب پیدا کیا ہے۔ اردو میں ہربرٹ اسپنسر کی کتاب کے ترجمے اور بعض رسالوں کے علاوہ تعلیمی ادب نہ ہونے کے برابر تھا۔ رسالہ جامعہ نے قومی تعلیم پر مضامین کے ذریعے اور مکتبہ جامعہ نے بعض ماہرینِ تعلیم کے متعلق، کتابیں شائع کر کے اس کمی کو بھی پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی خطبات اِس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں ہماری قومی تعلیم کے اصول ایک ایسے انداز میں بیان کئے گئے ہیں جو دل نشین، پُر اثر، اور واضح ہے۔ سیاسی مقالوں اور اجتماعی علوم پر رسالوں کے ذریعہ سے بین الاقوامی سیاست، اور قومی سیاست کے مختلف گوشوں پر توجہ کی گئی ہے۔ یہ رسالے عوام کے لئے لکھے گئے ہیں، اس لئے عام فہم ہیں۔ دو کتابوں کا میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک پروفیسر محمد مجیب کی دنیا کی کہانی ہے جس میں حیرت انگیز جامعیت کے ساتھ دنیا کی تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔ چینی تہذیب، قدیم ہندوستانی تہذیب، اور اسلامی

تہذیب پر جو ابواب ہیں اُن میں باوجود اختصار کے تمام ضروری باتیں آگئی ہیں اور اس طرح آگئی ہیں کہ کتاب محض انسانیت کی تاریخ ہی نہیں ادب کا ایک صحیفہ بھی بن گئی ہے۔ دوسری کتاب ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے اور جس میں ترکی قوم کی خصوصیات، اس کی تاریخ، سیاست، اور ادب پر جامع اور پُر مغز مقالے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اردو میں جو بڑے ادارے ہیں انھوں نے اپنے لئے علمی کام تقسیم کر لئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو، بیشتر ادبی کتابیں کلاسکس اور خالص علمی کتابیں شائع کرتی ہے۔ دار المصنفین اعظم گڈھ نے اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب پر گراں قدر کام کیا ہے مگر مغربی خزانوں اور مغربی تحقیق و تدقیق تک ان کی رسائی زیادہ نہیں ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے بھی اسلامی علوم پر اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ مگر جامعہ نے تعلیمی، سیاسی، اور تہذیبی اصولوں پر نظریاتی مواد فراہم کر کے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے ہندوستان واپس آکر اسلامی علوم پر تحقیق کے لئے بیت الحکمت کے نام سے جو ادارہ جاری کیا اُس کے لئے جامعہ کا انتخاب یونہی نہیں تھا۔ اس جگہ ایک آفاقی نقطۂ نظر بن سکتا ہے اور ایک تہذیبی حیات نو کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔

خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی جامعہ نے اچھے اچھے کام شروع کئے۔ میرؔ، سوداؔ اور حسرتؔ کے انتخابات کی ضرورت تھی۔ سو شعر کے سٹ بھی ادبی ذوق کو عام کرنے میں اور اچھے اشعار کے ذخیرے کو ہر ایک تک پہونچانے میں معاون ہوئے محمد علی، اقبال، عبدالحق، بجنوری، رشید احمد صدیقی، تنہا، جگر کے شاہکاروں کو شائع کر کے، مکتبۂ جامعہ نے ایک بڑی خدمت انجام دی۔ جامعہ نے سوانح عمریوں، نظموں، انتخابات، ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کی دنیا میں بھی اضافہ کیا۔ محمد سرور نے مضامین محمد علی اور خطوط محمد علی شائع کر کے، ادب کی دنیا پر ایک بڑا احسان کیا ہے

رسالۂ جوہر کے بعض خاص نمبر نہایت مقبول ہوئے۔ ان میں جوہر اقبال، اور عبدالحق نمبر قابلِ ذکر ہیں۔ جامعہ نے بعض مشہور ادیبوں کی کتابیں شائع کرنے پر اکتفا نہیں کیا، نوجوانوں کو تصنیف وتالیف کا شوق دلایا، اُن کے ادبی ذوق کی تربیت کی، ان کے طرز میں سادگی اور افادیت کے ساتھ جان پیدا کی، ذاکر حسین، عابد حسین اور مجیب کے علاوہ پروفیسر محمد سرور، پروفیسر محمد عاقل، ڈاکٹر عبدالعلیم کے مذاق کی تربیت جامعہ کے خاص علمی وادبی ماحول میں ہوئی۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور اس کے جاری رہنے پر ہی اس کی افادیت کا دارومدار ہے، کیونکہ ادبی گھوارے چند مشہور ناموں یا شخصیتوں یا دو ایک سجادہ نشینوں پر نہیں چلا کرتے۔ ان کی زندگی کے لئے ایک نئی پود بھی ضروری ہے۔

جامعہ کی اردو اکیڈمی اور مکتبہ کے تذکرے کے بغیر یہ سرسری جائزہ نامکمل رہ جائے گا۔ اردو میں صاف، ستھری کتابیں برابر شائع ہوتی رہی ہیں۔ نامی پریس کانپور مفید عام پریس آگرہ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس کی خدمات کبھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں مگر اچھی کتابیں چھاپنے کے علاوہ اچھی، دیدہ زیب، صاف ستھری کتابیں شائع کرنے کا سہرا مکتبہ جامعہ کے سر ضرور ہے۔ آج اردو میں درجنوں اچھے ادبی ادارے، اشاعت خانے اور کتاب گھر ہیں۔ اور اردو کی کتابیں اب محض "خونِ جگر" نہیں، "مالِ تجارت" بھی ہیں اور مکتبہ اردو لاہور اور ادارۂ اشاعتِ اردو حیدرآباد اور دوسرے ادارے مکتبہ جامعہ سے بھی بہتر کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ مکتبے کا کام جامعہ کے دوسرے کاموں کی طرح کبھی خاطر خواہ نہ پھیل سکا۔ اس کی وجہ وہ مالی مشکلات ہیں جو ایک غیر سرکاری، قومی اور تعلیمی ادارے کو قدرتی طور پر پیش آئی ہیں، خصوصاً ہندوستان میں اور پھر جنگ کی وجہ سے ویسے بھی یہ کام اتنا آسان نہیں رہا جتنا پہلے تھا۔

جامعہ نے جہاں اردو کے علمی سرمائے میں اضافہ کیا ہے، وہاں حالی کے طرز میں

ایک خاص رنگ بھی پیدا کیا ہے۔ حالی کے زمانے میں اور بھی صاحب طرز موجود تھے، ان میں سے شبلی کا رنگ مقبول بھی ہوا۔ مگر اس کے باوجود یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جدید اردو نثر میں، سب سے گہرا اثر حالی کا ہے اور اس طرز میں سب سے زیادہ صلاحیت تمام گہرے، دقیق اور فنی خیالات اور نکات ادا کرنے کی موجود ہے۔ مولوی وحید الدین سلیم اور مولوی عبدالحق کے بعد حالی کے طرز کو مقبول بنانے میں جامعہ کے ادیبوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حالی کی سادگی میں کچھ لوگوں کو آج بھی جوش، جذبے اور چٹخارے کی کمی نظر آتی ہے۔ دراصل یہ لوگ خطابت کے عادی ہیں اور حالی کے یہاں، خطابت کم ہے، صاف ستھری، نکھری ہوئی مدلل نثر زیادہ۔ جامعہ کے ادیبوں میں سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں خطابت کی جھلک مل جاتی ہے، مگر اس حد تک کہ ان کے طرز میں حرارت اور گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین کے طرز میں ایک روشنیٔ فکر کا احساس ہوتا ہے۔ مسدس حالی کے صدی ایڈیشن پر ان کا دیباچہ پڑھئے تو آپ کو اس کا اندازہ ہوگا۔ پروفیسر مجیب کے یہاں ایک خاص شگفتگی اور گہرائی کا، اسلامی تہذیب پر اُن کے مضمون سے اس کا ثبوت ملے گا، لیکن یہ ایک ہی طرز کے ہلکے اور گہرے رنگ ہیں۔ حالی مغرب سے بہت زیادہ واقف نہ تھے۔ یہ کہنا، کسی ذہنی غلامی کے باعث نہیں ہے کہ اس وقت علوم و فنون میں جو اضافے ہو رہے ہیں وہ مغرب کے مرہونِ منت ہیں، جو کسی زمانے میں اسلامی افکار کا خوشہ چیں رہ چکا ہے۔ چراغ سے اسی طرح چراغ جلتا ہے۔ اس لئے اِس وقت اردو ادب میں گہرائی، معنویت، وزن اور بلاغت اُن کے افکار و خیالات میں زیادہ نمایاں ہے جو مغرب سے متاثر ہیں۔ جامعہ کے ادیبوں کے یہاں مغرب کا یہ اثر صاف نمایاں ہے، (خود اقبال کے یہاں بھی نمایاں ہے) مگر اُن کی مغربیت، مغرب کی نقالی اور سستی تقلید پر مشتمل نہیں ہے بلکہ مغرب سے ایک چنگاری لیکر اپنی شمعیں روشن کرنے اور اپنی محفلیں گرم رکھنے کے لئے ہے۔ یہ دراصل

محض مغربیت بھی نہیں بلکہ عقلیت، آفاقیت اور عصریت کا دوسرا نام ہے۔ یہ نئے خیالات تازہ ہواؤں، انوکھے ولولوں، مفید تجربوں اور دور رس علمی نتائج سے فائدہ اُٹھانے کے مترادف ہے پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ طرز، ایک زیور یا ایک لباس ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ طرز، زیور یا لباس یا ترصیع یا آرائش نہیں ہے، یہ خود پوست یا جسم و جان ہے۔ یہی شخص ہے اور شخص اپنی افتادِ مزاج، اپنے خیالات، اپنے جذبات کے محور اور امیدوں کے مرکزوں سے پہچانا جاتا ہے۔ شخصیت ہوتی خداداد ہے مگر بنتی بگڑتی افکار و تصورات اور عمل و کردار سے ہے۔ چنانچہ جامعہ کے ادیبوں کی ایک عام شخصیت ہے اور ایک عام طرز ہے، جس میں خلوص، صداقت، وزن اور سادگی ہے۔ پھر خاص شخصیتیں اور خاص رنگ ہیں۔ اس وحدت و کثرت نے جامعہ کے ادیبوں کی تصانیف میں یکسانیت اور رنگا رنگی دونوں چیزوں کو جنم دیا ہے۔ اسی وحدت و کثرت سے ان کے ادبی کارناموں میں زندگی اور عظمت آئی ہے۔ اسی سے اُن کی ابدیت کے متعلق نہایت اطمینان سے حکم لگایا جا سکتا ہے۔

آل احمد سرور

جامعہ ملیہ کا نظم ونسق

جامعہ ملیہ ایک خود مختار تعلیمی نو آبادی ہے۔ جامعہ میں کوئی خادم نہیں ہے سب مخدوم ہیں۔ جامعہ میں کوئی ملازم نہیں ہے سب آقا ہیں۔ جامعہ کی خدمت میں آزادی ہے
آئیے اس اجمال کی تفصیل کے لئے جامعہ کے کارکنوں کا ایک جایزہ لیں۔

سب سے پہلے ان کارکنوں کو لیں جنھیں دوسری جگہ ملازم یا خدمت گار کہا جاتا ہے۔ کیا بندو خاں اور ابراہیم حوالدار، سلیم اور حبیب، یسع اور علی حسین، مشتاق اور منور خادم ہیں؟ کیا وہ خادموں کی طرح کام کرتے ہیں؟ کیا ان کی خدمت میں ایک بے نیازی کی آن، ایک خودداری کی شان، ایک بلند منزلت ارتفاع نظر نہیں آتا۔ کیا ان کے انداز میں اپنی عظمت اور قدر وقیمت کا شعور دکھائی نہیں دیتا؟ گویا وہ زبان حال سے کہہ رہے ہوں کہ ہماری خدمت کو حقیر اور کم مرتبہ نہ سمجھو۔ یہ وہ چیز نہیں جسے کم یا زیادہ روپے سے خریدا جا سکے۔

ان کے بعد جامعہ کے محرر و منشی ہیں۔ کیا یہ ملازم ہیں؟ کیا یہ اپنے افسروں کی خوشامد اور نجی خدمت میں لگے رہتے ہیں؟ کیا یہ صرف افسروں کی موجودگی میں کام کرتے ہیں جہاں افسروں کی آنکھ بچی اور انھوں نے کام چوری شروع کر دی۔ کیا ان کی نظر ہمیشہ اضافہ تنخواہ، ترقی گریڈ وغیرہ پر لگی رہتی ہے۔ کیا یہ حساب کتاب میں موقع پا کر گڑبڑ کرتے رہتے ہیں؟ کیا یہ جامعہ کے کام کو اپنا کام نہیں سمجھتے؟ کیا جامعہ کے ساتھ

یہ لوگ ایک قریبی یگانگت محسوس نہیں کرتے ؟ کیا اپنی خودداری، عزت نفس اور انسانی مساوات کو ہاتھ سے دے کر یہ اپنے افسروں اور دوسرے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل اور خوار ہوتے رہتے ہیں ؟ کیا یہ تنخواہ کی کمی بیشی، اس کی ادائے گی میں دیر سویر کی وجہ سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں ؟ کیا ان کی بلند ہمتی، عالی ظرفی اور استغنا، جامعہ کے کسی دوسرے فرد سے کم ہے ؟ اگر نہیں تو پھر یہ کس کے ملازم ہیں؟

ان سے اوپر مہتمین اور اساتذہ ہیں۔ یہ دوسری جگہوں میں بھی درمیانی آقاؤں کے زمرہ میں رکھے جاتے ہیں۔ لیکن جتنی خود مختاری ان کو جامعہ میں نصیب ہے کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ مہتمین کو اپنے شعبہ کی اور اساتذہ و اتالیق کو اپنی جماعت کی تعلیم و تہذیب اصلاح و ترقی کا پورا اختیار ملا ہوا ہے۔ وہ اپنے کام کا پروگرام خود بناتے ہیں۔ اس کی تکمیل کے ذرائع کے انتخاب میں انھیں پوری آزادی ہوتی ہے۔ جو مالی امداد یہ چاہیں اس میں جہاں تک جامعہ کی قلیل آمدنی اجازت دیتی ہے کوئی دریغ نہیں کیا جاتا۔ اس لئے انھیں تخلیق و تعمیر کی ان تمام مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع حاصل ہوتا ہے جو ایک صناع و نقاش کو ہوتا ہے۔ ان کا معاوضہ ان کی تنخواہ نہیں بلکہ خود ان کا کام ہے اور یہ تنخواہ کی کمی بیشی دیر سویر سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔

ان سے اوپر ناظم، نگراں یا انچارج شعبہ ہوتا ہے جس کی حیثیت محض صلاح کار اور مشیر کی ہوتی ہے۔ عام دستور العمل یا نصاب کے نافذ کرنے اور کام میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنے کی ذمہ داری اس پر ہوتی ہے۔ یہ مصالحت اور مفاہمت کی ایسی صورتیں برابر نکالتا رہتا ہے جن سے مہتمین اور اساتذہ کی خود مختاری اور جدت اقدام کو بھی زیادہ سے زیادہ قائم رکھا جا سکے اور مجالس بالا دست کے صریح فیصلوں نصابوں اور دستور العملوں کی بھی زیادہ سے زیادہ پابندی کرائی جا سکے۔ یہ اپنے شعبہ کا میزانیہ بناتا ہے۔ اپنے مددگاروں کے انتخاب میں شرکت کرتا ہے۔ اپنے شعبہ کی

مجلس انتظامیہ کا معتمد ہوتا ہے اور باہر کے تمام لوگوں سے خط و کتابت اور ملاقات وغیرہ کے ذریعے رابطہ قایم رکھتا اور معاملات طے کرتا رہتا ہے۔ غرض ناظم اپنے شعبہ کا انتظامی افسر ہوتا ہے۔

اس کے اوپر اس کے شعبہ کی مجلس ہوتی ہے جس کا داعی اور معتمد ناظم خود ہوتا ہے اور شعبہ کے تحریری دستور کے مطابق اس کے میعادی جلسے منعقد کراتا اور اس کے فیصلے حاصل کرتا رہتا ہے۔

شعبوں کی ان مجالس کے اوپر دو اعلیٰ مجالس ہیں یعنی مجلس تعلیمی اور مجلس منتظمہ۔ دونوں کا داعی اور معتمد مسجل (رجسٹرار) ہوتا ہے اور یہ شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) کی صدارت میں اپنے جلسے منعقد کرتی رہتی ہیں۔ مجلس تعلیمی میں غور و فکر، اظہار رائے اور مجلس منتظمہ سے سفارش کے لئے تعلیمی شعبوں کی مجالس کے وہ فیصلے یا دیگر معاملات بھیجے جاتے ہیں جو تعلیمی امور سے متعلق ہوتے ہیں لیکن ان کے بارے میں بھی آخری فیصلہ اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ مجلس منتظمہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

مجلس منتظمہ سب سے اعلیٰ اور سب سے اہم جماعت ہے۔ جامعہ کے جملہ مسائل کے بارے میں آخری غور و فکر اور فیصلہ کا اختیار مجلس منتظمہ کو حاصل ہے اور یہ اپنے نفاذ کنندہ عہدہ دار یعنی شیخ الجامعہ کی معرفت نگرانی، انتظام اور اقدام کے جملہ فرایض انجام دیتی ہے۔

لیکن ان سب سے اوپر ایک اور جماعت بھی ہے جسے جامعہ کے اقتدار اعلیٰ کا مالک قرار دیا جا سکتا ہے یعنی انجمن جامعہ ملیہ۔ یہ جامعہ کے ان اساتذہ اور کارکنوں پر مشتمل ہے جنھوں نے بیس سال یا حین حیات تک جامعہ کی خدمت کرنے اور ایک سو پچاس سے زیادہ تنخواہ نہ لینے کا عہد کیا ہے۔ اس کے داعی اور معتمد شیخ الجامعہ ہیں۔ اس کے جلسے کبھی کبھی ہوتے ہیں اور یہ مجلس منتظمہ اور جامعہ کے اعلیٰ عہدہ داروں یعنی امیر جامعہ، شیخ الجامعہ، خازن اور مسجل کا انتخاب کرتی ہے اور تمام کام اسی کے نام سے کئے جاتے ہیں۔

غرض محکوم اور حاکم کا یہ ایک چکر ہے جس کی ابتدا اور انتہا کا پتہ چلانا اور یہ فیصلہ کرنا کہ کون خادم ہے اور کون مخدوم بہت مشکل ہے۔ اگر ایک طرف انجمن جامعہ ملیہ مجلس منتظمہ کا انتخاب کرتی ہے تو دوسری طرف خود مجلس منتظمہ انجمن جامعہ ملیہ کے اراکین کے انتخاب کی سفارش کرتی ہے اور اس کی سفارش کے بغیر کوئی شخص انجمن جامعہ ملیہ کا رکن نہیں بن سکتا۔ اگر ایک طرف مجلس منتظمہ، مجلس تعلیمی اور مجالس شعبہ جات پر حکم چلاتی ہے تو دوسری طرف اپنے حکم چلانے والے اراکین میں سے ایک دو کو ان ماتحت مجالس میں بطور رکن کے بھی شریک کر دیتی ہے اور اسی طرح حکم چلانے اور حکم ماننے والے کے فرق کو دھندلا کر دیتی ہے۔ اگر ایک طرف مجلس تعلیمی، مجالس شعبہ جات کے فیصلوں پر تنقید و تبصرہ کرتی اور ان کی سفارش یا مخالفت کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی بیشتر تعداد خود ان شعبہ جات کے افسروں پر مشتمل ہوتی ہے گویا یہ افسر اجتماعی حیثیت سے اپنی انفرادی حیثیت پر نگرانی اور تنقید کرتے ہیں۔ اسی طرح مجالس شعبہ جات میں ان کے ماتحت اساتذہ یا مہتممین کے نمائندے شرکت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ شعبوں کے اندر دوسری ایسی مجالس بھی ہوتی ہیں جن کے ذریعہ تمام کارکنوں کے باہمی مشورے اور استصواب رائے سے کاموں کو شروع کیا اور چلایا جاتا ہے۔ ان رسمی جلسوں کے علاوہ غیر رسمی طریقہ پر اسٹاف کلب یا انجمن ہائے اساتذہ انجمن ہائے طلبا یا ملازموں کی انجمن کے جلسوں اور دوسری صحبتوں اور تقریبوں میں بھی جامعہ کے کارکن ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کرتے، اپنی کہتے اور دوسروں کی سنتے رہتے ہیں اور اپنی متفقہ خواہشوں اور مطالبوں کو شیخ الجامعہ اور مجلس منتظمہ سے منواتے رہتے ہیں۔

جایز اور ناجائز تنقید اور محاسبہ کی جس قدر آزادی جامعہ میں ہے مشکل ہی سے کسی دوسرے ادارے میں ہوگی۔ تنقید سے کوئی شخص، شیخ الجامعہ سے لے کر چپراسی تک بچا ہوا نہیں ہے۔ عہدہ داروں کو جن میں خود شیخ الجامعہ بھی شامل ہیں کبھی کبھی یہ شکایت

رہتی ہے کہ ہر شخص حاکم وخود مختار بن گیا ہے۔ اپنی مرضی سے کام کرتا ہے۔ کسی مشورہ کی ضرورت نہیں سمجھتا اور کسی مداخلت کو گوارا نہیں کرتا۔ ماتحت کارکنوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ اعلیٰ افسر جو چاہتے ہیں من مانی کرتے رہتے ہیں۔ قاعدے اور قانون کی کوئی پابندی نہیں کی جاتی۔ ان سے کوئی مشورہ اور استصواب رائے نہیں کیا جاتا۔ مطلق العنانی اور مرکزیت ترقی پر ہے۔ دستوری اور جمہوری نظام اور لامرکزیت برائے نام رہ گئی ہے۔

باہر سے کوئی نووارد جب جامعہ آتا ہے اور یہاں کے لوگوں سے ملتا اور ان کی بے تکلف صحبتوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ جامعہ کے لوگوں میں سخت انتشار بے چینی اور بے اطمینانی ہے۔ لوگوں میں وحدت مقصد نہیں ہے۔ یہ لوگ علی الاعلان بلا خوف وخطر، جامعہ کے بنیادی نصب العین، جامعہ کے کاموں اور انتظاموں پر اور جامعہ کے افراد کے خیالات، عقاید اور اخلاق پر سخت ترین نکتہ چینی اور عیب جوئی کرتے ہیں ان کی فروگزاشتوں اور لغزشوں کی تشہیر کرتے ہیں اور ان کی اس ہمہ گیر تنقید سے جامعہ کا کوئی فرد بشر محفوظ نہیں ہے۔
حتیٰ کہ ڈاکٹر ذاکر کی عظیم شخصیت بھی اس کی زد سے باہر نہیں سمجھی جاتی۔

اس بات سے اس نووارد کو ابتدا میں بڑی سخت غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ جامعہ کی طرف سے بہت بدظن اور مایوس ہو جاتا ہے۔ لیکن جلد ہی اصل حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے اور وہ جان جاتا ہے کہ یہ باتیں جامعہ کی کمزوری، انتشار اور بے اطمینانی کا نہیں بلکہ انتہائی طاقت اور جمعیت کا ثبوت ہیں۔ جامعہ آزاد لوگوں کی جماعت ہے جب ان کی خلاف مرضی کوئی بات ہوتی ہے تو وہ فوراً اس کو ظاہر کرتے ہیں اور اس طرح اپنی شکایتوں کو گھونٹ کر نہیں رکھتے بلکہ انھیں تازہ ہوا پہنچاتے ہیں۔ خاطی اور غلط کار کو اس کی خطا اور غلطی سے متنبہ کر کے اپنی اصلاح کی طرف مائل کرتے ہیں اور اگر خود انھیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے تو اس کے دور کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

۱ اس ذیل میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپ ہوگا۔ کلیہ جامعہ کے طلبا نے اپنے ایک تفریحی جلسہ میں ایک دفعہ قوالی کی نقل کی۔ اس میں ٹیپ کا بند تھا ؎

میدان تیرے ہاتھ ہے، میدان تیرے ہاتھ ہے

اس میں جامعہ کے مختلف شعبوں کے کارکنوں کی مطلق العنانی کی ہجو کی گئی تھی۔ ابتدائی مدرسے میں جو مختلف پروجکٹ، مرغی پروجکٹ، تندرستی پروجکٹ، غذا پروجکٹ وغیرہ کے نام سے چل رہے تھے ان کا نام لیا گیا۔ جامعہ کے ڈیری فارم کا، کیمیکل انڈسٹری کا، جامعہ اسٹور کا، مطبخ جامعہ کا غرض ہر شعبے کا ذکر کیا گیا۔ ہر شعبہ کے کام کا مضحکہ اڑانے کے بعد ٹیپ کا بند یہ پڑھا جاتا تھا ؎

میدان تیرے ہاتھ ہے، میدان تیرے ہاتھ ہے

گویا مطلق العنانی کا شکوہ تھا کہ ہر شخص جو چاہتا ہے اپنی مرضی کے مطابق کر سکتا ہے اور اس کے نفع نقصان کی کوئی گرفت اور روک ٹوک نہیں کی جاتی۔

لیکن اس کے ایک لطیف پہلو کو شاید ان طلبا نے خود محسوس نہیں کیا اگرچہ اس کو ان لوگوں نے جنھیں ہدف تنقید بنایا گیا تھا ضرور محسوس کیا ہوگا۔ یعنی یہ کہ بے روک ٹوک تنقید اور محاسبہ کی جو آزادی جامعہ میں ہے وہ دوسری جگہ ممکن نہیں کہ جس کی وجہ سے طلبا بھی جامعہ کے جس شخص اور جس چیز کا چاہیں دائرہ تہذیب کے اندر مذاق اڑا سکتے ہیں۔

الغرض جامعہ میں ہر شخص حاکم ہے اور برائی پر ہر شخص کو ٹوک سکتا ہے۔ جامعہ میں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ جامعہ کا اختیار بالا دست شیخ الجامعہ اور مجلس منتظمہ کو حاصل ہے یا جامعہ کے جملہ کارکنوں کو۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ اختیار رہے جامعہ کے اندر۔ باہر کی کسی مداخلت کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کسی شرط پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جامعہ کسی ایسی مالی امداد کو قبول نہیں کرتی جس کی شرط یہ ہو کہ جامعہ کے انتظام میں مداخلت کی جائے گی۔

اپنے قیام کے بعد سے جامعہ نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا ہے اور ایسی مالی طمانیت پر جو قوتِ کو کمزور کر دے اس خود مختاری کو ترجیح دی ہے جس میں عزت اور عمل کی آزادی محفوظ رہے۔ جامعہ کو والیانِ ملک اور مخیر لوگوں سے غیر مشروط امداد کے طور پر خاصی بڑی رقمیں ملتی رہی ہیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا سہارا چندے کی وہ چھوٹی چھوٹی رقمیں ہیں جو ہمدردانِ جامعہ سے وصول ہوتی ہیں۔ ان ہمدردان کی تعداد اب قریب آٹھ ہزار کے ہے۔

نظم ونسق کے جو عام معیار ہیں ان کے مطابق جامعہ کا نظام بہت ڈھیلا ہے اور اس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقی جمہوری معیار کے مطابق جامعہ کے نظم ونسق کو مجموعی طور پر کامیاب کہا جا سکتا ہے اگرچہ اصلاح و تکمیل کی اس میں ابھی تک بہت گنجایش ہے۔

نظم ونسق کی کامیابی کا پہلا معیار تو یہ ہے کہ کارکنوں کے محرکات اور قوائے عمل سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ اس لحاظ سے جامعہ کے کارکن دوسری جگہوں کے کارکنوں سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کی بیشتر تعداد بہت زیادہ کام کرتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے ذمہ صرف ایک کام ہو۔ اکثر کے ذمہ کئی کئی کام ہوتے ہیں جن میں سے ہر کام اہم ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے انجام دینے میں وہ دن رات مصروف نظر آتے ہیں۔ پھر انھیں نہ اپنی سدھ رہتی ہے نہ اپنے بال بچوں کی۔ اس کے علاوہ ایسے ہنگامی موقع بھی اکثر آتے رہتے ہیں جن میں کام کی رفتار کو پہلے سے بھی زیادہ بڑھانا پڑتا ہے۔ اس وقت ان کی حالت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے ان کے یہ سب کام انتہائی مسرت اور قطعی اطمینان کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ لوگ تھک کر چور ہو جاتے ہیں لیکن کوئی ذہنی اذیت اور کلفت محسوس نہیں کرتے۔ ان ہی کارکنوں کے طفیل سے جامعہ کے کام تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔ یہ سب پیسے کے لالچ

ذیل میں جامعہ کے نظم و نسق کو نقشہ کی صورت میں دکھلایا گیا ہے۔

سے نہیں کئے جاتے بلکہ ذاتی تسکین، جماعتی تحسین یا صحت مند مسابقت کے جذبہ کے ماتحت انجام پاتے ہیں۔

نظم و نسق کی کامیابی کا دوسرا معیار یہ ہے کہ وہ خود حرکی ہو یعنی خارجی تحریک اور نگرانی کا محتاج نہ ہو بلکہ کارکن کے اندر اپنے خود اقدامی اور احساس ذمہ داری پیدا کیا جائے۔ اس لحاظ سے بھی جامعہ کے کام کو دوسری جگہوں کے مقابلہ میں فوقیت حاصل ہے۔ یہاں اوپر سے رہنمائی بہت کم کی جاتی ہے اور اگر کی جاتی ہے تو اس طرح کہ کارکن کو یہ بات محسوس نہیں ہو پاتی۔ اس کی نوعیت دوستانہ مشورہ یا ہمدردانہ رہنمائی کی سی ہوتی ہے۔ وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ یہ سب کام میرے ذاتی اقدام ہی سے ہو رہا ہے۔ اسی طرح نگرانی اور محاسبہ بھی بہت کم کیا جاتا ہے یا غیر محسوس طریقہ پر کیا جاتا ہے اس لئے کام چوری کا کوئی محرک نہیں پیدا ہوتا۔

تیسرا معیار ہے کہ وسائل کی تضیع اور بربادی کا امکان اس میں کم سے کم ہو۔ اس لحاظ سے بھی جامعہ کے بڑے بڑے کام جتنی کم لاگت پر انجام پاتے ہیں انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بظاہر ضرور بہت سی جگہوں میں تضیع نظر آتی ہے جس کا ڈھنڈورا ہر شخص پیٹتا رہتا ہے۔ کوئی نووارد جامعہ میں آئے تو اس مسلسل شور کو سن کر وہ تو ضرور یہ خیال کرنے لگے گا کہ یہاں دونوں ہاتھوں سے قوم کا چندہ بے دردی کے ساتھ لٹایا جا رہا ہے۔ لیکن اگر تمام دوسرے پہلوؤں کو وسعت نظر کے ساتھ ملحوظ رکھا جائے گا اور جن مشکل حالات میں جامعہ کو اپنے کام چلانا پڑ رہے ہیں ان کو بھی مد نظر رکھا جائے گا نیز تضیع کی ان لاتعداد دوسری صورتوں کا شمار کیا جائے گا جو دوسری جگہ شعوری طریقے پر بے ایمانی کے ارادے اور دغا بازی کے مقصد کے ساتھ اختیار کی جاتی ہیں اور جامعہ کی تضیع کے نتائج اور دوسری جگہ کی تضیع کے نتائج کو ...... دیکھا جائے گا تو فیصلہ لامحالہ جامعہ کے حق میں صادر کرنا پڑے گا۔

جامعہ کے حسابات اور ان کا محاسبہ بھی باقاعدگی کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں اس کے لئے جامعہ کے داخلی محاسب بھی مقرر کئے جاتے ہیں اور خارجی سند یافتہ خود مختار محاسب بھی۔ اقدام کی آزادی کی وجہ سے ایسی صورتیں کبھی کبھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کارکن اپنی حدود سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ ان کی سختی سے گرفت کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے اگر کوئی بدمزگی پیدا ہوتی ہے تو اس کی بالکل پروا نہیں کی جاتی۔ لیکن ہمیشہ یہ ثابت ہوا ہے کہ کسی معاملے میں کبھی کوئی بد دیانتی بہ نیتی کے ساتھ نہیں کی گئی۔ زیادہ سے زیادہ الزام قوت فیصلہ اور اختیار تمیزی کے بے جا استعمال تک محدود رہتا ہے۔

جامعہ ابھی ایک کم عمر، نمو پزیر ادارہ ہے۔ اس کے کام کے اور نگرانی کے طریقوں نے ابھی غیر تغیر پذیر اور بے لوچ شکلیں اختیار نہیں کی ہیں۔ لیکن کام کی وسعت اور کارکنوں کی کثرت کے ساتھ ان سب چیزوں کو بھی رفتہ رفتہ اختیار کرنا پڑے گا پھر شاید ترقی کی رفتار اتنی تیز اور اتنی بے ساختہ، اتنی خودرو نہیں رہ سکے گی۔ لیکن غالباً اسے زیادہ پائدار اور یقینی بنایا جا سکے گا۔

(پروفیسر محمد عاقل)

شخصیات

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں (اقبال)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ذاتِ بابرکات بلا مبالغہ انیسویں صدی کی ایک ایسی باکمال اور عظیم ترین ہستی تھی جو صدیوں کے انتظار کے بعد پیدا ہوتی ہے اور زمانے پر اپنے نہ مٹنے والے گہرے اور ہمہ گیر اثرات چھوڑ کر جاتی ہے۔ میرا یہ منصب کہاں کہ اس عظیم المرتبت اور یگانۂ روزگار ہستی کے محاسن اور صفات گنا کر بتا سکوں کہ وہ کیا تھی اور کتنی بڑی تھی، علم و عمل، انسانیت و مروت کے کس بلند درجہ پر فائز تھی، علوم ظاہری و باطنی دونوں میں اُسے کتنا زبردست کمال حاصل تھا، اس کے اخلاق کتنے وسیع، اس کے اعمال کس قدر پاکیزہ اور بہر نوع اُس کی شخصیت کتنی جامع، مکمل اور ہمہ گیر تھی۔ اس مختصر سے مضمون میں اگر میں اس جلیل القدر ہستی کی زندگی کے مختصر حالات اور موٹے موٹے واقعات بتا کر، اُس کی حقیقی عظمت کی ایک ہلکی سی جھلک ہی دکھا سکوں تو اپنے کو کامیاب سمجھوں گا۔

حضرت شیخ الہندؒ قصبۂ دیوبند ضلع سہارنپور کے ایک معزز خاندان میں جس کا سلسلۂ نسب حضرتِ عثمان ذوالنورینؓ سے ملتا ہے، ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے، اور محمود حسن آپ کا نام رکھا گیا۔ آپ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور نہایت ہی صاحب اقبال وذی وجاہت انسان تھے۔ والدہ ماجدہ دیوبند کے ایک معزز شیخ بو علی بخش صاحب کی صاحبزادی اور نہایت سخی، خدا ترس اور منتظم عورت

تھیں شفیق ماں باپ نے نہایت ہی محبت و پیار کے ساتھ آپ کی پرورش کی چھ سال کی عمر ہوئی تو آپ کی تعلیم شروع کرائی گئی ۔ فارسی کی تمام کتابیں اور ابتدائی عربی آپ نے گھر ہی پر اپنے محترم چچا مولوی مہتاب علی صاحب سے پڑھی ۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو جبکہ آپ کی عمر پندرہ سال کی تھی دارالعلوم (دیوبند کا مشہور مدرسہ) کھل گیا اور اپنی بقیہ تعلیم آپ نے اسی مدرسہ میں مکمل کی حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم، آپ کے اُستاد خصوصی ہیں ۔ آپ نے اپنے قابل اور فخر زمانہ اُستاذ سے صحاح ستہ (احادیث کی مشہور کتب) اور دیگر فنون کی اعلیٰ کتابیں، سفر و حضر میں ساتھ رہ کر اس محبت و توجہ سے پڑھیں، پھر اس ہونہار، ذکی اور ذی استعداد شاگرد پر شفیق استاذ کی نظر عنایت بھی کچھ ایسی ہوئی کہ بہت جلد علوم عقلیہ و نقلیہ میں آپ کو کامل دستگاہ حاصل ہوگئی اور ابھی آپ فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسی مدرسہ میں بطور معاونِ استاذ درس بھی دینے لگے اور ۱۲۹۵ھ میں تعلیم سے فراغت کے بعد تو آپ کا شمار باقاعدہ مدرسین کی فہرست میں ہونے لگا ۔ ۱۳۰۵ھ میں آپ باتفاق آرا صدر مدرس مقرر ہوئے اور اس وقت سے آخر عمر یعنی ۱۳۳۹ھ تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ اس تمام عرصہ میں آپ نے جس حسن و خوبی کے ساتھ مسلسل تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دئے اُس نے دارالعلوم کو درحقیقت دارالعلوم بنا دیا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم نے، علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج کے جس بلند مقصد کو سامنے رکھ کر اس مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی، اُس کی تکمیل کا سہرا ان کے اسی شاگرد رشید کے سر ہے جسے دُنیا نے حضرت شیخ الہند کے لقب سے پکارا اور جس کے علم و فضل اور زہد و ورع کا چرچا نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلا ۔

آپ کو علوم عقلیہ و نقلیہ بالخصوص علم حدیث میں جو غیر معمولی تبحر حاصل تھا، آپ کے حلقۂ درس کی جو خاص شان تھی، اور طرز تحدیث میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

کے مسلک خاص کا جو اثر آپ پر تھا، گنجائش نہیں ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ان تمام باتوں کا تفصیلی تذکرہ کیا جا سکے۔ ویسے تو آپ کے کمال تبحر کو دیکھتے ہوئے حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہیؒ اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتیؒ نے آپ کو اجازتِ حدیث مرحمت فرمائی تھی، لیکن درس وتدریس اور قرأت وتحدیث کے لحاظ سے آپ کی سندِ حدیث دو طرح سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ تک اور ان کے اساتذۂ کرام کے ذریعہ سے حضرات محدثین اور جناب سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

اول:۔ عن مولانا الشیخ محمد قاسم، عن مولانا الشیخ عبدالغنی، عن مولانا الشاہ محمد اسحاق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز، عن مولانا الشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

ثانی:۔ عن مولانا الشیخ احمد علی السہارنفوری، عن مولانا الشاہ محمد اسحاق، عن مولانا الشاہ عبدالعزیز، عن مولانا الشاہ ولی اللہ، قدس اللہ اسرارہم

حضرت شیخ الہندؒ نے ۴۴ سال تک مسلسل ایک مرکز پر جم کر، درس وتدریس اور اشاعت علوم دینیہ کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اُس کی مثال اس زمانے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند میں بھی شاذونادر ہی ملے گی۔ آپ کے ایسے شاگردوں کی تعداد جو باقاعدہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں۔ ایک ہزار سے بھی زائد ہوتی ہے۔ اور غیر فارغ التحصیل یا بالواسطہ شاگردوں کی تعداد کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا شہر یا قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد موجود نہ ہوں۔ ہندوستان کے علاوہ کابل، قندھار، بلخ، بخارا، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور یمن تک کے لوگ آپ کے فیوض سے مالامال ہو کر گئے۔ ویسے تو آپ کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہونے والوں میں ایک سے ایک جوہر قابل پیدا ہوا اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پر آفتاب و ماہتاب بن کر علم دین کی

روشنی پھیلائی۔ لیکن آپ کے ممتاز ترین شاگردوں میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی حضرت مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری رحمہم اللہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہم کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں علمائے کرام کے طبقہ میں یہ حضرات فضیلت و امتیاز کے جس بلند مقام پر فائز ہوئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر اسی سے اُس "مرد کامل" کی عظمت و جلالت کا اندازہ کر لیجے جس کے فیضانِ نظر نے ایسی ممتاز اور اعلیٰ شخصیتیں پیدا کر دیں۔

علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی میں بھی حضرت شیخ الہند کو درجۂ کمال حاصل تھا، اور آپ اپنے وقت کے ایک باکمال صوفی اور عارف تھے آپ کی مشہور و معروف نسبتِ بیعت تو اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے ہے جنھوں نے چاروں سلسلوں میں آپ کو اجازت بیعت فرمائی، لیکن جس سال آپ اپنے استاذ و مرشد اور حضرت گنگوہیؒ وغیرہ کی معیت میں حج بیت اللہ کی غرض سے تشریف لے گئے تھے تو مکہ معظمہ میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی درخواست پر حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ نے بھی آپ کو شرفِ بیعت سے نوازا اور خلافت و اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی۔

گنجائش نہیں ہے کہ آپ کی عبادت و ریاضت، اتباع سنت اور سلوک و معرفت کے واقعات کو یہاں تفصیل سے پیش کیا جائے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ ان تمام صفات میں اپنے اکابر سلف کا مکمل اور بہترین نمونہ تھے۔ آپ نے اتباع سنت اور عمل بالعزیمت کے ذریعہ طریقت کو پالیا تھا، احکام اسلامی پر عمل کرتے ہوئے درجۂ احسان تک پہنچ گئے تھے اور تعبد اللہ کانک تراہ کے بلند مقام پر فائز تھے کہ تصوف کا صحیح مقام اور طریقت کا حقیقی مقصود بھی یہی ہے۔

حضرت شیخ الہند اپنے وقت کے ایک بہت بڑے متبحر عالم اور باکمال صوفی ہی نہ تھے بلکہ ایک زبردست مجاہد، انقلابی اور امام سیاست بھی تھے، آپ کے دل میں ملت اسلامی کی خیر خواہی اور استخلاص وطن کا بے پناہ جذبہ موجزن تھا اور آپ کی تمام زندگی میں اس جذبہ کی پوری پوری کارفرمائی نظر آتی ہے، تعلیم وتدریس اور ارشاد وہدایت کے خاموش اور قابل قدر فرائض کے ساتھ ساتھ آپ نے آزادئ وطن اور سیاست ملی کے سلسلہ میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں ان پر اگرچہ اب تک ایک پردہ سا پڑا ہوا ہے لیکن یقین ہے کہ اگر آئندہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی کوئی صحیح تاریخ لکھی گئی تو اس میں حضرت شیخ الہند کی سیاسی جدوجہد اور انقلابی کارناموں کا غیر معمولی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا جائے گا — آئندہ صفحات میں میں کوشش کروں گا کہ حضرت شیخ الہند کی زندگی کے اس خاص اور اہم پہلو یعنی سیاسی پہلو کو ذرا نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔

حضرت شیخ الہند کی انقلابی اور سیاسی کوششوں پر نظر ڈالنے سے پہلے، یہاں ایک بنیادی بات کا واضح کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ حضرت شیخ الہند حزب ولی اللہ کے ایک فرد اور دیوبندی تحریک درحقیقت ولی اللہی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۵ رمئی سنہ ۱۷۳۱ء کو ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکیم الہند نے اپنا نصب العین معین کیا، اپنے پروگرام کی تدوین کی، جمعیۃ مرکزیہ بنائی اور اس کی شاخیں ملک میں قائم کی گئیں۔

یہ تحریک ولی اللہی کا پہلا دور ہے اس میں امام ظاہر ہوئے اور ایک حکومت موقتہ (   ) قائم ہوئی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) امام ولی اللہ سنہ ۱۷۳۱ء تا سنہ ۱۷۶۳ء

(۲) امام عبدالعزیز سنہ ۱۷۶۳ء تا سنہ ۱۸۲۴ء

(۳) امام محمد اسحاق سنہ ۱۸۲۴ء تا سنہ ۱۸۴۶ء

موقتہ حکومت کے امیر شہید سید احمد سنہ ۱۸۲۴ء تا سنہ ۱۸۳۱ء

اس تحریک کا دوسرا دور امام محمد اسحاق نے سنہ ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ سنہ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے اور سنہ ۱۸۴۶ء تک مکہ معظمہ میں، دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی تھے۔ ان کے بعد الامیر امداد اللہ نائب بنے وہ بارہ برس یعنی سنہ ۱۸۵۸ء تک دہلی میں رہے۔ اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔

ان کے پہلے نائب مولانا محمد قاسم سنہ ۱۸۷۹ء تک پھر مولانا رشید احمد سنہ ۱۹۰۵ء تک، شیخ الہند مولانا محمود الحسن سنہ ۱۹۲۰ء تک

اس سال تحریک مذکور کا دوسرا دور ختم ہوا۔

تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے سنہ ۱۹۲۰ء سے تھوڑے عرصے پہلے شروع کیا تھا"

مذکورہ بالا بیان سے ولی اللّٰہی تحریک کے مختلف ادوار کا سرسری خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ ایک جگہ دیوبندی جماعت کا تعارف کراتے ہوئے مولانا سندھی تحریر فرماتے ہیں :-

"جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرانا چاہتے ہیں وہ اُس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے جو مولانا اسحاق کی ہجرت کے بعد اُن کے متبعین نے اُن کی مالی اعانت اور اُن کے افکار کی اشاعت کے لئے بنائی تھی۔ اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے، اُستاذ الاساتذۃ الہند مولانا مملوک علی صدر مدرس دہلی کالج کے لئے مخصوص رہی۔ اُن کے بعد مولانا اسحاق نے مولانا امداد اللہ کو اس کے لئے مقرر کیا ۔۔۔۔۔۔ اس جماعت کی مرکزی قوت دستگاہ

سنہ ۵۷ء کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور دہلی کے عوض، دیوبند اور علیگڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصے کو دیوبند لے گئے اور سرسید احمد خاںؒ نے دہلی کالج کے انگریزی حصے کو علیگڑھ پہنچا دیا۔ (سرسید اور مولانا محمد قاسمؒ دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے) کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورے اشتراک کے بغیر اپنا کام شروع ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے برٹش گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنا لیا مگر دیوبندی جماعت نے جو مولانا اسحاق کے زمانے سے دولت عثمانیہ کو اپنا سیاسی رہنما مان چکی تھی، اضطراری حالات کے سوا حکومت کی کامل وفاداری کو اپنا مسلک بنایا لیکن یہ غیر جانبداری بھی اس وقت قطعاً ختم سمجھی جائے گی جب دولت عثمانیہ اور دولت برطانیہ میں لڑائی ٹھن جائے۔

دیوبند کے مدرسہ کا قیام بھی اس صورت سے عمل میں آیا:-

"ہنگامہ سنہ ۵۷ء کے فرو ہونیکے بعد ولی اللٰہی تحریک کے ارباب حل و عقد حجاز میں جمع ہوئے اور یہ تجویز کی گئی کہ ہندوستان میں از سر نو شاہ عبدالعزیز کے نمونے کا مدرسہ قائم کیا جائے جو ولی اللٰہی تحریک کا مرکز بن سکے۔ چنانچہ سقوط دہلی کے نو برس بعد ۱۸۶۶ء میں دہلی کے قرب میں دیوبند کے مقام پر مدرسہ کی بنا رکھی گئی۔ اس مدرسہ کا بنیادی خیال حاجی امداد اللہ نے مکہ معظمہ میں سوچا تھا اور مولانا محمد قاسم سات سال مسلسل اس کوشش میں رہے کہ اپنے استاد اور مرشد کے خیال کو عمل میں لائیں۔ مدرسۂ دیوبند کا نصاب تعلیم، نظام عمل اور اساسی قواعد مولانا محمد قاسم نے مرتب کئے اور اس طرح انھوں نے شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ اور ولی اللٰہی تحریک کے مقاصد کو دیوبندی نظام میں محفوظ کر دیا۔"

مذکورہ بالا بیانوں سے دیوبندی جماعت اور دیوبندی تحریک کی صحیح حیثیت

بالکل واضح ہوجاتی ہے یعنی یہ کہ دیوبندی جماعت دراصل "حزب ولی اللہ" ہی کا دوسرا نام اور دیوبندی تحریک، ولی اللٰہی تحریک ہی کی ایک شکل ہے۔ مدرسۂ دیوبند کی تاریخ کا پہلا دور جو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی وفات (۱۹۰۵ء) پر ختم ہوتا ہے، صرف علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت کے لئے مخصوص رہا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی صدارت میں دارالعلوم کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جبکہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبہ، ہزاروں کی تعداد میں ملک کے گوشہ گوشہ اور بیرون ملک میں بھی پھیل جاتے ہیں، جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم ہوجاتی ہیں اور دارالعلوم کی علمی تحریک وسیع سے وسیع تر ہوجاتی ہے اب وقت آجاتا ہے کہ اکابر سلف کے نقش قدم پر چل کر آزادئ وطن کی جدوجہد کا از سر نو آغاز کیا جائے۔ اور دارالعلوم کے حقیقی مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ حضرت شیخ الہند نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا اور اس کی تکمیل میں آخر دم تک مصروف رہے۔

حضرت شیخ الہند نے انقلاب کا ایک مکمل خاکہ اپنے ذہن میں تیار کیا اور اس کے لئے زمین ہموار کرنی شروع کردی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام آپ نے یہ کیا کہ علمائے دیوبند کی کثیر اور منتشر تعداد کو ایک اجتماعی طاقت کی حیثیت سے منظم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۰۸ء میں اسی غرض سے "ثمرۃ التربیت" کے نام سے فضلا اور بہی خواہان دارالعلوم کی ایک جماعت قائم کی گئی جو ایک عرصہ تک اپنا کام کرتی رہی لیکن بعد میں اس کا کام کچھ سست پڑ گیا، اس لئے ۱۹۰۹ء میں "جمعیۃ الانصار" کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا جس کے ماتحت دیوبندی نظام کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی ساری اجتماعی طاقت منظم ہوگئی۔ اس نظام میں جس طرح ہندوستانی علماء داخل ہوئے، اسی طرح افغانی اور ترکستانی علماء بھی شامل ہوگئے۔

دیوبندی جماعت کی تنظیم کے بعد حضرت شیخ الہند کے پیش نظر دوسرا اہم کام یہ تھا کہ کسی صورت سے علی گڑھ پارٹی کے انقلابی عنصر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جائے،

اور علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے دیرینہ تفرقہ کو ختم کرکے کوشش کی جائے کہ دیوبند اور علیگڑھ پارٹی کے حریت پسند افراد باہم مل کر کام کریں، تاکہ ملت اسلامیہ منظم ہو کر ایک متحدہ قیادت کے ماتحت آزادئ اسلام اور آزادئ وطن کی طرف قدم بڑھا سکے۔ اسی مقصد کے ماتحت حضرت شیخ الہند نے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری اور انگریزی کالجوں کے دوسرے نوجوانوں سے تعلقات پیدا کئے، انہیں اپنا ہم خیال و ہم راز بنایا اور اس طرح آپ کی مساعی سے دیوبند اور علیگڑھ والے ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے اور دونوں مرکزوں کے حریت خواہ افراد نے مل کر اسلامی ہند کی متحدہ قیادت کی بنا ڈالی، اسلامی ہند کی سیاست پر حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی کا یہ کچھ کم احسان نہیں۔

علیگڑھ اور دیوبند کے اس اتحاد کو اور زیادہ مضبوط اور پائدار بنانے کے لئے جمعیۃ الانصار کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی قرار دیا گیا کہ علیگڑھ کے طلبہ دیوبند میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لئے آسانیاں مہیا کی جائیں اور دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ انگریزی پڑھنا چاہیں تو علی گڑھ میں ان کے لئے انتظام ہو۔

حضرت شیخ الہند اپنی انہیں کوششوں میں مصروف تھے کہ ۱۹۱۲ء میں طرابلس و بلقان کے خونین حوادث نے ملت اسلامیہ کو ایک نئی مصیبت سے دوچار اور حضرت شیخ کے قلب مضطر کو اور بھی بے چین و مضطرب کر دیا۔ اس وقت ترکوں کی امداد میں آپ نے پوری جان توڑ کوشش کی، فتوے چھپوائے، مدرسہ کو بند کر دیا، طلبہ کے وفود اطراف ملک میں بھیجے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے چندے کئے اور ایک اچھی خاصی رقم اعانت کے طور پر بھجوائی۔

بلقان و طرابلس کے خونین حوادث کے اثرات ابھی تازہ ہی تھے کہ ۱۹۱۳ء میں جب مسجد کانپور کے سانحہ نے مسلمانان ہند میں ایک عجیب بے چینی اور انگریز دشمنی کا ایک عام

اور شدید جذبہ پیدا کر دیا اور ہر طرف سے آزاد حکومت کے قیام کا مطالبہ ہونے لگا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر جمعیۃ الانصار کے قیام کے ٹھیک چار سال بعد دہلی میں "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک ادارہ قائم فرمایا جہاں نوجوانانِ ہند کو درسِ سیاست دیا جانے لگا۔ حضرت شیخ الہند کے ان تمام کاموں میں مولانا سندھی مرحوم ان کے دست راست تھے۔

دیوبندی جماعت کی تنظیم اور پھر دیوبند اور علی گڑھ کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کر دینے کے بعد حضرت شیخ الہند اپنے انقلابی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے برادرانِ وطن کے اشتراکِ عمل کی بھی ضرورت محسوس کر رہے تھے، چنانچہ راجہ مہندر پرتاب اور ان کی پارٹی کے ساتھ رابطہ اسی نظریہ کا عملی پہلو تھا۔

اندرونِ ملک کی زمین ہموار ہو چکی تھی اور اب انقلابی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے بیرونی ممالک سے روابط و تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت تھی حضرت شیخ الہند اپنی انہیں تدابیر میں مشغول تھے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور برطانوی حکومت نے دولت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ حضرت شیخ الہند کی جماعت، حضرت شاہ اسحاق صاحب کے تتبع میں طبعی طور پر انگریزوں کے خلاف اور ترکوں کے ساتھ تھی اسوقت دولت عثمانیہ کی امداد تو ضروری تھی ہی، اس کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہند کے لئے اپنے انقلابی پروگرام کو اسلامی ممالک کے تعاون سے کامیاب بنانے کا بھی یہ ایک عمدہ موقعہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند نے ایک طرف تو مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان اور آزاد قبائل میں کام کرنے کے لئے بھیجا اور دوسری طرف دولت عثمانیہ سے تعلقات قائم کرنے کے لئے جو انقلابی پروگرام کی تکمیل کے لئے ازبس ضروری تھا، خود سفر حج اختیار کیا۔

کابل پہنچ کر مولانا سندھی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ادھر حضرت شیخ الہند نے مکہ معظمہ پہنچ کر، غالب پاشا (گورنر مکہ) سے اور پھر مدینہ منورہ میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں

کیں"اپنی اسکیم ان کے سامنے رکھی اور تمام معاملات طے ہو گئے۔

اس کے بعد آپ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ اور پھر مکہ معظمہ سے طائف پہنچے اور چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جلد از جلد استنبول پہنچنے کی صورت نکالیں کہ اسی اثناء میں شریف کی بغاوت کا واقعہ پیش آ گیا اور حضرت شیخ مع اپنے رفقاء کے ایک عرصہ کے لئے طائف میں گھر کر رہ گئے اور بمشکل تمام مکہ پہنچے تھے کہ حکومت برطانیہ کو آپ پر شبہ ہو گیا اس نے اپنا مجرم قرار دے کر آپ کو مع رفقاء کے شریف حسین سے طلب کر لیا۔ شریف حسین کی برطانیہ سے دوستی ہو ہی چکی تھی، پھر اسے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کی طرف سے، اس بنیاد پر کہ آپ نے ترکوں کی تکفیر کے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا، کافی بدگمان اور بددل کر دیا گیا تھا چنانچہ اس نے بڑی خوشی سے حکم نافذ کر دیا کہ "ہندی عالم اور ان کے رفقاء جدہ بھیج کر افسران برطانیہ کی حفاظت میں دیدئے جائیں۔" بالآخر اس حکم کی تعمیل ہوئی اور حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کو اونٹوں پر سوار کرا کر مسلح گارد کی حفاظت میں جدہ روانہ کر دیا گیا۔ جدہ سے کچھ دن کے بعد ان حضرات کو جیزہ (متعلقات قاہرہ) کے سیاسی جیلخانہ میں پہنچا دیا گیا، جہاں حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کے باری باری بیانات لئے گئے۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ پھانسی کا حکم ہو گا مگر بظاہر ثبوت فراہم نہ ہو سکا اس لئے پھانسی سے نجات ملی اور مالٹا میں نظر بند کئے جانے کا فیصلہ ہوا۔

حضرت شیخ الہند کی یہی انقلابی اسکیم ہے جسے گورنمنٹ کے کاغذات میں "ریشمی خطوط کی سازش" کا نام دیا گیا ہے۔ آپ کی اسکیم قطعی طور پر کامیاب تھی، مگر افسوس کہ عربوں کی بغاوت اور جرمنی کی اچانک شکست نے اسے ناکام بنا دیا۔ واقعہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد "حزب ولی اللہ" کی یہ تیسری انقلابی کوشش تھی جو بالآخر ناکام ہوئی لیکن اس ناکامی کا نتیجہ مایوسی اور پست ہمتی نہ تھا بلکہ حالات کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد نئے حوصلہ اور نئی امنگ کے ساتھ ایک نئے اقدام کا عزم بالجزم۔

چنانچہ حضرت شیخ الہند (مئی ۱۹۲۰ء) میں مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے تو اپنے ساتھ ایک نیا سیاسی پروگرام لائے جو ممالک اسلامیہ کے مفاد، ملکی حالات اور بین الاقوامی سیاست کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ تمام حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد حضرت شیخ الہند اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اب جبکہ جنگ عظیم میں دولت عثمانیہ کی شکست کے بعد کوئی بین الاقوامی اسلامی مرکز باقی نہیں رہا اور اسلامی ممالک کے تعاون سے ملک کو آزاد کرانے کی پالیسی ناقابل عمل ہو چکی ہے، آزادئ وطن کی صرف ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی ممالک کی سیاست سے علیحدگی اختیار کر کے ہندوستان کو اپنی توجہات کا تمام تر مرکز بنایا جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ملک کو غلامی کے پنجے سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے اپنی جماعت کے سامنے جو پروگرام رکھا اس کے اہم اجزا یہ تھے:-

(۱) دیوبندی اور علیگڑھ پارٹی مل کر کام کرے۔

(۲) انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی جائے اور بیرونی ممالک کی سیاست سے علیحدگی اختیار کی جائے۔

(۳) دیوبندی جماعت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور مولانا محمد قاسم کی حکمت عملی کو عملی زندگی کا اساس بنائے۔

اس طرح آپ نے اسلامی ہند کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف لائے تو ملک میں ہندو مسلم اتحاد اور انگریز دشمنی کی ایک عام فضا پہلے ہی سے پیدا ہو چکی تھی اور گاندھی جی اپنی ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر چکے تھے۔ آپ کی تشریف آوری اور سیاسی سرگرمیوں نے اس تحریک میں جان ڈال دی، تحریکِ ترکِ موالات پورے زور شور سے چل پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک ایسا منظر نگاہوں کے سامنے آیا جسے دوبارہ دیکھنے کے

لئے لوگ ابتک ترستے ہیں۔

لیکن یہ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ آپ مالٹا سے تشریف لائے تو مرض الموت کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور ابھی آپ کی تشریف آوری کو پورے سات ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۳۰ رمارچ ۱۹۲۱ء کو ملک آپ کی رہنمائی اور قیادت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

آپ کے اس غیر معمولی جوش عمل، ہمت و استقلال اور جذبۂ حب قومی کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ علالت کی خطرناک منزل اور نقاہت کی انتہائی کیفیت میں آپ مبتلا ہیں لیکن پھر بھی سیاسی اور علمی سرگرمیوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اسی شدید علالت اور انتہائی نقاہت کے عالم میں ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڈھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح اور انتقال سے صرف آٹھ روز پہلے دہلی میں جمعیۃ العلماء کے دوسرے سالانہ اجلاس کی صدارت فرماتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح، درحقیقت حضرت شیخ الہند کی آخری زندگی کا ایک ایسا اہم اور عظیم الشان کارنامہ ہے جو بلاشبہ ہماری قومی و ملی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ آپ کی نگاہِ دوررس نے اس حقیقت کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ سیاسی آزادی کے نصب العین میں پوری کامیابی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جبکہ اس کی پشت پر آزاد اور قومی نظام تعلیم کی ایک مستقل اور مستحکم طاقت موجود ہو، اسی لئے آپ نے سیاسی آزادی کی تحریک کی قیادت کے ساتھ ساتھ تعلیمی آزادی کی تحریک کی بھی پرزور حمایت کی اور اسی جذبہ کے ماتحت، شدید علالت اور انتہائی نقاہت کے باوجود آپ ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند سے علیگڑھ پہنچے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا اور اس طرح علی گڑھ اور دیوبند کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کر دینے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں، ان دونوں کا ایک تعلیمی سنگم بھی قائم کر دیا، تاکہ یہ سنگم ان

دونوں طبقوں کی وحدت کو ایک مستقل اور پائدار شکل دے سکے ۔

حضرت شیخ الہند کے ذہن میں آزاد تعلیم اور صحیح اسلامی تعلیم کا جو بلند تصور تھا اور آپ نے جن مخصوص جذبات اور جن دلی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ جامعہ ملیہ کا افتتاح کیا تھا، اس کا اندازہ اُس شاندار اور تاریخی خطبۂ صدارت سے کیا جا سکتا ہے، جسے آپ کی علالت و نقاہت کی بنا پر، مولانا شبیر احمد عثمانی نے آپ کی طرف سے جلسۂ افتتاح میں پڑھ کر سنایا تھا۔ خطبہ کے بعض اہم اجزا، درج ذیل ہیں، جن سے آپ کے ان تعلیمی تصورات اور مخصوص جذبات پر روشنی پڑتی ہے :-

(۱) میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا، حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیئے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاع قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں، کوئی حقیقت نہیں رکھتی ۔"

(۲) اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں)، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں

<u>دیوبند اور علیگڑھ کا رشتہ جوڑا</u> ۔۔۔۔۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اُس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتوےٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے، کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں، یا حکومتِ وقتیہ کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔
(۳) "مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ضرورت اسکی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، اور اغیار کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو، کیا باعتبار عقائد و خیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثر سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں میں غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور اُن عظیم مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے"۔
(۴) ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں

جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع
سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور
ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے
تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ
ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائیگا
جو گورنمنٹ کی اعانت اور اُس کے اثر سے بالکل علیحدہ اور جس کا نظام عمل
اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔"

حضرت شیخ الہند ہم سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن آپ کے بتائے ہوئے
نشان راہ اب بھی ہمارے سامنے موجود ہیں، آپ نے اپنی قوم میں انقلاب و آزادی
کی جو روح پھونکی تھی وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، "دارالعلوم دیوبند، اور اس کی صدہا
شاخوں میں اب بھی جلوہ ریز ہے؛ اور

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

محمد عرفان نوری

محمد علی بانیٔ جامعہ

محمد علی اپنی زندگی بھر کچھ نہ کرتے صرف جامعہ ہی کی بنیاد ڈال جاتے تو یہی ایک کارنامہ سرمایۂ عمر ہونے کے لئے کافی تھا ـــــ اللہ کا وہ شیر تو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر دھر کے دنیا سے اٹھا۔

ہائے کیا زمانہ وہ سنہ ۱۹۲۰ء کے آخر اور ۱۹۲۱ء کے نصف اول کا تھا! کتنا جوش و خروش! اخلاص تھا کہ سینوں سے اُبلتا ہوا، اُمنڈتا ہوا۔ ایثار تھا کہ عہدِ صحابہ کا نمونہ دنیا کو ایک بار پھر دکھا رہا تھا۔ بوڑھے، جوان، بچہ، مرد، عورت سب اپنے اپنے رنگ میں مست! "کل کی فکر میں آج" کو تجے ہوئے "آجل" کے خیال میں "عاجل" کو بھولے ہوئے چھوڑے ہوئے ـــــ محمد علی ان دیوانوں سرفروشوں کے لشکر کا سردار۔

تلقین یہ شروع کی کہ ایسی خدا فراموش و مذہب دشمن حکومت جو خلافت اسلامیہ سے برسرِ پیکار رہو، اُس سے اور اُس کے ملحق اداروں اور محکموں سے کسی طرح کا تعلق جائز نہیں۔ اُس کے عہدے، اُس کے منصب سب بحکم عطائے تو بلقائے تو" اُس کی طرف قابل واپسی۔ پھر سرکاری اور نیم سرکاری تعلیم جو ان سارے تعلقات کے لئے سنگ بنیاد ہے وہ تو بدرجۂ اولیٰ قابل ترک و لائق احتراز، تو اب مسلمانوں کے بچے کریں کیا؟ کریں یہ کہ

"ایں سررشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد"

اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں ـــــ نصاب اپنا ہو، استاد اپنے ہوں، تعلیمی ماحول اپنا ہو۔

پیام لے کر رخ پہلے علی گڑھ کا کیا کہ وہیں کے یہ ساختہ پرداختہ تھے اور وہی اُن کا سب سے بڑا امید گاہ تھا۔ پیام سہل اور معمولی نہ تھا، ایک مستقل انقلاب کی دعوت تھی۔ اور انقلاب کا رجز کن کانوں کو خوشگوار معلوم ہوا ہے؟ لڑکوں میں چند سعید روحوں نے بڑھ کر لبیک کہا، باقی ہر طرف سے انکار و ملامت ہی کے آوازے بلند ہوئے ـــــ محمد علی جس علی گڑھ کو اپنا سمجھ رہے تھے، اُس سے پولیس کے ڈنڈوں اور سنگینوں کے سائے میں نکالے گئے

داستان بڑی طویل اور دردناک ہے۔ حالات کا اندازہ کرنے کے لئے اُس وقت کے اخبارات کے فائلوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ علی گڑھ کے متضاد تاروں سے روزناموں کے کالم کے کالم لبریز ہوتے تھے۔ کم تر کوئی مصیبت تھی جو محمد علی اور ان کے جواں ہمت رفیقوں کو جھیلنی نہ پڑی ہو۔ رسم افتتاح کے لئے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا وجود مقدس ہاتھ آگیا۔ اور بے سروسامانی کے اُسی عالم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہو گئی وہی جامعہ جس نے ایک فرزند رشید ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی صورت میں پیدا کر دیا۔

کلاسیں درختوں کے چھاؤں میں ہونے لگیں، لڑکوں کے رہنے سہنے کے لئے خیمے نصب ہو گئے۔ محمد علی سب ہی کچھ تھے۔ چندہ بھی لائیں۔ پرنسپلی کے فرائض بھی انجام دیں۔ اُستادوں کا انتخاب بھی کریں۔ نصاب درس بھی ہر مضمون کا شروع سے کریں۔ اسے تنہا مرتب کریں! ـــــ عین اُس عالم میں جب ذرا سے بھی سکون سے سانس لینے کی نوبت آئی، اس نیاز کیش کو جس کی شہرت چند روز قبل تک پورے ملحد ہونے کی تھی، اور یہ تھی جنوری ۱۹۲۱ء میں خط لکھا کہ فلسفہ کی پروفیسری کی جگہ تمہارے لئے روکے ہوئے ہوں لیکن مذہب، علم سے زیادہ عزیز

ہے اس کی طرف سے اطمینان دلادو تو بے تکلف چلے آؤ" خط کی اصل عبارت مکتوبات محمد علی وغیرہ کے سلسلہ میں بار بار چھپ چکی ہے۔ یہ محض خلاصہ درج ہوا!

اس عرض سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ محمد علی کو مذہب کس درجہ عزیز تھا اور وہ ہر معاملہ کو مذہب ہی کی عینک سے دیکھنے کے کس قدر عادی تھے حقیقتاً وہ مذہبی دیوانے تھے انھیں غلط سمجھا اُس نے جس نے انھیں سیاسی فرزانہ خیال کیا۔ جامعہ قائم کرنے سے اُن کی پہلی غرض یہ تھی کہ یہاں سے دین وملت کے سنجیدہ خدمت گزار پیدا ہوں اور ضمناً ملک ووطن کی خدمت بھی ہو جائے۔

پائنیر نے جو اس وقت تک تمام تر انگریزی ہاتھوں میں تھا، مولانا کی زندگی ہی میں ایک مضمون ان پر لکھا تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ ہندوستان کا وہ ذہین اور طباع شخص ہے جو کوئی تعمیری کام اپنی یادگار نہیں چھوڑے جا رہا ہے —— اس خیال کی تردید کے لئے جامعہ ملیہ کا وجود بالکل کافی ہے —— جو ایسی سعید اولاد چھوڑ جائے اُسے یہ کہنا کہ وہ لاولد اُٹھ گیا، کیسی صریح زیادتی اور ظلم ہے!

عبدالماجد دریابادی

جوہر بھی یاد ہے؟

باطل کے سامنے نہ جھکا جو تمام عمر
ہندوستاں تجھے وہ قلندر بھی یاد ہے؟

بجلی تھا جس کا ذہن نظر تیغ تیز تھی
آئینۂ حرم کا وہ جوہر بھی یاد ہے؟

تقریر میں وہ سیلِ کہستاں کا سا جلال
تحریر میں وہ طنز کا نشتر بھی یاد ہے؟

افکار میں وہ لذّتِ عرفان و آگہی
اشعار میں وہ بادہ و ساغر بھی یاد ہے؟

پُرسوز، لالہ کار، جنوں پیشہ، دلنواز
ہر رزم و بزم کا وہ شناور بھی یاد ہے؟

اس خاکداں میں جس کی سمائی نہ ہو سکی
طغیانِ شوق کا وہ سمندر بھی یاد ہے؟

تخریب جس کی باعث تعمیر نو ہوئی
وہ بت شکن بھی یاد ہے، بت گر بھی یاد ہے؟

جھوٹے نگوں پہ جان جو دیتے ہیں اے سرورؔ
پوچھو یہ اُن سے کیا کوئی جوہر بھی یاد ہے؟

مولانا محمد علی مرحوم

(سب سے پہلے شیخ الجامعہ)

مولانا محمد علی مرحوم

اور

جامعۂ ملیّۂ اسلامیہ

مولانا محمد علی مرحوم مسلمانانِ ہند کی اُن چند ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ پر ایک گہرا نقش ثبت کیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی سیاست شاعری علم و ادب صحافت اور تعلیم پر وہ کافی اثر انداز ہوئے ہیں۔ مولانا محمد علی فطرت کے اُن چند منتخب افراد میں سے تھے جنھیں وہ غیر معمولی دل و دماغ کی صلاحیتیں دیتی ہے۔ وہ جس شعبۂ زندگی میں بھی رہے ایک کامیاب انسان رہے۔ اور وہ جہاں بھی رہتے ان کی عظیم الشان شخصیت سب پر حاوی ہوجاتی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اُن کا دل اُن کے دماغ پر غالب آتا گیا حتیٰ کہ ملت اسلامیہ کے عشق میں ان کی حالت مجنوں کی سی ہوگئی۔ اس جنوں کے باعث انھوں نے زمانہ سے ایک لڑائی مول لی۔ وہ حق کے لئے سینہ سپر ہوکر ہر کسی کے خلاف ڈٹ گئے۔ انتہائی علالت کی حالت میں وہ کشاں کشاں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ وہاں ہندوستان کی آزادی کا رندانہ نعرہ بلند کیا اور بالآخر عالم اسلام کا یہ عظیم مجاہد بیت المقدس کی روحانی خاک میں ہمیشہ کے لئے مدفون ہوکر اپنے رب کے قریب ہوگیا

ہر بڑا انسان اپنے قومی تمدنی ورثہ سے وہ سب کچھ حاصل کرسکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے اسلامی تمدن سے اس کے بہترین عناصر کو اخذ کیا۔ ان کی تعلیم مغربی ماحول میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے اپنے شوق سے قرآن، تفسیر، حدیث تاریخ اسلامی، علم الکلام وغیرہ جیسے اسلامی علوم پر بہت جلد عبور حاصل کرلیا۔ پھر انھوں نے اس

تمدنی ورثہ کے اکتساب پر ہی قناعت نہ کی بلکہ اسے پرکھا اور اس خس و خاشاک کو جو اس میں امتدادِ زمانہ کے باعث جمع ہو گیا تھا دور کرنے کی کوشش کی۔ مولانا محمد علی نہ صرف جذباتی حیثیت سے بلکہ عقلی غور و فکر کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلام انسانیت کی نشو و نما کے لئے سب سے بہترین نسخہ ہے اسی پر عمل کر کے نہ صرف مسلمانانِ عالم بلکہ تمام دنیا اپنی مادی اور روحانی نجات حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت خلوص اور جوش کے ساتھ اس پیغام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مولانا کی آخری زندگی کی مذہبی کیفیت کو دیکھ کر لوگ انھیں مُلا کہنے لگے تھے لیکن وہ اس پر فخر کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہی طرزِ فکر اور طرزِ زندگی سب سے بہتر تھا۔ اسلامی تمدن سے وابستگی کے لئے آخری عمر میں انھوں نے عربی لباس بھی اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح مولانا باطنی اور ظاہری دونوں لحاظ سے تمدنِ اسلامی کے بہترین مظہر بن گئے تھے۔

دین و دنیا کی ہم آہنگ نشو و نما جن اصولوں کی بنیادوں پر تمدنِ انسانی کی بقا، اصلاح اور نشو و نما چاہتے تھے انھی اصولوں کو وہ انسانی تعلیم کا مقصد قرار دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے مسلمانوں کی اس قرآنی دعا کو تعلیم کا مقصد قرار دیا کہ

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً

دنیا و دین کی فلاح، مادہ اور روح کی ہم آہنگی، جسمانی اور روحانی قویٰ کی نشو و نما چنانچہ تعلیم کا مقصد قرار پایا لیکن دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ وہ مقصدِ کلی یعنی دینی مقصد کے ماتحت ہو۔ جز ہمیشہ کل کا تابع رہے۔ انسان کی ابدی زندگی اس کی مخالف زندگی کے مقصد کو متعین کرے۔ چنانچہ تعلیم کا مقصد ہوا کہ

از کلید دیں در دنیا کشاد

مذہبی تعلیم کو غرضکہ ہر تعلیم کی اساس ہونا چاہیے۔ خصوصاً ملتِ اسلامیہ کی آئندہ نسلوں کی

تعلیم تو روحانی اساس کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

لیکن مذہبیت اور روحانیت کے معنی ترک دنیا کے نہیں ہیں بلکہ یہ ہیں کہ اس روح کو بہتر طریقہ پر دنیاوی امور میں کار فرما کیا جائے۔ چنانچہ دنیاوی امور کی تعلیم ضروری ہے خاندانی، وطنی، ملی اور انسانی فرائض کی ادائگی کا احساس تعلیم کا لازمی جزو ہونا چاہئے۔

اس کے ساتھ ہی انفرادی مادی زندگی کی بقا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ معاش کا مسئلہ تعلیم میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کسب حلال انسان کے لئے ضروری ہے [illegible] بھی ہونا چاہیئے کہ وہ طالب علموں کو اس کے لئے تیار کرے۔

مولانا محمد علی محمد معنیٰ میں ایک مدرس نہ تھے لیکن وہ ایک عظیم الشان مفکر تھے اس لئے ایک انسانی معلم بھی تھے۔ ان کے پیش نظر انسانی تعلیم کے یہ تینوں ضروری عناصر موجود تھے۔ انھوں نے شروع میں کوشش کی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جہاں کی وہ تخلیق تھے اور جس سے انھیں بے انتہا محبت تھی ان مقاصد تعلیم کو قبول کرے اور ان کی روشنی میں خود کی زندگی میں انقلاب پیدا کرے۔ لیکن رجعت پسند طاقتوں کے مقابلہ میں انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی چنانچہ بالآخر ایک نئی اسلامی جامعہ کا مولانا شیخ الہند مرحوم کے ہاتھوں علی گڑھ کی جامع مسجد میں افتتاح کرایا گیا اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعہ مولانا محمد علی مرحوم اور دیگر اکابر اسلام مسلمانان ہند کی ملی اور اسلامی احیا چاہتے تھے۔ چنانچہ شروع ہی میں ان مقاصد کو نہ صرف مولانا محمد علی مرحوم نے بلکہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے واضح کر دیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مقاصد

چنانچہ مولانا محمد علی مرحوم ہمدرد کے [illegible] میں تحریر فرماتے ہیں کہ

" جامعہ کا ہمیشہ سے ایک خاص معین مقصد ہے اور وہ خود اس قدر جامع اور صاف ہے کہ اس کی تشریح و تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے پیش نظر جو مقصد

رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے بچے خدا پرست مسلمان اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں

مولانا مزید تحریر فرماتے ہیں کہ "جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قایم کیا اور تلامذہ کے قوائے داخلی کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو ہر گز پسند نہ کیا خواہ تعلیم دنیوی ہو یا دینی اس کی مثال شل المحار ہو جائے اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست اور حریت پرور ہندوستانی بنایا جاوے"

فطری نشو ونما کا اصول

مولانا محمد علی کو اس کا پورا احساس تھا کہ تعلیم کا مقصد انسانی ذہن میں اشیا کے علم کا ٹھونسنا نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی داخلی امکانی قویٰ کی بتدریج نشو ونما ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"نباتات اور انسان جمادات کی طرح غیر ذی روح نہیں ہیں جس کا ارتقار خارجی ہوتا ہے یعنی ترقی نہیں ہوتی۔ محض ازدیاد یا بڑھوتری ممکن ہے۔ خلاق عالم نے نباتات اور حیوانات میں خود نمو کا انتظام فرما دیا ہے اور داخلی ترقی کا سامان خود ان میں فراہم کر دیا ہے"

اس بنا پر مولانا مرحوم طلبار میں جامد تقلید کا مادہ پیدا نہ کرنا چاہتے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ وہ خود قرآن اور حدیث کا علم حاصل کریں اور اسلام کے روحانی سرچشموں سے خود بلا واسطہ فیضیاب ہوں۔ وہ تقلید جامد کو مسلمانوں کے ذہنی اور علمی زوال کا سبب خیال کرتے تھے اور عام مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دلا کر ان کو اس ذہنی غلامی سے نجات دلانے کے قائل تھے۔

اسلام کی تعلیمات کو مولانا چونکہ تمام تعلیم انسانی کی اساس سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب میں اسلامی مذہبی تعلیم کو اساس قرار دیا اور قرآن و حدیث ضروری فقہ اور قدرے عربی زبان کی تعلیم کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ابتدائی جماعتوں سے

اعلیٰ
دے کر جامعہ کی تعلیم تک ایک لازمی مضمون قرار دیا۔

سائنس اور پیشہ کی تعلیم کی ضرورت جامعہ کے تعلیمی نصاب میں مولانا نے دنیاوی ضروریات کے لئے دیگر مضامین کو شامل کرنا بھی ضروری سمجھا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"جامعہ کی تعلیم میں دوسری طرف مسلمانوں کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد کے مُلّا ہوتے تھے یا سرکاری دفتر کے کلرک، جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی دروازہ ان پر بند نہ ہو۔ ادب اور تاریخ، فلسفہ اور سائنس کے ذریعے وہ سارے عالم کو اپنا جولانگاہ بنا سکیں"

جامعہ کی تعلیم کا مقصد مسلمان طلبا کو اپنی روزی کمانے کے قابل بھی بنانا ہے چنانچہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں "طلبا نے مذہبی تعلیم حاصل کر لی، ذہنی اور دماغی نشوونما بھی ہوگیا ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیش نظر رکھا گیا تھا کہ وہ اپنی روزی خالص دماغی کام کے ذریعہ ہی سے کمانے پر مجبور نہ ہوں۔ کوئی پیشہ ایسا بھی اختیار کر سکیں جس میں محض جسمانی محنت سے روزی کمائی جا سکے اور جس میں بڑے سرمایہ کی حاجت نہ ہو، مثلاً نجاری، قفل سازی، پارچہ بافی وغیرہ"

غرضیکہ مولانا محمد علی مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی نصب العین کو جن عناصر سے ترکیب دیا تھا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اسلام اور اس سے وابستہ مذہبی علوم کی تعلیم خصوصاً قرآن پاک کی تعلیم۔
(۲) آزادی وطن کے پاک جذبہ کی تربیت اور نشوونما۔
(۳) علوم و فنون تاریخ، فلسفہ، ہیئت اور سائنس کی تعلیم
(۴) معاش کے لئے ضروری فن کی تعلیم۔

مادری زبان میں تعلیم مولانا طالب علموں کی اچھی تعلیم کے لئے یہ ضروری خیال کرتے تھے کہ ذریعہ تعلیم ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ جماعتوں تک مادری زبان ہو۔ چنانچہ وہ اس مسئلہ پر نہایت جوش سے لکھتے ہیں کہ

"ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر ثابت نہیں ہوتی جس قدر کہ ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرقی نوروحشی لوگ ہیں اور بربریت میں مبتلا ہیں لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں کا کیا شعار ہے! کیا کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ یا سائنس فرانسیسی یا جرمن زبان میں پڑھواتا ہے! کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی انگریزی یا روسی زبان میں سکھواتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور اب ہماری غلامانہ ذہنیت کو دیکھ کر ہمارے اسکول اور کالجوں کے ہندوستانی اساتذہ بھی جو اکثر انگریزی زبان کو خود بھی اس طرح نہیں جانتے ہیں جس طرح کہ انگریز جانتے ہیں۔ ہندوستانی بچوں کو تاریخ اور سائنس جغرافیہ اور ریاضی انگریزی زبان میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مولانا نے شروع ہی سے اردو کو جامعہ کے تمام درجوں میں ذریعہ تعلیم قرار دیا چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ کے طلبا نے بہتر طریقہ پر مضامین کو اخذ بھی کیا اور اس تعلیم کے لئے ان کو وقت بھی نسبتاً کم صرف کرنا پڑا۔

نظریہ اور عمل مولانا محمد علی ایک انتہائی باعمل انسان تھے۔ چنانچہ صرف نظریوں سے انھیں دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ تعلیم میں بجا طور پر عمل پر زور دیتے تھے اخلاقی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ اخلاقی خوبیوں پر وعظ کئے جائیں بلکہ اساتذہ خود ان اخلاقی اوصاف سے متصف ہوں۔ وہ اپنی اخلاقی اور روحانی زندگی سے مدرسے کے ماحول کو اخلاقی اور روحانی بنا دیں تاکہ اس ماحول میں زندگی گذارنے ہی سے طلبا با اخلاق خدا پرست، ملت پرور اور وطن دوست ہو جائیں۔ مولانا محمد علی کی خود زندگی سراپا عمل تھی۔ وہ خود بذاتہٖ اُن تمام خوبیوں کے بدرجہ اتم حامل تھے جو وہ اپنے طالب علموں میں

پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جس کسی نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا وہ خود بہت حد تک ان خوبیوں کا حامل ہو گیا۔

انھیں کی تربیت یافتہ ایک جماعت نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک اسلام کی صحیح روح پھونکی اور اہل ملک کو جہاد آزادی کے لئے آمادہ کیا۔ انھوں نے علی گڑھ کے فیشن پرستوں کو موٹے گاڑھے کا عادی بنا دیا۔ مذہب اور آزادی کے لئے ہر قسم کی مالی اور جانی قربانی کا جذبہ انھوں نے اپنے ساتھیوں میں بدرجہ اتم پیدا کر دیا انھیں کی تربیت یافتہ دوسری جماعت نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بقا اور نشو و نما کے کام کو اپنے ذمہ لے لیا اور بالآخر اس کو مسلمانوں کی ایک عظیم الشان درسگاہ بنا دیا۔

مولانا محمد علی آخر عمر میں اپنے دیگر ملی اور قومی کاموں کے باعث جامعہ ملیہ اسلامیہ کے روز مرہ کے کاموں میں حصہ نہ لے سکے اور ان کے جیسے عظیم مفکر وسیع الخیال اور وسیع العزم سیاست داں کے لئے یہ ممکن بھی نہ تھا کہ وہ خود کو صرف ایک تعلیمی درسگاہ میں محدود کر دیتا ان کی جولانگاہ وسیع تھی ... ان کو نہ صرف ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی قیادت کا فرض ادا کرنا تھا بلکہ غیر مسلموں کی بھی جہاد آزادی میں راہ نمائی کرنی تھی۔ وہ ان فرائض کو آخر وقت تک نہایت جانسوزی، بے باکی اور خلوص سے انجام دیتے رہے حتیٰ کہ انھیں فرائض کی ادائگی نے ان کی صحت کو تباہ کر دیا اور بالآخر وہ غم قوم و ملت میں گھل گھل کر شہید ہو گئے۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (ختم تمہید)

انھوں نے دنیا کو سبق دیا کہ تعلیم کے اصل معنیٰ کیا ہے۔ سوز زندگی ہے، عشق، ملت اور انسانیت ہے۔ وہ اس شعر کی زندہ تفسیر تھے۔

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دل گرمے نگاہ پاک بینے جان بے تابے

مولانا محمد علی مرحوم انسانیت کے لئے عمل کا سب سے بہتر نمونہ حضور اکرم صلعم کی

ذات بابرکات کو سمجھتے تھے ۔ چنانچہ ان کا ایمان راسخ تھا کہ صحیح تعلیم وہ ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے اور صحیح اسوہ حسنہ وہ ہے جو محمد رسول اللہؐ کا اسوہ ہے ۔ چنانچہ ان کا ایک شعر ہے ۔

ہو محمد کیوں نہ قرآں اور بھی ہم کو عزیز
اس میں خود تیری جو جیتی جاگتی تصویر ہے (جوہر)

مولانا محمد علی نے مغربی تہذیب و تمدن کی گود میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اپنی ذہانت اور طباعی سے وہ اسلامی تمدن اور تعلیم کی تہ تک پہنچ گئے اور بالآخر اسے انھوں نے تمام دنیا کے لئے بہترین تعلیمی نسخہ قرار دیا ۔ ان میں احساس کمتری نام کو بھی نہ تھا بلکہ انھیں اپنی ملی روایات پر فخر تھا ۔ وہ ایک بہادر انسان تھے اس لئے بہادروں جیسی زندگی انھوں نے گزاری ۔ وہ مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود اور اس کی بقا اور نشو و نما کے قائل تھے چنانچہ تمام عمر انھوں نے اس کے لئے جد و جہد کی ۔ لیکن وہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے بھی مخالف نہ تھے بلکہ چاہتے تھے کہ وہ جہاد آزادی میں ہم سفر ہوں ۔

غرضیکہ مولانا محمد علی نے اپنی تحریر و تقریر اور اپنے عمل سے مسلمانان ہند کے سامنے نہ صرف ایک صحیح تمدنی و تعلیمی نصب العین پیش کیا بلکہ اپنی اخلاقی خوبیوں اور اپنی مسلسل قربانیوں سے اس نصب العین کو ایک زندگی بھی بخش دی ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بہت حد تک ان خوبیوں کو باقی رکھا ہے ۔ وہ جس وقت تک مولانا محمد علی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے گی وہ اس وقت تک دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گی ۔

(قاضی عبدالحمید زبیری)

حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری

زندگی کی شام کے دھندلکے میں ماضی کتنی دور ہو جاتا ہے مستقبل سے! یادگاری کی بھاگتی ہوئی پرچھائیاں کتنی دور نظر آتی ہیں!

میرا ماضی جن شخصیتوں سے بہت قریب رہا وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکیں پھر بھی دل و دماغ کی فضا میں اب بھی گویا صبح صادق کے دو چار ستارے ہیں جو ان ہی محبوب روحوں کے نور سے فروزاں ہیں۔ زندگی کی گذری ہوئی نصف صدی کی بہت سی پرچھائیاں اڑتی چلی جاتی ہیں! لیکن جب کوئی دوست اجمل خاں یا انصاری یا محمد علی کا نام لے کر کہتا ہے کہ افسوس! کیسے بڑے لوگ تھے وہ اور کس قدر بے وقت رخصت ہو گئے تو میں چلّا اٹھتا ہوں کہ وہ مرے نہیں۔ وہ تو زندہ ہیں! وہ تو آج بھی میرے پاس ہیں —— میری محبت کے تصورات میں میرے خیالات کے محلوں میں وہ ہر لمحہ زندہ ہیں۔ خاک و باد و آب و آتش کی عنصری دنیا میں اجمل خاں اور انصاری کے مزاروں سے دور —— بہت دور —— حقیقی زندگی کی پہنائیوں میں —— مجھے تو آج بھی یہ دونوں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے

وہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں وہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں!

عمر کی جتنی زیادہ منزلیں طے ہو جاتی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ سے ہر روز زیادہ قریب آ رہے ہیں!

جامعہ کی تاسیس کا وہ زمانہ مجھے یاد ہے جب علی گڑھ میں —— کبھی تصدق مرحوم کے

گھر میں۔ کبھی عبدالمجید خواجہ کی کوٹھی میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کے یہ تینوں بانی اور معمار جمع ہوتے
تھے ——— محمد علی کا مجاہدانہ جوش ضد کرتا تھا کہ نہیں جامعہ کو تو قومی تحریک کے لئے رضاکاروں
کے تیار کرنے کا ایک مرکز بنایا جائے اور اجمل خاں اور انصاری کہتے تھے کہ تعلیم کے قدیم
سرکاری مسلک سے یہ انحراف جس نے جامعہ کی صورت اختیار کی ہے مستقل اور پائدار ہونا چاہیئے
کیا کیا مباحثے اور فریقین کے استدلال کی کیا کیا کشمکش اُن ہفتوں اور مہینوں میں جاری رہی!
بالآخر مسلم نوجوانوں کی ایک نئی نسل کا یہ سانچہ تیار ہوا اور پہلے ہی دن سے "حکیم صاحب" اور
"ڈاکٹر صاحب" اور خواجہ صاحب نے اس کشتی کے پتوار اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ کاغذ کی
یہ کشتی ——— ارادوں اور تمناؤں کی یہ ناؤ، جو اوس زمانہ کے طوفانی سمندر میں ڈالی گئی ———
رفتہ رفتہ لکڑی اور لوہے کی کشتی بن گئی اوس کے ٹوٹے ہوئے پتواروں اور بادبانوں کے بجائے
رفتہ رفتہ نئے بادبان اور نئے پتوار اس ناؤ کو میسر آئے اور تحریک خلافت اور تحریک ترک
موالات کی کشاکش سے نکل کر بالآخر نوجوان ملاحوں کا قافلہ ایک ایسے بندرگاہ تک پہنچ گیا جہاں سے
اب ہر سال مسلمانوں کی ایک نئی نسل علم و عمل کا پیام لیکر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل رہی ہے
کسی زمانہ میں یہ خصوصیت علی گڑھ کی تھی کہ اوس سے علم کا فیض حاصل کرنے والے عمر بھر
اپنے مرکز کی مشترک محبت میں ایک دوسرے سے وابستہ رہا کرتے تھے۔ علی گڑھ کی قدامت
پرستی اور استبداد سے شکست کھا کر ——— یہ شکست ہی ان شکست کھانے والوں کی فتح تھی!
——— جب یہ چند مجاہد اپنی ملت کی نئی نسلوں کے لئے نئے سانچے تیار کرنے کا عزم لے کر
نکلے تو اپنے ساتھ علی گڑھ کی وہ سب سے بڑی خصوصیت بھی لیتے آئے! چنانچہ آج جامعی
برادری ملک کے ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی ہے اور جہاں بھی جایئے اس برادری کی یگانگت
ہر قسم کی اجنبیت کو دور کر دیتی ہے۔ برگد کی شاخیں جس طرح جڑیں بنکر زمین پر پھیلتی ہیں اسی طرح
جامعہ نے اپنی ایک دنیا آباد کرلی ہے ——— یہ دنیا ایک بڑے امتحان سے گزر چکی اور
ابھی ایک عظیم تر جد و جہد سے گذرنے والی ہے۔ اوس کے مخلص کارکنوں نے اپنے جسم و جان

کی قربانیوں سے جامعہ کو محض ایک مدرسہ یا جامعہ بنانے کے بجائے ایک ایسی قومی تحریک بنا دیا
جو ملک کی بیداری کی ہر آواز سے ہم آہنگ ہے!

اگر مرنے کے بعد بھی گذرے ہوئے محبوبوں کی روحیں ہمارے درمیان موجود رہتی ہیں
—— اور مجھے تو یقین ہے کہ وہ رہتی ہیں —— تو آج اجمل خاں، انصاری اور محمد علی کی پاک
روحیں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ایثار پیشہ شرکائے کار کے غریب خانوں پر ہر روز محبت اور شفقت کے
پھول برساتی ہوں گی کہ ملت کے ان رضاکاروں نے ان مجاہدین کے خون جگر کے ان تمام قطروں
کو جو جامعہ کی تکمیل پر صرف کئے گئے تھے جان سے زیادہ عزیز رکھا اور ہندوستانی مسلمانوں کی
تھکی ہوئی دنیا کو اپنے عمل سے ایک دفعہ پھر دکھا دیا کہ ساز و سامان اور محرابوں اور شہ نشینوں میں
بیٹھنے والوں کی سرپرستی اور زعمائے ملت کی تفاخر آمیز مہربانیوں کے بغیر بھی جب محض دیئے جن
آدمی بھوکے رہ کر اپنی بے سروسامانی کی حالت میں بھی عزم اور ارادہ کی قوت سے کام لیتے ہیں
تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے!

جامعہ کے کارکنوں میں اخلاص اور عزم کی جو قوت ہم دیکھتے ہیں وہ اجمل خاں اور
انصاری کی اوس خاموش مگر زبردست قوت ارادی کا پرتو ہے جس نے اوس زمانہ کی سنگلاخ
زمین پر نخلستان پیدا کیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے کہ اجمل خاں کی مالی حالت نہایت سقیم ہو گئی تھی
اور وہ شخص جس نے ساری عمر مال و دولت کو ایک فقیرانہ شان سے ٹھکرایا تھا احتیاج کی شکلوں
میں مبتلا رہتا تھا۔ سیاسی مشاغل نے اون کے پیشہ کے کاموں کا دائرہ بہت محدود کر دیا تھا
حتیٰ کہ بعض اوقات گھر میں نان شبینہ کا اہتمام دشوار ہو جایا کرتا تھا —— مگر اون ہی اجمل خاں
کی خلوت و جلوت میں ایک کبھی شکست نہ کھانے والے عزم کے جلوے ہم نے دیکھے ہیں —

ایک دن رامپور سے واپس آئے ہیں، معلوم ہوا ہے کہ جامعہ کے استادوں کو کئی ماہ

سے تنخواہیں نہیں ملیں۔ منشی اخلاق حسین مرحوم کو بلاتے ہیں، اور گھر میں سے یاقوت کی ایک انگشتری لاتے ہیں۔ اخلاق حسین مرحوم سے فرماتے ہیں کہ ذرا اس انگشتری کو فروخت کر کے رقم لا دیجئے۔ ہمارے جامعہ کے استادوں کو کئی ماہ سے تنخواہیں نہیں ملی ہیں اور میری آمدنی کے ذرائع بھی بند ہیں۔ اخلاق حسین مرحوم انگشتری کو بازار میں لے کر جاتے ہیں اور واپس آکر اطلاع کرتے ہیں کہ اوس کی قیمت کوئی جوہری پانچ ہزار سے زیادہ نہیں لگاتا حالانکہ اوس کی مالیت سات ہزار روپیہ سے کم نہ تھی۔ فرماتے ہیں، آگرہ چلے جاؤ وہاں کے جوہریوں کو دکھاؤ! ـــــ اس عرصہ میں ایک ریاست میں بغرض علاج بلائے جاتے ہیں اور وہاں سے سات ہزار روپیہ لے کر آتے ہیں۔ اسٹیشن سے گھر آنے کے بعد پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ اساتذہ کی تنخواہوں کی رقم جامعہ کے حوالہ کرتے ہیں ـــــ ایک ہی دفعہ نہیں ہزار دفعہ کی بات ہے کہ اجمل خاں اپنی اور اپنی اولاد کی ضرورتوں پر جامعہ کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے تھے! اون کا ضمیرِ حاضر اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ یہ اولادِ معنوی ہی دنیا میں اون کی سب سے بڑی یادگار ہوگی ـــــ اور ہے! جامعہ کے ساتھ اون کے دل کی وابستگی ایک لمبی داستان ہے جدوجہد اور قربانیوں کی ـــــ آپ مجھ سے کہیں تو لکھتا چلا جاؤں ـــــ کہتا چلا جاؤں! اون کی دن رات کی زندگی میں یہ ایک مسلسل طلب تھی۔ ایک بے پناہ تقاضا تھا جو اون کی خلوت و جلوت میں یکساں محبت اور محنت اور قربانیوں کے ایسے نقش بناتا رہتا تھا جنھوں نے مجھ جیسے ہزارہا عقیدتمندوں کے دلوں کا چراغ روشن رکھا ـــــ اس کرۂ خاکی پر اجمل خاں کی زندگی کا دیا تو گل ہو چکا لیکن کیا یہ ایک معجزہ نہیں کہ ہمارے آتش خانوں میں اون ہی کی پیدا کی ہوئی گرمی آج بھی باقی ہے! ـــــ

اس ہندوستان کی سرزمین پر اجمل خاں اور انصاری کی قوم اپنے گریبانوں کی کشاکش میں مصروف ہو کر قومی زندگی کے اون قافلہ سالاروں کو بھولتی جا رہی ہے لیکن ابھی تک چند قدامت پرست (!) ایسے بھی ہیں جو اوس نقشِ پا سے ـــــ اس قافلہ کے غبار سے، لپٹے ہوئے ہیں ـــــ زعمائے حاضر کے سنگِ آستاں کو یہ قدامت پسند اپنی پیشانیوں سے ناپاک کرنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتے!!

اجمل خاں کا داہنا بازو انصاری تھے ــــ مغربی اور مشرقی تربیت اور تہذیب کا یہ سنگم بہت ہی عجیب تھا ــــ جس قدر عجیب تھا اوسی قدر دلنواز بھی تھا! خاندان شریفی کے نبیرے "حاذق الملک" اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے پہلے اور آخری "مسیح الملک" نے دہلی کی قدیم تہذیب کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اوس تہذیب کی خصوصیات آخر دم تک اُنکے کردار میں نمایاں رہیں۔ مگر انصاری کی جوانی نے دس بارہ برس تک یورپ کی سرزمین پر اس کی علمی اور تہذیبی ترقیوں میں نشوونما پایا تھا۔ یہ دو مختلف شخصیتیں جن کے لئے اپنی زندگیوں کے نصف النہار سے آخری سالوں تک ایک دوسرے کا رفیق اور دمساز ہونا مقدر تھا، پہلی دفعہ لندن کے چیرنگ کراس ہاسپٹل میں ایک دوسرے سے ملے۔ اس ملاقات کا حال خود انصاری مرحوم نے ۱۹۳۲ء میں جب وہ دہلی جیل کے اندر سرکار کی مہمان نوازیوں سے نوازے جا رہے تھے مجھے لکھ کر بھیجا تھا۔ اون ہی کے الفاظ میں اس پہلی ملاقات کا حال آپ کو سنائے دیتا ہوں:ــ

"حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات لندن میں جب میں چیرنگ کراس ہسپتال میں ہوس سرجن تھا بوساطت ڈاکٹر صاحب زادہ سعید الظفر خاں صاحب ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بغرض سیر و سیاحت لندن تشریف لے گئے تھے اون کو لندن کے مشہور ہسپتالوں کے معائنہ کا شوق تھا۔ چیرنگ کراس ہسپتال کا معائنہ نہایت گہری نگاہ، بہت چھان بین اور ہر شعبہ کی تحقیقات کے ساتھ میرے ہمراہ کیا۔ سب سے پہلی چیز جو اون کے متعلق مجھ کو محسوس ہوئی وہ یہ کہ اون کی نگاہ نہایت نکتہ سنج اور عمیق تھی اور ہر بنیادی اور فروعی چیز پر واقفیت اور تحقیقات کئے بغیر نہیں رہتے تھے ہسپتال کے ہر شعبہ کو اونھوں نے اسی طریقہ پر ملاحظہ کیا۔ ڈاکٹر سٹینلی بائیڈ چیرنگ کراس ہاسپٹل کے مشہور اور سینیر سرجن تھے۔ اور بادشاہ کے بھی وہ آنریری سرجن تھے۔ تشخیص امراض اور فن سرجری میں لندن میں یہ مسلم استاد سمجھے جاتے تھے۔ میں ان ہی کا ہوس سرجن تھا۔ حکیم صاحب سے ان کی ملاقات میں نے کرائی۔ انہوں

نے حکیم صاحب کو ایک روز ہسپتال میں اپنے کلنیکل سرجری کلاس میں جو کہ ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو چیرنگ کراس ہسپتال کے کسی ایک وارڈ میں طلبا، کو عملی تعلیم دینے کے لئے ہوا کرتے تھے دعوت دی۔ ایک مریض کی تشخیص مرض کے متعلق مسٹر بائیڈ طلبا کو سمجھا رہے تھے۔ حکیم صاحب سے بھی اونھوں نے مریض کو دیکھنے اور تشخیص کرنے کی خواہش کی۔ بعد معائنہ حکیم صاحب نے یہ تشخیص کی کہ مریض کی آنتوں کے ابتدائی حصہ میں کہنہ زخم ہے جس کے باعث درد کی تکلیف یرقان اور حرارت تھی ڈاکٹر بائیڈ کی رائے میں وہ پت کی تھیلی کا ورم تھا۔ اونھوں نے حکیم صاحب کو نہایت خلق اور اصرار سے دوسرے روز صبح کو اس مریض کے اپریشن کے وقت بلایا۔ اور ہنس کر کہا کہ یہ طب یونانی اور انگریزی طب کا امتحان ہے۔ اپریشن سے پتہ چل جائے گا کہ کونسی طب صحیح ہے۔ مجھکو کسی قدر اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری دیسی طب کی بے عزتی ہو جائے۔ اپریشن کے وقت میں کسی قدر تشویش میں تھا لیکن شکم چاک کرنے پر حکیم صاحب کی تشخیص صحیح نکلی۔ اور مسٹر بائیڈ نے نہایت فیاضی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ حکیم صاحب کو اون کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ اور حکیم صاحب کو اور مجھ کو اپنے گھر پر ڈنر کے لئے اور اوس کے بعد اون کے ہمراہ تھیٹر جانے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر بائیڈ کی بیوی لنڈن کے مشہور زنانہ ہسپتال کی سینیر سرجن تھیں۔ ان سے حکیم صاحب کا تعارف کراتے وقت بائیڈ نے کہا کہ "ڈاکٹر انصاری کے جن ہم وطن پہلوان نے مجھے سرجیکل کشتی میں شکست دی ہے وہ یہ صاحب ہیں! حکیم صاحب اور مجھ پر مسٹر بائیڈ کی اس علم شناسی۔ قدردانی۔ اعلی خوشدلگی اور خوش خلقی کا بہت اثر ہوا"

اس طرح ہندوستان کی قسمت مغربی اور مشرقی تہذیب کے ان دو مشاہیر کو ایک دوسرے کے قریب لائی۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ دولت برطانیہ کے دارالسلطنت میں ایسے دو بڑے

" باغی " زندگی بھر کے لئے رفاقت اور محبت کا پیمان باندھتے ہیں جو غلاموں کی سرزمین پر۔ برطانوی سامراج کے استبداد کا رعب و داب کروڑوں انسانوں کے دلوں سے نکال دیں گے!!

انسانی نفسیات کے نقطہ نظر سے ان دونوں کے تعلقات کے بہت ہی قریب سے مطالعہ کا مجھے سالہاسال موقعہ ملا۔ اون کی تعلیم و تربیت کا اختلاف ہی گویا اون کے کردار کی ہم آہنگی کا ایک سبب بن گیا تھا۔ اون دونوں کے درمیان ایک دوسرے کی خوبیوں کا تبادلہ عمر بھر اس طرح جاری رہا کہ یہ جو کچھ اُن کے کردار سے حاصل کرتے، وہ اُس کے بدلے کچھ ان سے لیتے تھے!! حتے کہ فن اور پیشہ کے مشاغل میں بھی حکیم صاحب نے خاندان شریفی کی قدیم روایات سے روگرداں ہوکر اور انصاری نے طب انگریزی کی بالادستی کے تفاخر سے قطع نظر کرکے ایک دوسرے کے کمالات میں شرکت کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔

جس طرح مشرق و مغرب کی تہذیبیں ان دونوں کی شخصیتوں میں وجہ اشتراک بن گئیں۔ اسی طرح یہ دو قدیم علوم بھی اون کی وجہ سے ایک دوسرے سے اتنے قریب آگئے جتنے کہ کبھی پہلے نہ تھے۔ خدا کی رحمتیں اور جنت کی راحتیں اون ہی مردانِ کار کے لئے ہیں جنھوں نے اپنے دھڑکتے ہوئے دلوں کا آخری قطرہ بھی اپنی ملت کے اُن غلاموں کے لئے ہبہ کیا جنھیں وہ زندہ اور بیدار دیکھنا چاہتے تھے۔ جامعہ کی زندگی اور بیداری میں وہ پاک روحیں آج بھی شریک ہیں! جامعہ کی تاسیس کا سارا تخیل ہی ان دونوں کے ایمان اور عقیدے کی اوس بے پناہ قوت پر منحصر تھا جس نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی، جو کبھی اپنے حریفوں سے مرعوب نہیں ہوئی اور جس نے ملت کے ارتقا کا ایک لازوال پیام جامعہ کی صورت میں اپنے بعد آنے والوں کے لئے چھوڑا :-

قلزم ہستی میں تو ابھرا ہے مانند حباب	اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
تو اُسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ	جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

(قاضی عبد الغفار)

حکیم صاحب

(حکیم اجمل خاں مرحوم کے انتقال پر یہ مضمون لکھا گیا تھا۔)

گیارہ سال سے اوپر ہوتے ہیں علیگڈھ کالج میں پڑھتا تھا اور ہندوستانی تعلیم گاہوں میں طلبہ کی جو تقسیم "کھیلنے والوں" اور "پڑھنے والوں" میں کی گئی ہے اس کے مطابق "پڑھنے والوں" میں تھا صحت ظاہر ہے ہمیشہ خراب رہتی تھی طب جدید کی توجہات جب کچھ مدد نہ کر سکیں تو خیال ہوا کہ یونانی علاج کرایا جائے اور یونانی علاج کے لئے اس کے سوا اور کوئی کیا مشورہ دیتا کہ اس فن کے امام بلکہ اس کے مسیحا کے پاس جاکر درماں طلبی کی جائے۔ حکیم صاحب (اس حکیم ملت کے لئے بس یہی لقب کافی تھا) کے پاس جانے کا ارادہ تو کر لیا، لیکن بتایا گیا کہ بے سفارش نہ جانا، بڑا دربار ہے، توجہ نہ ہوگی۔ تیاری میں کئی ہفتے گذر گئے۔ بالآخر میرے مخدوم بشیر الدین صاحب کو معلوم ہوا تو وہ خود اپنے ہمراہ مجھے دہلی لائے مطب میں پہنچے، مریضوں کا ہجوم تھا ۱۱۔ ۱۲ بجے تک مطب ہوتا رہا۔ جب اُٹھے تو مولوی بشیر الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھیں سہ پہر کو چائے پر بلایا۔ میں بھی ساتھ پہنچ گیا لیکن کچھ اور لوگ بھی تھے نبض دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ دوسرے روز مطب میں بلایا۔ پھر وہی اژدہام تھا۔ کوئی ۱۱ بجے نوبت آئی۔ نسخہ مل گیا اور میں علی گڑھ واپس گیا۔ سفارش کے باوجود دو روز تک انتظار کرنے سے طبیعت بالکل مکدر نہ ہوئی بلکہ مریضوں کی کثرت، ہر کونہ ہر گوشہ میں درماں جویوں کا ہجوم، مکان

کے دروازے تک، موٹر میں بیٹھنے کے بعد تک نبض دکھلانے والوں کا ہاتھ بڑھا دینا۔ یہ سب باتیں دیکھ کر اس بڑے آدمی کی بڑائی دل میں اور بڑھتی تھی۔ لیکن یہی عظمت کہ بڑا دربار ہے، بڑوں ہی کا یہاں گذر ہے۔ بلا وسیلہ وسفارش حکیم صاحب سے علاج کرانا مشکل ہے۔

لیکن گیارہ سال بعد جب جامعہ کے کاموں کی وجہ سے میں تقریباً اپنا تمام وقت جو جامعہ سے بچتا تھا، اسی دربار میں گذارنے لگا تو معلوم ہوا کہ یہ خیال ٹھیک نہ تھا سفارش والے یہاں سب سے پیچھے رہتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ تنگ و تاریک گلیوں میں، میں ساتھ گیا ہوں، کسی ٹوٹے مکان کے دروازے پر کھڑا رہا ہوں اور دنیا کا یہ سب سے بڑا طبیب۔ نوابوں کا نواب کسی بڑھیا کو دیکھنے اندر گیا ہے جس کی عسرت کا یہ حال ہے کہ مجھ ہمراہی کے لئے بیٹھنے کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی تھی جب گھر سے نکلتے ہیں تو مسکراتے ہوئے کہ آپ کو بہت دیر ٹھہرنا پڑا۔

۱۲ر دسمبر کی شب کو جب تین چار روز تک درد کی وجہ سے بستر پر لیٹے لیٹے بمشکل سے اُٹھ کر بیٹھے اور دوسرے روز صبح باوجود اس تکلیف کے بمبئی کے سفر کا قصد تھا تاکہ شاہ افغانستان کی خدمت میں جامعہ کا ایڈریس پیش کر سکیں تو میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ رات ہو چکی تھی لیکن مریض آ آکر نسخے لے رہے تھے، جب سب جا چکے تو اپنے ایک شاگرد کو بلا کر فرمایا کہ کل کچھ لوگ نبض دکھانے آئے تھے اور آج صبح بھی انتظار کرتے رہے، میں نہ دیکھ سکا، بیچارے غریب لوگ ہیں، وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ بمبئی کی طرف سے آئے ہوں گے، ذرا جاکر قریب کے ہوٹلوں میں تلاش کرو اور مل جائیں تو لے آؤ اور اُن کے لئے بھی نسخہ تجویز کر دوں۔ یہ اور اس قسم کے سیکڑوں واقعات، اس وقت میرے ذہن میں ہیں جو صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ نواب غریبوں لاوارثوں، بے وسیلوں کا عاشق تھا، اور یہ خیال بالکل غلط تھا کہ اس کے دربار میں

بہ وسیلہ رسائی نہیں۔

میں نے ان واقعات کا اس لئے ذکر کیا کہ حکیم صاحب کی عظمت اور بڑائی قریب سے دیکھنے پر اور بڑھتی تھی اور دور سے دیکھنے والے جس وجہ سے انھیں بڑا سمجھتے تھے، قریب والے بالکل دوسری وجہ سے انھیں اس سے زیادہ بڑا جانتے تھے۔ بڑے لوگوں کو اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لئے دنیا میں اکثر چھوٹوں سے الگ، چھپا ہوا، کھنچا ہوا رہنا پڑتا ہے اور ٹھیک بھی ہے۔ قریب سے دیکھنے والے پر بہت سی وہ چھوٹی چھوٹی خامیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ جو دور والے کو نظر نہیں آتیں۔ حکیم اجمل خاں اُن بڑوں میں تھے جو قریب سے اور بڑے ہو جاتے ہیں، دور سے دیکھنے والے جن کی عزت کرتے ہیں اور قریب سے دیکھنے والے جن پر عاشق ہو جاتے ہیں۔

یہ نادر وصف صرف اُن بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے جو صرف بڑے نہیں ہوتے بلکہ آدمی بھی ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کی صفت مرحوم میں جس درجہ موجود تھی میں نے اور کسی میں نہ پائی۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے ہر ہر جزو میں وہ تناسب اور ہمواری تھی، جو اگر کسی ایک جزو میں حاصل ہو جائے تو آدمی کو بڑا بنا دیتی ہے جس تمدن میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، اُس کے کسی ایک شعبہ کا بھی کمال اگر اُس کی ذات میں موجود ہو تو وہ اپنی جماعت کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک ذات تھی جس میں ہندی اسلامی تمدن کے ہر شعبے کا کامل نمونہ موجود تھا اور یہ بھی نہیں جدید تمدن کے اچھے اثرات موجود نہ ہوں۔ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی اور جدید کی بیداری اس ایک ذات میں آکر مل گئی تھیں اور افسوس کہ دوسروں میں اس اتحاد کو آنکھیں بے سود تلاش کرتی ہیں کہ پرانوں میں قدامت بے حسی و موت بن گئی ہے۔ نیوں میں جدت نے سطحیت اور اُتھلے پن کی شکل اختیار کی ہے۔ پُرانے تمدن کی جڑیں ہماری زندگیوں میں اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سخت چٹان پر پہنچ گئی ہیں جس سے وہ غذا حاصل نہیں کر سکتیں، ہمارے نئے تمدن

کی مثال خوشنما پھولوں کے اُس گلدستے کی سی ہے جو درخت سے توڑ لئے گئے ہیں اور اگرچہ ابھی بہت شاداب نظر آتے ہیں لیکن ان میں جڑیں نہیں اس لئے ان میں ثبات بھی نہیں۔

ایک اجمل خاں کی ذات تھی جس کی جڑیں تمدن اسلامی کی گہرائیوں میں تھیں اور جس کے پھل پھول دیکھ کر نئے باغوں کے پھول بھی شرما جاتے تھے۔ ہر شعبۂ تمدن میں طب ہو کہ علم سیاست ہو، معاشرت و مذہب ہو کہ فنون لطیفہ وہ سب میں مقلد بھی تھا اور مجتہد بھی۔ پچھلے جو دے سکتے تھے وہ سب اُس نے لیا لیکن یہ خیال کبھی ذہن سے نہ ہٹا کہ اگلوں کو کچھ اور دے بھی جائے۔ اس کی غیور طبیعت کو کبھی یہ گوارا نہ تھا کہ ماضی کا قرض بلا معاوضہ حال کی گردن پر رہے۔ اس لئے اُس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر تھی۔ طبیہ کالج کو دیکھو، ندوۃ العلماء کے اجلاس میں اس کے خطبۂ صدارت کو پڑھو، جامعہ ملیہ کے اس تخیل سے آگاہی پیدا کرو جو مرحوم کے پیش نظر تھا اور جس کی تکمیل کی سعی میں اُس کی آخری سانسیں گذریں تو معلوم ہوگا کہ یہ دماغ محض کسی بڑے طبیب یا عالم یا سیاسی کا دماغ نہ تھا بلکہ ایسا دماغ تھا جو صرف اُن لوگوں کو ملتا ہے جن سے قدرت مستقبل کی تعمیر کراتی ہے۔ آج اجمل خاں ہم سے جدا نہیں ہوئے، ہندوستان اور مسلمانوں کے مستقبل کا سب سے بڑا معمار ہم میں سے اُٹھ گیا۔ پرانی نسل اجمل خاں میں اپنے آخری کامل نمونے کو رو رہی ہے اور نئی نسل اپنی دنیا کے ایک خلاق اور اپنی ممکنات مضمر کے ایک تشکیل دینے والے کے لئے نوحہ کناں ہے۔

دنیا میں بہت بڑے بڑے مرنے والے واقعی مرجاتے ہیں جب ان کا رشتہ صرف ایک نسل سے ہو، لیکن ماضی اور مستقبل دونوں سے رشتہ رکھنے والے نہیں مرتے، اور اجمل خاں انھیں نہ مرنے والی ہستیوں میں ہے۔

جب موجودہ زمانے کے فن طب یونانی کا بڑا حصہ نامکمل اور ناقص ثابت

ہو چکا ہوگا (اور کونسا فن ہے جس کا نقص زمانہ ثابت نہیں کرتا؟) تو دہلی کے ایک دور اُفتادہ گوشہ میں ایک طبیہ کالج کے طلبہ اور اساتذہ ایک نئے فن طب کی تدوین و تخلیق میں مصروف ہوں گے اور ان کے کالج کی درو دیوار پر اور خود اُن کی زبان پر حکیم اجمل خاں کا نام ہوگا۔ جب "تعلیم جدید" کے حامی اپنی کوششوں کی مضرت سے واقف ہو چکے ہوں گے تو ملک میں متعدد تعلیم گاہیں اور تحقیقی ادارے ایسے ملیں گے جو اپنی کوششوں میں قدیم و جدید کا وہی امتزاج پیدا کرنا چاہتے ہوں گے جو اجمل خاں کی زندگی میں نمونے کے طور پر موجود تھا اور ان سب کی راہنما بھی اسی اجمل خاں کی یاد ہوگی۔ جب بہت سے لوگ قوم میں "بیداری" اور حرکت پیدا کرنے والے، قوم کے خواب غفلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی جیبیں بھر کر اس دنیا سے گذر چکے ہوں گے! اور دنیا جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے، ان مصلحوں کو بھول چکی ہوگی تو اجمل خاں ہی کے نام لیواؤں میں ایسی جماعت ملے گی جو مسلمانوں میں گھر گھر صحیح تعلیم کی روشنی پھیلائے گی جب مسلمانوں کو ان کی تعدادی نسبت کے مطابق ملازمتیں دلوانے والے خود کسی بڑی کرسی پر پہنچ کر اپنی اس جدوجہد کو بھول جائیں گے تو حکیم اجمل خاں کے یاد کرنے والے ہی اس بدنصیب قوم کو "الکاسب حبیب اللہ" کی بھولی ہوئی بشارت یاد دلا کر اُن کی معاشی حالت کو درست کرنے میں ساعی نظر آئیں گے۔

کیوں؟ اس لئے کہ اجمل خاں کی تحصیل جس قدر وسیع تھی "تعمیر" و "تخلیق" کا جذبہ بھی اتنا ہی ہمہ گیر تھا اور یہی نہیں کہ اس کی تعمیری جدوجہد محض خیالات کی دنیا میں رہی ہو۔ اُس نے اپنے کاموں کا پورا نقشہ خارج کے لئے بنا دیا ہے۔ سب کاموں کی بنیادیں وہ خود اپنے ہاتھ سے رکھ گیا ہے اور اس کا بھی انتظام کر گیا ہے کہ نئے معمار کمزور ہاتھوں سے ہی سہی، رُک رُک کر اور آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن اُن بنیادوں پر وہ عمارت ضرور کھڑی کر دیں گے جو اس معمار قومی کی نظروں

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم

(سب سے پہلے امیرالجامعہ)

میں ہر وقت رہتی تھی ۔ اس لئے کہ وہ اپنی زندگی کے نمونے سے اپنی محبت سے ، اپنی
نظر کے فیض سے ان نئے معماروں کے دل میں یقین و ایمان کا سرمایہ چھوڑ گیا ہے ۔
جو لوگ مرحوم سے اپنے کسی جسمانی مرض کے لئے نسخہ لینا چاہتے تھے ، جو
کسی ملازمت کے لئے سفارش کے خواہاں تھے ، جنھیں کسی عزیز کی شادی
کے لئے روپیہ درکار تھا ، جس بیوہ کی روٹی مرحوم کی پوشیدہ توجہ سے چلتی تھی
جس یتیم کی تعلیم کے لئے اُس کے خزانے سے روپیہ آتا تھا ، اور اُن کی تعداد
سیکڑوں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہے تو افسوس ہزار افسوس کہ اُن سے
اجمل خاں ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ۔ لیکن طب قدیم کا مجدد اور
مسیحا ، معاشرتی اصلاح و مذہبی رواداری کا علم بردار ، قومی تعلیم کا راہنما
اجمل خاں زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ وہ اجمل خاں جو ہمیشہ کے
لئے رخصت ہو گیا ، اتنا بڑا تھا کہ زمانہ اب مشکل سے اُس کی مثال پیدا کر سکے گا ،
لیکن جو اجمل خاں زندہ ہے وہ اس سے بھی کہیں بڑا ہے اور آج لوگ اس کی
بڑائی کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں ۔

(ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

ڈاکٹر انصاری

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے انتقال پر یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیا گیا تھا۔

کل رات کو کوئی ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے وہاں سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں دل کی حرکت بند ہو گئی، اور یہ بے شمار کاموں اور ان گنت قدر دانوں کو، اس دیس کو جس کی خدمت میں ساری عمر گذار کر اُن کا بُرا ہی سُنا، اُن ہندو مسلمانوں کو جن میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کیا، اُن مریضوں کو جن کی آخری اُمیدوں کا سہارا اُن کا مطب تھا، اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ کر اُن کا خون چلوؤں بڑھتا تھا اور جن سے انھیں یہ امید تھی کہ اُن کی زندگی میں وہ آرزوئیں پوری ہو سکیں گی جو اس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں، ہاں گھر بار کو، بال بچوں کو، عزیزوں کو، دوستوں کو، سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اُس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ اُن کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے ایک اُن کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا اس دیس کے ہر بچے کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور یہ اپنے پرائے سب کے لئے بہتا تھا۔ اُن کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑے سب کے کام

آتا تھا۔ اُن کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں پر دکھی دل کو پناہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دن سے دنیا کے میدانِ عمل میں قدم رکھا اُن کی شخصیت نے سب کا من مَنہ لیا، اس لئے کہ وہ نیک تھے، سچے تھے، مخلص تھے فیاض تھے۔ ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور اُن کے غم کو اپنا غم جانتے تھے، اس سے پہلے کہ اُن کی سیاسی خدمات اُنہیں مشہور کریں، ہزاروں آدمی اُنہیں اپنا سمجھنے لگے تھے۔ اُن کی سوجھ بوجھ، تدبر، خلوص اور ایثار نے بہتیروں کو اُن کا گرویدہ بنایا لیکن اُن کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس وقت اُن سب کی نظروں میں اُن کی پریم بھری آنکھیں، اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اُٹھتا ہوگا۔ پھر سوچئے کہ اس سانحہ سے اُن لوگوں کے دلوں پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور اُستادوں کی طرح خاص اُن کے سایہ میں رہتے تھے۔ موت کی گھڑی سب کے لئے آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی چھپّن سال کے تھے اُن کے لئے تو وہ زمانہ آرہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے اور جب وہ نہ ٹلنے والی گھڑی آتی تو اُنہیں کچھ نصیحت، کچھ وصیت کر کے اطمینان سے آنکھیں موند لیتے۔ پر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا اور ہوتا تو وہی ہے جو اُسے منظور ہو۔ وہ اکیلے چل دئے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھئے تو اُن کے خاندان کی روایتوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ایوب انصاری کی اولاد ہیں جن کے گھر میں مکّہ سے مدینہ ہجرت کرنے والے قافلہ کے سردار نے جاکر قیام فرمایا تھا۔ اُس وقت جب مخالف اُس کی حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اُس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے، پر جس

کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی راحت پائی۔ اُسی وقت سے سچائی کی مدد، مہمان نوازی، فیاضی اس خاندان کا حصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا لیکن بچپن ہی سے اُن کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۸۹۶ء سے جب اُنھوں نے اپنے وطن کا مڈل اسکول چھوڑا اُس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فارغ ہوکر ہندوستان واپس آئے یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان وظیفوں سے اکثر چھپ چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں جب اُنھوں نے دہلی میں فتحپوری پر اپنا مطلب کھولا تو اُن کی غیر معمولی طبی لیاقت کے ساتھ اُن کی مہمان نوازی اور دریا دلی بھی مشہور ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں اُنھوں نے ٹرکش میڈیکل مشن کی رہبری کے لئے اپنی پریکٹس چھوڑ دی، گھر میں جو کچھ بک سکتا تھا بیچ ڈالا اور زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو خالی ہاتھ۔ پھر پریکٹس شروع کی۔ ذرا اطمینان ہو چلا تھا کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا وقت اور روپیہ قوم پر نثار کر ڈالا۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ خلافت کا ڈیپوٹیشن لے کر انگلستان گئے تو اپنا موٹر بیچ کر۔ جب واپس آئے تو ملک میں ایک تہلکہ تھا اُس وقت کوئی خدمت ایسی نہ تھی جسے انجام دینے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم جھجکے ہوں، وہ کون سودا تھا جو اس سر میں نہ تھا۔ نہ دن چین سے گزرتے تھے اور نہ راتیں اُن کا حوصلہ تھا کہ بڑھائے جاتا تھا اور ہمت تھی کہ پھیر لگائی جاتی تھی۔

۱۹۲۲ء کے بعد ملک میں کچھ سکون سا تھا پر اس سکون میں وہ اور بھی بے چین تھے کیونکہ ہندو مسلمانوں میں میل جسے وہ جان سے عزیز رکھتے تھے اُس وقت فنا ہوتا نظر آتا تھا اور وطن کے دونوں بیٹوں میں پریم اور محبت کا رشتہ قائم کرنے کی خاطر

کم لوگ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طرح اپنی عزت، شہرت اپنے سکھ اپنے چین کو داؤں پر لگایا ہو۔ اس پاک کوشش میں اُنھیں جو دکھ پہنچے اُن کا ذکر اس وقت کیا کروں، اُنھوں نے اُس پاک طینت، نیک نفس انسان کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ آج جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہمیں سب کو ہندو مسلمانوں کو اس پاک کوشش میں اُس کی ناکامی پر شرم سے سر اُٹھانے کا موقع نہیں ہے۔ اور اس شرم کو بس آنسوؤں کی دو بوندیں نہیں دھو سکتیں اس کے لئے ساری عمر اسی کام میں سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہانا ہوگا جب بھی شاید نہ دُھلے گی۔ اسی کام کی خاطر ہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی کام کی خاطر اُنھوں نے اپنی تمام پریشانیوں اور دشواریوں کو بھلا کر، کانگرس کی صدارت ۱۹۲۷ء میں منظور کر لی۔ اسی کی خاطر جامعہ ملیہ کے کمزور پودے کی آبیاری اپنے ذمہ لی اس لئے کہ ملک کا رنگ اور ملک والوں کے ڈھنگ دیکھ کر اُن کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لئے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے، ایسے آدمیوں کی جو اپنی اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں، اُنھیں برتیں، اُنھیں ترقی دیں تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور اُن کی عزت کریں، خود مضبوط ہوں اور دوسروں کی مضبوطی سے ڈریں نہیں، مانگیں ہی نہیں دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی کچھ ہمت بھی رکھتے ہوں۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لئے اُنھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے آج سہ پہر کے وقت جامعہ ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جا کر دفنایا ہے، خدا انھیں توفیق دے کہ وہ اُس آرزو کو بھی پورا کر سکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دُکھا ہوا زخمی دل اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اس مدرسہ کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ نہ پھرے گا۔ اُس کے کام کرنے والوں سے کوئی آ کر شرما

شرما کر یہ نہ کہے گا کہ میں تمہارے لئے کچھ کام نہیں کر سکا، تم سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمت نہیں، وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون اُنھیں آکر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں پر اُس دکھی دل کا دُکھ ہمیں یاد رہے گا اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کرائے گا بھی۔ ہمارا کام بڑھے گا، پھیلے گا۔ ہمیں ہزاروں دولتیں ملیں گی پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہ ملے گا۔

(ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم

(نوسہ امیرالجامعہ)

اقبال اور جامعہ

اقبال اور جامعہ کچھ عجیب سا موضوع ہے اور میرا اس پر قلم اٹھانا عجیب تر۔ لیکن جامعہ سے ایک "دور کی نسبت" چونکہ اب بھی قائم ہے اس لئے عزیز جامعہ عرفان نوری صاحب کے اصرار سے مجبور ہوں۔ ان کا ارشاد ہے کہ عنوان بالا عابد صاحب نے تجویز فرمایا اور عابد صاحب ہی نے اس کے لئے قرعہ فال میرے یعنی راقم الحروف کے نام ڈالا۔ لہٰذا ان کے حکم کی تعمیل بھی ضروری ٹھہری۔

بایں ہمہ سوچتا ہوں کہ اس موضوع "اقبال اور جامعہ" یا "جامعہ اور اقبال" پر لکھوں بھی تو کیا۔ جامعہ ہمیشہ سے اقبال کی قدر دان تھی اور اقبال کو ہمیشہ جامعہ سے تعلق خاطر رہا گو اس کے علمی اظہار کی نوبت بہت دنوں کے بعد آئی۔ نہ جامعہ بلکہ صحیح معنوں میں "جامعہ ملیہ اسلامیہ" اقبال سے غافل رہ سکتی تھی نہ اقبال جامعہ سے۔ اور میں نہیں سمجھتا یہ کوئی ایسی بات ہے جس کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت ہو بجز اس کے کہ ان سطروں کو لکھتے ہوئے میرے سامنے وہ زمانہ آتا ہے جب تحریک ترک موالات کا آغاز ہوا "ترک موالات" اور "عدم تعاون" کو جو ترجمہ ہے "نان کوآپریشن" کا اور جس کا پروگرام اس وقت گاندھی جی نے اپنے مخصوص سیاسی فلسفہ کے ماتحت وضع کیا۔ عام طور پر ہم معنی سمجھا جاتا ہے کیونکہ عربی الفاظ کی ان دونوں ترکیبوں کا استعمال بیک وقت اس تحریک کے لئے ہوتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی — ہندو اور مسلمان — حکومت برطانیہ سے اپنے روابط توڑ ڈالیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو دونوں اصطلاحات کی روح الگ الگ ہے۔ عدم تعاون ایک سیاسی اصطلاح ہے

اور ترک موالات "اسلامی"۔ اب جس طرح تعاون اور موالات کو باہم مترادف سمجھنا غلطی ہے
ایسے ہی "ترک موالات" اور "عدم تعاون" کو اس لئے کہ آخرالذکر کا سرچشمہ سیاست ہے اور
اول الذکر کا اس سے عمیق تر یعنی مذہب۔ میں نے یہاں "اسلامی" اور "موالات" کے
الفاظ قصداً استعمال کئے ہیں کیونکہ ان کا مطلب وہ نہیں جو بالعموم سمجھا جاتا ہے بیشک
موالات کا ایک سیاسی پہلو بھی ہو لیکن ضروری نہیں کہ ہر سیاسی اصطلاح مثلاً عدم تعاون
کا ایک مذہبی پہلو بھی ہو۔ اور یہی وہ نازک فرق ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی
طرز فکر میں پایا جاتا ہے۔ اسلام کی نظر "کل" پر ہے۔ غیر اسلام کی "جزو" پر ہے۔ پھر غیر
اسلام کو اگرچہ لازماً "کل" سے انکار نہیں اور وہ اسے یا اس کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے سے
یا مذہب سے الگ سمجھتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں ان کی شیرازہ بندی کا قائل ہے بایں ہمہ
وہ اسلام کی طرح یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ "جزو" دراصل "کل" ہی کو ایک خاص جہت
سے دیکھنے کا نام ہے یعنی "جزو" "کل" ہی کا ایک رُخ ہے لہذا اپنی جزوی حیثیت کے
باوجود "کل" کا حامل۔ بات یہ ہے کہ اسلام وحدت ہے، اصل ہے، کنہ ہے۔ غیر
اسلام کثرت ہے، تحدید ہے۔ سطح ہے اور گو یہ کثرت، یہ حد بندی اور یہ سطحیت ہمیشہ اپنی
وحدت اپنے اصل اور کنہ کی طرف مائل رہتی بلکہ قدم قدم پر اس کا اعتراف کرتی اور اس
سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے لیکن انسان ذرا "عجول" واقع ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ
حتی الوسع اپنی محدود دنیا سے ماورا کچھ نہ دیکھے۔ اہل سیاست تو بالخصوص اپنے
محدود دائرے سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ بے صبری، بیتابی، عجلت اور بدظنی ان کا
شیوہ ہے۔ سیاست یا تو اپنے سوا ہر چیز سے آنکھیں بند کر لیتی ہے یا اگر کسی برتر حقیقت کو تسلیم
بھی کرتی ہے تو اس کی طرف بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ وہ بیشتر طاقت کی پوجا کرتی یا حرص و
ہوس میں صرف اپنی غرض کے وسائل تلاش کرنا جانتی ہے۔ گویا وہ "عزم امور" کی بجائے
"کاربرآری" پر مائل رہتی ہے اور یہی کاربرآری زندگی کی اعلیٰ قدروں کو سیاست سے

مایوس کر دیتی ہے۔ میں اس فلسفیانہ بحث کے لئے جس کا یہ موقعہ تھا نہ محل کسی قدر معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے یہ کہنا تھا کہ اسلام جس کا ایک پہلو سیاست بھی ہے محض سیاست کی طرح "کار برآری" پر قانع نہیں رہ سکتا یعنی وہ اس مسئلے سے جو باعتبار سیاست نوع انسانی کو اساسًا اور مستقلاً درپیش ہے قطع نظر کرتے ہوئے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ہم صرف "عارضی" اور "واقعی" یا محدود اور جزوی کو اپنا مقصود ٹھہرالیں" بیشک اسلام "کلی" اور "اساسی" یا "حقیقی" اور "مطلق" کے عذر میں "محدود اور جزوی" یا "عارضی" اور "واقعی" سے پہلو تہی نہیں کرتا لیکن اسے یہ بھی منظور نہیں کہ "جزو" کے حل میں "کل" یا "عارضی" کی بحث میں "مطلق" کو غیر ضروری قرار دیا جائے کیونکہ یہ "عارضی اور" واقعی" یا "محدود اور "جزوی" ہی کی تسخیر ہے جس سے ہم "کلی" اور "حقیقی" اور "مطلق" کی طرف بڑھتے اور اس سے تمسک پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے بڑھ کر کسی نے "آن حاضر" میں زندگی کا ابدی مسئلہ حل کرنے کی کوشش نہیں کی اس لئے کہ یہ "موجودہ، آتا اور گذرتا ہوا" لمحہ ہی اصل حقیقت ہے جس کو ہم اپنی سہولت کے لئے ماضی اور مستقبل میں تقسیم کرتے ہیں، جو موجودات کا حامل اور حوادث کا صورت گر ہے۔ لہذا اس موقعہ پر یعنی ۱۹۲۰ء میں بھی جب عدم تعاون کا سیاسی لائحہ عمل مرتب ہوا تو مسلمانوں کے ذوق طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اس پر ایک مخصوص نقطۂ نظر کے ماتحت غور کئے بغیر صاد کر دیں۔ یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قومیں اس قسم کے فیصلے دانستہ اور اپنے وجود ملی کی وسعت اور ساری گہرائیوں کا احصا کرتے ہوئے کیا کرتی ہیں۔ یہ ہرگز نہیں۔ یہ چیز کچھ شعوری ہے اور کچھ غیر شعوری۔ اور اس کا دارومدار "قومی انا" یعنی ہر قوم کے اجتماعی احساس، اجتماعی فراست اور اجتماعی حافظے پر ہے۔ وہ ایک لطیف عمل ہی جو بے منت استدلال اور بے شائبہ تکلف اجتماعی ذہن میں خود بخود رونما ہو جاتا ہے اور جس کی بعض افراد غیر شعوری طور پر نمائندگی کرتے ہیں گو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فرد واحد اپنی غیر معمولی بصیرت

معمولی فکر و نظر اور غیر معمولی شخصیت سے پوری قوم کو اپنی ہستی کے اصل الاصول کی طرف متوجہ کر دے۔ ۱۹۲۰ء میں بھی کچھ یہی ہوا جس کے تجزیے کا یہ موقعہ نہیں لیکن جس کے ماتحت طے پایا کہ وہ مخصوص لائحہ عمل جو "عدم تعاون" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے "ترک موالات" کے اسلامی کردار ہی کی ایک شکل ہے لہذا مسلمانوں کو اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ یہ صورت تھی ترک موالات کے "اسلامی" اور عدم تعاون کے "غیر اسلامی" رجحانات کی پہلو بہ پہلو ایک ہی منزل کی طرف بڑھنے کی اور یوں "ملک" و "ملت" کی وہ دوئی اور متوازیت قائم ہوئی جس کی نمائندگی اس وقت خلافت اور کانگریس کی تحریکوں سے ہوتی تھی۔ خلافت کا تعلق اگرچہ لفظاً عثمانی خلافت کی بحالی یا اتحاد اسلام سے تھا لیکن معناً سارے عالم اسلام۔ بشمول مسلمانان ہند۔ کی ساری زندگی کو محض اسلامی اساس پر تعمیر کرنے سے۔ گویا اس تحریک کی اصل خامی یہ نہیں تھی کہ اس نے ہماری توجہ اپنے گھر کے مسائل سے ہٹا کر ایک بیرونی مسئلے کی طرف پھیر دی بلکہ یہ کہ اس اساس کے پیش نظر ہماری حیات اجتماعیہ کی تعمیر جس نہج پر ہونی چاہیئے تھی اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ بالفاظ دیگر بنیاد تو موجود تھی لیکن یہ نہیں سوچا گیا کہ اس پر جو عمارت اٹھائی جائیگی اس کے وسائل اور ذرائع کیا ہوں گے ہم اپنے مسائل کا استقصا کس طرح کریں، واقعات کا رُخ کس طرح موڑیں، ہمارا لائحہ عمل کیا ہو، طریق کار کیا۔ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ ۱۹۲۰ء میں جب خلافت اور کانگریس کا اتحاد ہوا تو اس امر کے باوجود کہ عدم تعاون اور ترک موالات کا راستہ عملاً ایک تھا اس کی ہر منزل اور ہر مرحلے کی تشریح اسلامی نقطۂ خیال سے کی جاتی۔ تعلیمی ترک موالات میں بھی جو اس قرار داد کا ایک جزو تھا یہی روش اختیار کی گئی۔ لہذا جب ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ "مدرستہ العلوم مسلمانان" علیگڑھ کو دعوت دی گئی کہ "ملک و ملت" کی آواز پر لبیک کہے تو اس وقت بھی سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ علی گڑھ کی تعلیم سے وہ

سیرت اور وہ نمونہ پیدا نہیں ہوتا جسے ازروے اسلام پیدا کرنا مقصود ہے۔ گویا سب سے بڑا الزام جو تعلیمی ترک موالات نے علیگڑھ پر عاید کیا یہ تھا۔

حق جوانے مسلے با تو سپرد — کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو این یک کار آسان ہم نشد — یعنی آں انبار گل آدم نشد

یہ اقبال کا ایک قطعہ ہے اور "رموز بے خودی" کے باب "تادیب با داب محمدیہ" سے ماخوذ۔ نوجوانان علی گڑھ نے اس قطعے کو ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا ہوگا۔ یوں بھی اقبال سے بڑھ کر ملت کی آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار کس نے کیا تھا! انہی نے قوم کو عمل پر ابھارا اور اب جو قوم آمادۂ عمل تھی تو خیال تھا کہ اپنی شاعری کی طرح اقبال خود بھی قدم قدم پر قوم کا ساتھ دے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا تعلیمی ترک موالات کی دعوت پر معدودے چند طلبہ کے سوا کسی درسگاہ نے لبیک نہیں کہی اور علیگڑھ نے تو جس پر سب سے زیادہ بھروسہ تھا ارکین موالات کو "قانون و نظم" کے نام پر کالج بدر کر دیا۔ یوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کی نوبت آئی۔ بات یہ ہے کہ "مدرسۃ العلوم مسلمانان" کو ایک مدت سے 'جامعہ' (یونیورسٹی) میں منتقل کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ بحث صرف یہ تھی کہ زیر تجویز جامعہ "آزاد" ہو یا اس کے لئے حکومت کا پیش کردہ آئین منظور کر لیا جائے۔ چنانچہ اس بحث کے دوران میں "جامعہ اسلامیہ" نام بھی وضع ہو چکا تھا۔ لہٰذا جب علی گڑھ نے ترک موالات کی دعوت رد کر دی تو اس تحریک کے علمبرداروں نے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی تاسیس کا اعلان کر دیا۔

۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو مولانا محمد علی نے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی بنیاد رکھی اور اس کا افتتاح حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کے بابرکت ہاتھوں نے کیا اس کے ساتھ ہی اور غالباً اسی روز مولانا مرحوم نے اقبال کو تار دیا کہ علی گڑھ آئیں اور جامعہ کی تعلیمی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ || اصل

گویا جامعہ نے پہلے ہی دن اقبال سے اپنی عقیدت کا رشتہ جوڑ لیا تھا لیکن اقبال

نے "شیخ الجامعہ" کا عہدہ قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور پھر جب ترک موالات کی تحریک میں بھی شامل نہیں ہوئے تو جامعہ ان سے روٹھ گئی۔ مگر یہ روٹھنا محبت کا تھا ناراضگی کا نہیں تھا یعنی اس کا تعلق اقبال کی سیاست سے تھا، اقبال کی شاعری اور فلسفہ یا ذات سے نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ نہ آنے پر بھی اقبال ہمیشہ جامعہ میں موجود رہے۔ بانیٔ جامعہ تو اپنے دیرینہ تعلقات مودت و محبت کے علاوہ ان کی شاعری کے عاشق تھے۔ مولٰنا محمد علی کی شاید ہی کوئی تقریر اقبال کے اشعار سے خالی ہوتی کبھی کبھی طلبائے جامعہ کو درس دیتے ہوئے وہ باقاعدہ طور پر بھی اقبال پر گفتگو کرتے۔ طلباے قدیم کو یاد ہوگا کہ ان موقعوں پر پھونس اور کچی اینٹوں کے اس دالان میں جس کے لئے محمد علی ہال کا نام تجویز کیا گیا تھا یا اس کے بیرونی چبوترے پر ہم لوگ ایک حلقے میں بیٹھ جاتے اور مولٰنا مرحوم اپنے مخصوص انداز میں "اسرار خودی" یا کسی اور نظم یا شعر کی تشریح فرماتے "از کلید دیں در دنیا کشاد" جس میں حضور سرور کائنات صلعم کی شان رہنمائی کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے خاص طور سے پسند تھا۔ بعینہٖ "اسرار خودی" کے متعلق طلبا سے خطاب کرتے جب وہ اس شعر پر آتے۔

سر عیش جاوداں خواہی بیا

ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

تو ان کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل ہوتا۔ ۱۹۲۲ء میں جب تحریک ترک موالات کا پہلا دور ختم ہوا اور جامعہ باقاعدہ جامعہ بنی تو درس و تدریس کے عام اور باضابطہ سلسلے سے ہٹ کر اقبال کی شاعری کا خوب خوب چرچا رہتا۔ اقبال کی سیاست پر بحث ہوتی ان کی عملی روش کی تنقید کی جاتی اور بعض حلقوں میں تو اسرار و رموز کا طالب علمانہ مطالعہ بھی ہوتا۔ یوں بھی یہ زمانہ اقبال کی شاعری کے عروج کا تھا۔ اول خضر راہ اور طلوع اسلام ایسی زبردست نظمیں شائع ہوئیں، پھر پیام مشرق اور بانگ درا جن سے اقبال

کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیل گئی۔ لہذا قدرتی بات تھی کہ جامعہ بھی اقبال کا نام اور زیادہ فخر اور عزت سے لیتی۔ بایں ہمہ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت کی سیاست اور اقبال کی روش میں جو فصل تھا وہ جامعہ کے لئے ایک معمہ سا رہا گو خود اقبال کے لئے جامعہ کوئی معمہ نہ تھی میں اس زمانے میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور جامعہ کے متعلق اقبال کی ہر بات کا جواب بڑی تفصیل سے دیتا۔ اقبال سب کچھ سنتے اور مجھے سمجھاتے کہ جامعہ "ایک نظام تعلیم" کی حیثیت سے تو نہیں البتہ "ایک ذہنی مرکز" کی حیثیت سے ضرور کامیاب ہوسکتی ہے۔

۱۹۲۵ء میں جامعہ دہلی منتقل ہوگئی اور دہلی آکر اقبال سے جامعہ کے روابط کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس اثنا میں ترک موالات کی تحریک سرد پڑ چکی تھی اور ملک میں ہر طرف "فرقہ وارانہ" اختلاف اور مخاصمت کا زور تھا۔ پھر یہی زمانہ ہے جب "وطنیت" اور "اشتمالیت" کے زیر اثر خود مسلمانوں میں بھی لادینی نے سر اٹھایا۔ ان حالات میں اقبال کے سوا اور کون تھا جو مسلمانوں کو خود اعتمادی کا پیغام دیتا۔ یہ پیغام جامعہ میں بھی پہنچا اور جامعہ نے بھی اس سے ویسا ہی تاثر قبول کیا جیسا پورے ہندوستان نے یعنی زیادہ تر خوشگوار اور کم تر ناخوشگوار لیکن جامعہ کو اقبال سے جو عقیدت تھی اس میں بہرحال کوئی فرق نہیں آیا۔ پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ دہلی آکر ہی وہ حالات پیدا ہوئے جب اساتذۂ جامعہ کو اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ملا۔ یوں جامعہ اور اقبال کے درمیان ذاتی تعلقات کا رنگ پیدا ہوتا گیا۔ اب اقبال نے بعض نظمیں بھی رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت کیں اور پیام مشرق کا تیسرا نسخہ بھی مطبع جامعہ ہی میں طبع ہوا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اقبال نے جامعہ کے تعلیمی مقاصد اور تعلیمی سرگرمیوں پر ہمیشہ نظر رکھی اور یہ اپنی مخصوص حیثیت سے ان کا فرض بھی تھا۔ لیکن اساتذہ جامعہ سے میل ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا تو انھیں گویا جامعہ کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں وہ اساتذۂ جامعہ کو بعض کاموں میں شریک بھی کرنا چاہتے تھے لیکن افسوس ہے کسی نہ کسی مجبوری کے باعث ان ارادوں کی

تکمیل نہ ہو سکی۔

چند سال اور گذر گئے حتی کہ ۱۹۳۳ء میں امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی دعوت پر جنگ طرابلس اور بلقان کے نامور مجاہد یعنی مشہور ترک محب وطن غازی رؤف پاشا جامعہ کے توسیعی خطبات کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے، جامعہ کی بڑی خواہش تھی کہ ان خطبات میں سے کسی ایک کی صدارت اقبال بھی کریں۔ پھر جب اقبال نے جامعہ کی دعوت منظور کر لی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اقبال نے جامعہ کی چھوٹی سی بستی میں قدم رکھا، اساتذہ اور طلبا سے ملے، ان کا خراج عقیدت و محبت قبول کیا اور خود ان سے باتیں کیں، لیکن جامعہ کی طرح اہل دہلی بھی اس دن کو ہمیشہ یاد رکھیں گے کیونکہ اقبال ایک تو بالطبع جلسوں اور ہنگاموں سے الگ رہتے۔ صرف انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجتماع اس سے مستثنیٰ تھا مگر اب اس میں بھی حصہ لئے کئی سال گذر چکے تھے اور اہل دہلی کو تو شاید ان کے ارشادات سے مستفیض ہونے کا کبھی شرف ہی حاصل نہیں ہوا۔ لہذا اب جو اقبال دہلی آئے تو ان کی تشریف آوری سے اس تقریب کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ شام واقعی ایک یادگار شام تھی جب دنیائے اسلام کے ایک زبردست مجاہد نے ملت کے سب سے بڑے حکیم اور شاعر کی صدارت میں تقریر کی محمد علی ہال کھچا کھچ سامعین سے بھرا ہوا تھا اور سکوت ایسا کہ مقرر کی آواز کے سوا جیسے باقی سب آوازیں سینوں میں گم ہو گئی ہوں۔ رؤف پاشا خطاب کر چکے تو اقبال نے اتحاد اسلامی، اسلامی ثقافت، نشأۃ الثانیہ اور مسلمانان عالم کے ملی اضطراب کا ذکر کرتے ہوئے جب اپنے ارشادات اس بند پر ختم کئے جو "مسجد قرطبہ" ایسی بے مثل نظم کا ایک حصہ ہے اور بالخصوص یہ اشعار۔

روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا — گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

پڑھتے ہوئے خود ان کی آواز گلوگیر ہوگئی تو مجمع پر ایک عجب عالم طاری تھا۔ اقبال اس موقع پر
صرف دو روز دہلی ٹھہرے یعنی ایک صبح آئے اور دوسری شام واپس چلے گئے لیکن اس مختصر
سے قیام سے اہل جامعہ کی سیری کہاں ہو سکتی تھی۔ لہذا ان کے اصرار پر ڈیڑھ دو مہینے بعد
اقبال پھر جامعہ آئے اور "لندن تا غرناطہ" کے موضوع پر تقریر کی۔ یہ کہنے کی ضرورت
نہیں کہ اس دفعہ بھی جامعہ نے اقبال کے خیر مقدم، تواضع اور خاطر داری میں ویسا ہی
اہتمام کیا جیسا پہلے، اس دفعہ بھی جلسہ گاہ کی رونق کا وہی عالم تھا جو غازی رؤف پاشا کے
خطبے کے موقع پر بلکہ اس دفعہ اقبال اور اساتذہ وطلبائے جامعہ نے اور زیادہ کھل کر
باتیں کیں اور زیادہ قریب سے ایک دوسرے کو دیکھا اور زیادہ آزادی سے تبادلۂ خیالات
کیا اور میرا خیال ہے کہ یوں جامعہ اور اقبال کے درمیان فی الواقع محبت و مودت کا
ایک مضبوط رشتہ قائم ہو گیا جس کے نتائج اگر اقبال کی صحت یک بیک خراب
نہ ہو جاتی تو یقین ہے جامعہ کے لئے بڑے شاندار ہوتے۔ اقبال ۱۹۳۴ء میں بیمار
ہوئے اور دل کے عارضے نے ضیق الدم کے علاوہ حبس گلو کی شکل اختیار کر لی جس سے
وہ ہمیشہ کے لئے صاحب فراش ہو گئے لیکن اس کے باوجود ۱۹۳۵ء کے آغاز میں
جب ان کا مرض ابھی زیادہ نہیں بڑھا تھا وہ پھر جامعہ تشریف لائے اور مشہور ترک خاتون
خالدہ ادیب خانم کے ایک خطبہ کی صدارت کی گو آواز کی خرابی کے باعث رسمی طور پر
چند کلمات کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکے۔ اس کے بعد یعنی ۱۹۳۵-۳۶ء میں بھی اگرچہ بسلسلۂ
علاج وہ بھوپال آتے جاتے دوسرے تیسرے مہینے دہلی سے گزرتے بلکہ حکیم نابینا مرحوم
سے مشورے کے لئے ایک آدھ روز دہلی میں قیام بھی فرماتے مگر اب ان کی صحت برابر
گرتی جا رہی تھی حتیٰ کہ . . . . . .

معلوم نہیں آج اقبال زندہ ہوتے تو جامعہ سے ان کے روابط کیا شکل اختیار
کرتے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی شفقت اور عنایت کے ساتھ ساتھ جامعہ کو شاید ان

کے ارشادات سے مستفیض ہونے کا اور زیادہ موقعہ ملتا۔ بات یہ ہے کہ اقبال نے جو کچھ کہا اور جو کچھ سوچا اس کی حیثیت اساسی ہے۔ لہذا یہ سوال کہ جامعہ کو انھوں نے کس نظر سے دیکھا، اس کی تعلیمی سرگرمیوں، مقاصد اور طریق کار کے متعلق کیا رائے قائم کی، ان کے مشورے کیا تھے اور تجاویز کیا۔ بڑا تفصیل طلب ہے اور سر دست اس پر قلم اٹھانا شاید مناسب بھی نہیں کیونکہ یہ مسائل بحث و مباحثہ اور گفتگو کی بجائے زیادہ تر خود اپنے سوچنے اور سمجھنے کے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ تعلیمی ترک موالات کو رائج الوقت تعلیم سے جو اختلاف بلکہ شکایت تھی اس کے اظہار کے لئے "اہل جامعہ" کو اقبال کے اس قطعہ سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ملی جس کا حوالہ میں شروع میں دے آیا ہوں حقیقت میں اس قطعہ کا اشارا ایک بنیادی اصول کی طرف ہے بلکہ وہ ایک مستقل استفسار ہے اقبال یا زیادہ صحیح معنوں میں اس عقیدے کا جس کی ترجمانی اقبال نے کی ہر اسلامی درسگاہ سے اس میں جامعہ کی کوئی تخصیص نہیں۔ لیکن جامعہ نے "علی گڑھ" کا احتساب لفظاً اور معناً یہی کہہ کر کیا تھا

حق جوانے مسلمے با تو سپرد | کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کار آساں ہم نشد | یعنی آں انبار گل آدم نشد

لہذا جامعہ کو ان اشعار سے ایک تاریخی تعلق ہے۔ وہ ایک خطاب بھی ہے ایک اصول احتساب بلکہ ایک سمت بھی کہ جس کی تعیین اگر صحت سے ہوتی رہی تو جامعہ گویا اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئی۔

سید نذیر نیازی

علامہ اقبال علیہ الرحمہ

جن کے افکار و خیالات کا جامعۂ ملیہ اسلامیہ پر گہرا اثر ہے

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم

جامعہ میں

جنوری سنہ ۳۶ء کا ذکر ہے کہ خاکسار پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں مولانا مرحوم کی خدمت میں باریاب ہوا مولانا کو میرے آنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ بڑی بے تابی سے میرا انتظار فرما رہے تھے۔ بات یہ تھی کہ مرحوم اس زمانے میں چوبیس برس کی جلاوطنی کے بعد واپس ہندوستان آنے کا سوچ رہے تھے اور اس سلسلہ میں وہ یہ طے نہیں کر پاتے تھے کہ اول تو یہ کہ وہ اتنی طویل مدت جوارِ حرم میں گزارنے کے بعد واپس وطن لوٹیں یا نہ لوٹیں اور دوسرے اگر وہ ہندوستان جائیں بھی تو وہاں جا کر اپنی سوچی ہوئی باتوں کو کس طرح عمل میں لائیں۔ اپنے وطن میں واپس جا کر گوشہ نشینی تو انھیں منظور نہ تھی اس کے لئے مکہ معظمہ سے بہتر اور کیا جگہ ہو سکتی تھی انھوں نے تو ہندوستان آنا صرف اسی بنا پر قبول کیا تھا کہ مرحوم کے خیال میں جس کام کو وہ سرزمین حجاز میں نہیں کر سکتے تھے اسے وہ اپنے ہم وطنوں میں رہ کر باطمینانِ خاطر سرانجام دے سکیں۔ مولانا نے مکہ معظمہ ہی سے ذاکر صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس میں شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت اور ان کی علمی و سیاسی تحریک پر بڑی تفصیل سے بحث کی تھی۔ اور اس میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کے احیائے ملی کا کام کسی سوچے سمجھے ہوئے لائحہ عمل پر ہو، اور یہ لائحہ عمل ایسا ہونا چاہیئے کہ ایک طرف تو یہ اسلام کے اصول و مقاصد کے مطابق ہو، اور دوسری طرف اس سے آج کی ملکی اور مادی ضرورتیں بھی پوری ہو سکیں اس ضمن میں مولانا نے اس خط میں اپنے بعض مخصوص خیالات کا اظہار فرمایا تھا اور ان کے بارے میں

ذاکر صاحب سے استصواب رائے بھی فرمایا تھا اور ساتھ ہی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ کیا اچھا ہو اگر اس زمانے میں جامعہ کا کوئی استاد یہاں آجاتا اور اس کو ہم اپنی باتیں سنا سکتے۔

چنانچہ میں جامعہ کے ایک نمایندہ کی حیثیت سے مولانا کے حضور میں پہنچا۔ وہ زمانہ حج کا تھا۔ مکہ معظمہ میں ان دنوں ہر شخص بے حد مصروف ہوتا ہے۔ پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے ذاکر صاحب کا گرامی نامہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ مرحوم نے خط پڑھا اور مجھ سے دو چار باتیں کیں اور فرمایا کہ حج کے بعد مفصل گفتگو ہو گی، عرفات سے واپسی کے بعد منیٰ کے قیام میں چند بار ملے، خیر خیریت پوچھی، اور تاکید کی کہ جو نہی منیٰ سے واپس مکہ معظمہ پہنچو، مجھ سے ضرور ملو۔

حج کے مناسک ختم ہوئے اور سب لوگ منیٰ سے واپس مکہ معظمہ لوٹے تو میں دوسرے دن علی الصبح خدمت والا میں حاضر ہوا۔ باتیں شروع ہوئیں تو میں نے جامعہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہا۔ میں نے ایک آدھ بات کہی تھی کہ مولانا بے اختیار بول اٹھے اور فرمانے لگے کہ جامعہ میں کام کرنے والوں کا حال تو ضرور سناؤ لیکن جہاں تک جامعہ کا تعلق ہے میں اس سے خوب واقف ہوں میں نے جامعہ کے متعلق بہت سوچا ہے اور اس کے مالیہ اور مالیہ پر بھی کافی غور کیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں دیوبندی ہوں، اور دیوبند میں میرا تعلق حضرت شیخ الہند مرحوم سے تھا۔ جامعہ کا افتتاح حضرت نے فرمایا تھا۔ میں اس واقعہ کو محض اتفاق نہیں سمجھتا کہ بات ہوئی اور ختم ہو گئی۔ میرے نزدیک اس واقعہ کی اس سے بہت زیادہ اہمیت ہے۔ آج تو میرا ہندوستان جانا ممکن ہو گیا ہے۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ میں قریب قریب واپسی وطن سے ناامید ہو گیا تھا، اس زمانے میں بھی کبھی کبھی میں یوں ہی سوچا کرتا کہ اگر اتفاق سے میں واپس ہندوستان پہنچ جاؤں، تو کس ادارے میں رہوں اور کام کروں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں بار بار مجھے جامعہ ہی کا خیال آتا تھا۔ ....

.......ان ہی دنوں کا قصہ ہے کہ ایک رات خواب میں دیکھتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند کی مشایعت میں ریل گاڑی میں سفر کر رہا ہوں۔ ہم دیوبند سے چلے ہیں اور علی گڑھ کا قصد ہے کوئی نصف مسافت طے کی ہوگی کہ حضرت گاڑی سے اترے۔ اسٹیشن سے باہر ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جس میں ہم نے نماز پڑھی۔ حضرت امام تھے اور میں مقتدی۔ اس مسجد کا نقشہ اب تک میری یاد میں ہے۔ اس خواب کی تعبیر میں نے یہ کی تھی کہ اس سے اشارہ جامعہ کی طرف ہے جو دیوبند اور علی گڑھ کے بیچوں بیچ ہے۔ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بھی، اور علمی و فکری لحاظ سے بھی۔ وہ دن ہے اور یہ دن۔ میں نے جب کبھی ہندوستان جانے کے بارے میں سوچا، ہمیشہ جامعہ جانے کا خیال ہوا ہے۔ اسی غرض سے میں نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا اور میں ان کا بے حد ممنون ہوں کہ تمھیں یہاں بھیج کر انھوں نے میرا جامعہ جانا بہت آسان کر دیا۔

میں تقریباً ایک ماہ تک مکہ معظمہ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ معمول یہ تھا کہ میں صبح ہی دولت خانے پر پہنچ جاتا۔ زیادہ تر مولانا ہی گفتگو فرماتے اور میں چپ سنتا رہتا۔ مرحوم ہندوستان کے حالات سے کافی باخبر تھے۔ ہندوستان کے اخبارات انھیں پہنچتے تھے، اردو کی تازہ مطبوعات انھیں وہاں مل جاتی تھیں۔ ماہنامے، خاص طور پر جامعہ، معارف اور ترجمان القرآن ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے، اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہر سال ہندوستان سے حج کے لیے جو قابل ذکر لوگ جاتے تھے۔ وہ سب مولانا سے ملتے تھے۔ مرحوم کو ان ذرائع سے سب قسم کی خبریں مل جاتی تھیں، اور اس سلسلہ میں انھوں نے جامعہ کے متعلق بھی بہت کچھ سنا تھا۔ اس کی تعریف بھی اور اس کے خلاف بھی جامعہ کے کارکنوں کے ایثار و استقلال کے واقعات بھی اور جامعہ والوں کی مغرب زدگی اور نام نہاد وار دھا اسکیم کے افسانے بھی۔ غرضیکہ جامعہ میں اپنے قیام کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے وہ جامعہ کے ماثر اور ما علیہ سے مکہ معظمہ ہی میں بہت حد تک واقف ہو چکے تھے۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں مولانا واپس وطن پہنچے۔ سندھ میں اپنے عزیزوں سے ملنے کے بعد موصوف جامعہ میں تشریف لائے بے شک وہ جامعہ کو اپنا مستقر اور مرکز بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن اب ان کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ ایک جگہ پر خواہ وہ جامعہ جیسی مرکزی جگہ ہی کیوں نہ ہو مسند بچھا کر بیٹھ جاتے اور باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرتے اس کے لئے نہ تو اس وقت ملک کے حالات سازگار تھے اور نہ مولانا کی عمر ایسی تھی کہ وہ اس قدر انتظار کر سکتے۔ وہ جامعہ میں دو دو تین تین مہینے قیام فرماتے۔ اور اس مدت میں وہ دن بھر اپنے خصوصی طلبہ کو شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابیں پڑھاتے، مغرب کی نماز کے بعد قرآن کا درس ہوتا جس میں ہر خاص و عام شریک ہوتا۔ وہ جامعہ کی ہر مجلس میں آتے کہیں ابتدائی مدرسہ کے چھوٹے بچوں کو نصیحت فرماتے نظر آتے کبھی ثانوی کے طلبہ کو اپنے خیالات آسان زبان میں سناتے۔ کالج کے طالب علم ان کو بلاتے۔ اور ان سے اپنے شکوک کہتے۔ اساتذہ باری باری سے مولانا کی قیام گاہ پر حاضر ہوتے۔ موصوف گھنٹوں ان سے باتیں کرتے، ذاکر صاحب چونکہ بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں، مولینا بعض اوقات صبح کی نماز کے بعد خود ان کے مکان پر پہنچتے۔ اور ان سے گفتگو رہتی۔ بعض دفعہ ایسا ہوا کہ مولینا کو کہیں جانا ہے لیکن طلبہ نے جو کتاب شروع کی ہے، وہ ابھی باقی ہے ان کو جانا ضروری ہوتا تو یہ کرتے کہ دن بھر درس دیتے اور شام کو قدرے سستانے کے بعد پھر بیٹھ جاتے۔ اور دن رات ایک کر کے جب تک وہ کتاب ختم نہ ہوتی سفر ملتوی رکھتے۔ ان کے سفر سارے کے سارے تعلیمی ہوتے تھے۔ جامعہ میں یہ مدت گزارنے کے بعد وہ دیوبند آتے وہاں طلبہ سے ملتے، ان کو سمجھاتے کوئی پڑھنے والا مل جاتا تو اس کو پڑھاتے، دیوبند سے لاہور آتے؛ وہاں بھی ان سے استفادہ کرنے والوں کا ایک حلقہ تھا ان کو پڑھاتے۔ ایک آدھ ماہ وہاں قیام فرمانے کے بعد سندھ تشریف لے جاتے۔ سندھ میں بھی ان کے شاگرد تھے، وہ بھی اسی طرح آپ سے مستفید ہوتے۔ الغرض ایک مدت باہر گزار کر مرحوم پھر جامعہ میں تشریف لے آتے، اور

درس وتدریس کا سلسلہ نئے سر سے شروع ہو جاتا۔ یہ گویا مرحوم کا ایک معمول سا ہو گیا تھا۔ اور وہ مارچ ۱۹۳۹ء سے جون ۱۹۴۴ء تک برابر اس کے پابند رہے۔

مولینا مرحوم کو جامعہ سے دلی تعلق تھا۔ اور جامعہ والے بھی مولانا کی حد سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ مولانا کی طبیعت میں ایک گونہ سختی اور تندی تو ابتدا ہی سے تھی۔ لیکن آخر عمر میں پیہم ناکامیوں اور کبھی ختم نہ ہونے والی پریشانیوں نے ان کے مزاج کو اور سخت بنا دیا تھا۔ چنانچہ ذرا سی بات پر وہ جھلا اٹھتے۔ اور جو بھی ان کی بات ٹوکتا، اس کی بری طرح خبر لیتے لیکن جامعہ کے ماحول میں مرحوم کو یہ سکون میسر تھا کہ شیخ الجامعہ سے لے کر ایک معمولی طالب علم تک کوئی بھی ان کی کسی بات پر اعتراض نہ کرتا، اور بڑی عقیدت سے جو کچھ بھی وہ فرماتے سنتا رہتا۔ مولانا بھی جامعہ والوں کی اس بات سے بہت متاثر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ خدا کا شکر ہے کہ میں یہاں جامعہ میں اپنے اوپر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں پاتا اور جو بھی میرے جی میں آتا ہے آزادی سے کہتا ہوں۔ اور کوئی مجھے ٹوکنے والا نہیں۔

جامعہ والوں کے لئے مولینا کی ذات گرامی ایک شمع ہدایت تھی، انھوں نے جتنی بھی اپنے اندر بصیرت پائی، اس شمع سے روشنی حاصل کی۔ اور اب جب کہ مولانا ہم میں نہیں رہے، جامعہ والوں نے پورے ثبات قلب کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے کہ مرحوم نے جامعہ میں جس کام کو شروع کیا تھا، اور جن بلند مقاصد کے لئے انھوں نے جامعہ میں بیت الحکمت کی بنا رکھی تھی، وہ مرحوم کے اس کام کو بیت الحکمت کے ذریعہ تکمیل کو پہنچائیں گے بیشک مولانا جن آرزوؤں اور تمناؤں کو لے کر اپنے وطن لوٹے تھے وہ ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکیں، لیکن جامعہ کو شروع ہی سے مولانا اور مولانا کے بزرگوں سے ایک معنوی نسبت رہی ہے، اور جامعہ والوں کو ان بزرگوں کے نام لیوا ہونے پر بھی فخر ہے چنانچہ احیائے ملت کے جس کام کی بنا ان بزرگوں نے رکھی تھی، اور وہ عمر بھر اس میں

لگے بھی رہے۔ اب اگر وہ اپنی زندگی میں اس کام کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ خدانخواستہ ان کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا خود اپنا یہ وجود انہی بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ جو کام ان بزرگوں نے شروع کیا تھا، خدا نے چاہا تو وہ جامعہ کے ذریعہ تکمیل کو پہنچے گا۔ اور اس طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی آرزوئیں اور تمنائیں یقیناً پوری ہو کر رہیں گی۔

مولانا جب واپس وطن لوٹے اور جامعہ نگر آئے تو جامعہ سے انھوں نے کیا تاثرات لئے اس کا ذکر وہ اپنے مضمون میں کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"ہم ایک طویل زمانہ دوسری قوموں کی ترقی کے سامان دیکھتے دیکھتے پہلے حسرت اور پھر دحشت کے غلبہ سے پریشان ہو گئے تھے۔ اگر چند روز اور اسی طرح رہتے تو ممکن تھا کہ ہم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے ....

جب ہم جامعہ نگر پہنچے تو سب سے پہلے جامعہ کی شاندار عمارت سے ہم متاثر ہوئے۔ ہم نے استانبول میں باسفورس کے کنارے کالج دیکھے ہیں ہمیں وہی لطف جمنا کی اس وادی میں نظر آیا جب ہم اسے اپنی چیز سمجھتے ہیں تو دماغ کی گہرائیوں تک سرور محسوس ہوتا ہے.........

ہماری طبیعت جب سے ہم وطن میں آئے سبزہ اور بچوں کو دیکھ کر فی الجملہ سرور حاصل کرتی رہی۔ الحمد اللہ کہ جامعہ نگر میں ہمیں دونوں چیزیں ملیں۔

یہ جھاڑیاں چمن کی یہ میرا آشیانہ

جامعہ کے اساتذہ اور منتظمین کو جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں وہ اس تحریک کی ہمدردی سے معمور ہیں ہم اسے اللہ رب العزت کی ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں "

مولانا کا جامعہ نگر میں قیام ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی وقت وہ ایسا نکال لیتے تھے

جس میں وہ ذاکر صاحب سے ملتے اور ان سے اپنی دلی باتیں کہتے۔ ۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کو پنجاب اور سندھ کے دورے کے بعد مولانا جامعہ نگر لوٹے اور دوسرے دن بہت سویرے وہ ذاکر صاحب سے ملنے ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ راقم الحروف ان کے ساتھ تھا خیر خیریت پوچھنے کے بعد مولانا باتوں باتوں میں فرمانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ کا بیحد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری بات سُنی، اور اسے سمجھا۔ میں حجاز سے چلا تھا تو یہ فیصلہ کر کے چلا تھا کہ اگر مجھے کہیں جگہ مل سکتی ہے۔ تو وہ جامعہ ہی ہے مجھے اس امر کا یقین تھا کہ جامعہ کے سوا اور کوئی مجھے اپنے ہاں رکھنے کو تیار نہیں ہوگا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی ادارہ بڑے چاؤ سے مجھے اپنے ہاں بلائے۔ لیکن ایک آدھ ماہ بعد جب وہ میرے افکار سے پوری طرح واقف ہو۔ تو وہ مجھ سے تنگ آجائے اور ناچار مجھے وہاں سے جانا پڑے۔ یہ خیال بری طرح مجھ پر مسلط تھا۔ چنانچہ جب میں ہندوستان آیا تو میں نے ہر گروہ کو اپنے آپ سے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ مولویوں کو یہ کہہ کر بھگا دیا کہ اگر میرے پاس آنا چاہتے ہو، تو داڑھی مونڈھو اور سوٹ پہنو۔ جمعیۃ العلماء والوں کو کہا کہ تمہارا وجود ہی سرے سے بیکار ہے۔ جمعیت کو توڑو اور کانگرس میں شریک ہو جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب! دراصل ان تمام باتوں سے میرا مقصد یہ تھا کہ میرے متعلق کسی کو غلط فہمی نہ ہو اور کوئی خوش اعتقادی میں مجھے اپنانے کی کوشش نہ کرے۔ خدا نے کیا میری یہ تدبیریں کامیاب ہوئیں، اور سب جماعتیں مجھ سے الگ ہو گئیں، ہاں جامعہ کے متعلق میرا قیاس ٹھیک نکلا۔

اگست ۱۹۴۴ء میں مولانا کراچی میں بیمار تھے۔ میں بھی خدمت میں پہنچا کمزوری حد سے زیادہ تھی اور آنتوں نے کام کرنے سے بالکل جواب دے دیا تھا۔ چنانچہ ان پر اکثر غشی طاری رہتی تھی جب طبیعت سنبھلتی تو بولتے اور ایک دو باتیں کر لیتے، آخر میں جب مجھے رخصت کیا تو فرمانے لگے۔ خدا نے کیا ہمارا کام خوب چلے گا۔ میرا فکر اگر دہلی

سے بے تعلق ہو گیا تو اس کے معنی اس کی موت کے ہیں۔ اور اگر اس فکر نے سندھ کو اپنا عملی مرکز نہ بنایا تو میں سمجھوں گا کہ میرا فکر بے ثمر رہا۔ تم دہلی جا رہے ہو، ڈاکٹر صاحب کو میرا اسلام کہنا اور میری طرف سے اتنا عرض کرنا کہ اب یہ سب آپ کے سپرد ہے۔ اگر آپ نے اس فکر کو اپنا لیا تو میں سمجھوں گا کہ میں کامیاب ہو گیا

میں واپس دہلی پہنچا تو مولانا اپنے رب کے ہاں سدھار چکے تھے، ذاکر صاحب سے ملاوہ مولانا کے مرض الموت کے حالات سنتے رہے، اور جب میں نے ان کو مولانا کا پیغام سنایا تو میں نے دیکھا کہ ذاکر صاحب کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں اور وہ انھیں روکنے کی کوشش میں ہیں

(محمد سرور)

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم

جن کی آرزوں کا آخری مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے

عبد المجید خواجہ اور جامعہ ملیہ

تحریک ۱۹۲۰ء ہمارے ملک کی وہ انقلابی تحریک ہے جس نے ہندوستانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور عمل کی ایک نئی لہر پیدا کردی۔ اس تحریک نے ملک کے ہر طبقہ کو بیدار کیا، غفلت کی نیند کے ماتوں کو جگایا اور جو اس کے اشارے پر نہ اُٹھ سکے ان کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کیا اور میدانِ عمل میں لاکر سرگرمِ عمل کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ غربا اور عوام سے لے کر کوٹھیوں میں رہ کر دادِ عیش دینے والے امرا اور سیم و زر سے کھیلنے والے سرمایہ داروں نے بھی اپنا پارٹ ادا کیا، اُنھوں نے عزتیں چھوڑیں اور تکلیفوں اور مصیبتوں کو دعوتِ عام دے کر ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

ہمارے خواجہ صاحب اس تعلیم یافتہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ملک اور وطن کی خاطر، زمانہ اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی عزّت، دولت، حشمت چھوڑی اور ہمہ تن جذبہ و ولولہ بن کر میدان میں کود پڑا اور اس طرح کہ پھر پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔

ایسی انقلاب انگیز اور ولولہ پرور تحریکوں میں شریک ہونے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو وقت کی روش پر محض ہیجانی طور پر کچھ مجبوراً اور کچھ ارادتاً چل پڑتے ہیں لیکن ان کے سامنے نہ کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ نشانِ راہ نہ کوئی سوچا سمجھا لائحہ عمل ہوتا ہے اور نہ کوئی منصوبہ۔

خلافت کی تحریک میں شریک ہونے والے بھی اکثر ایسے ہی لوگ تھے جن کے دل و دماغ اس تخریب کے بعد تعمیرِ نو کا کوئی پروگرام نہ رکھتے تھے وہ اس تحریک میں جان و مال کی بازی لگا کر شریک تو ہو گئے تھے لیکن ان کو جانا کہاں ہے؟ منزل کون سی ہے؟ کچھ خبر نہ تھی۔

ان کے برعکس ایک دوسری جماعت جو تعداد میں تو شاید کم تھی اور اس کے اندر استناسیجان اور جذبہ بھی نہ تھا لیکن وہ اس تحریک میں محض وقتی جوش کی بنا پر نہیں چل کھڑی ہوئی تھی بلکہ اس نے خوب سوچ سمجھ کر، غور و فکر کے بعد آگے قدم بڑھایا تھا

ان کے سامنے ایک متعین منزل تھی جس تک وہ پہنچنا چاہتے تھے اور ایک سمجھا بوجھا منصوبہ، ایک مستقل لائحہ عمل اور تعمیر کا ایک مکمل خاکہ تھا۔ یہ لوگ پہاڑ کی طرح تھے جن کو حوادث کا کوئی طوفان اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ کر سکا۔ ہمارے خواجہ صاحب بھی اسی باہمت، باعمل اور خوش قسمت گروہ کے ایک فرد تھے۔ چنانچہ اُن کی زندگی شاہد ہے کہ اُنھوں نے ہر قسم کی تکلیفیں اٹھائیں لیکن وہ ڈگر نہ چھوڑی اور اُس منصوبے کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جس کو وہ لے کر آگے بڑھے تھے۔

عدم تعاون کی تحریک صرف ہندوؤں یا مسلمانوں کی نہ تھی بلکہ یہ ایک مشترکہ اظہار تھا اس بات کا کہ ہندوستانی اب کسی صورت سے بھی انگریز پرستی اور انگریزوں کی چوکھٹ کے سامنے جبیں سائی نہ کریں گے، اُن کی ملازمت، اُن کی طرزِ زندگی، اُن کی سیاست غرض ہر اُس چیز سے جو انگریز کی طرف منسوب تھی، بغاوت کرنا اس تحریک کا مقصد تھا۔ لوگوں نے نوکریاں چھوڑیں۔ طلبہ نے اسکول اور کالج کو خیرباد کہا، ملازمت پیشہ لوگوں کا کوئی نہ کوئی وسیلہ نکل آیا۔ لیکن قوم کے بے شمار نوجوان جو تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ادھورے تھے، ان کی تعلیم کی تکمیل کے لئے ایک ایسی درسگاہ کا سوال پیدا ہوا

جو سرکاری مدرسوں کا نعم البدل ہو اور صحیح قومی اور ملی اصولوں پر قائم ہو۔ چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آئی۔

جامعہ ملیہ کے بنانے والوں میں وہ سب لوگ شریک تھے جو سیاسی تحریک کے علمبردار تھے یہی لوگ نئی تعلیم اور نئے تعلیمی اصولوں کے حامل تھے۔ ان حضرات میں مختلف خیال اور مختلف عقیدے کے لوگ تھے، ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو سیاسی زندگی اور سیاسی کام اور اسی کی ہنگامہ خیزیوں میں گم ہو جانا حاصل عمل سمجھتے تھے۔ یہ لوگ جامعہ کو محض سیاست کا ایک ایسا اکھاڑا بنانا چاہتے تھے جہاں سے پہلوان داؤ پیچ سیکھ کر میدان میں سیاسی کشتی جیتنے کے لئے اتر آئے۔ ان کا خیال تھا کہ جامعہ میں تعلیم صرف اس لئے ہونی چاہئے کہ طالب علم سیاست میں عملی حصہ لے اور اس تحریک میں ہماری مدد کرے اور چونکہ ان میں اس وقت کے جلیل القدر زعما اور با اثر قائدین پیش پیش تھے اور انھیں کی کوششوں کا نتیجہ جامعہ تھی اس لئے یہی حضرات جامعہ پر چھائے ہوئے تھے۔ خلافت کمیٹی سے جامعہ کو مالی امداد ملتی تھی اور وہی میزانیہ بناتی تھی، چنانچہ جامعہ تقریباً دو سال تک اسی سیاسی ڈگر پر چلتی رہی، یہاں سے مجاہدین کی جماعت تیار ہو کر خلافت کے کام کے لئے دیہاتوں میں نکل جاتی، تقریریں کرتی۔ لوگوں کو تحریک میں شریک ہونے کی دعوت دیتی اور ایک گانو سے دوسرے گانو تک پہنچتے پہنچتے گرفتار ہو جاتی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم کو جس باقاعدگی اور نظم کی ضرورت ہے وہ اکثر مفقود تھی اور تعلیم بے جان ہو کر رہ گئی۔

یہ تعلیمی نقصان اس فائدے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھا جو ان کے ذریعے سیاست کو پہنچتا تھا۔

مگر قومی رہنماؤں کا ایک گروہ اس پالیسی کے خلاف تھا کہ جامعہ کو سیاست کا ایک اکھاڑہ بنا کر قوم کے نوجوانوں کی قابلیتوں سے صرف عملی سیاست کا کام لیا جائے

وہ جامعہ کو صرف تعلیمی کام کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ تعلیم کا سیاست سے بہت گہرا تعلق ہے، نہ بغیر سیاست تعلیم مکمل ہوتی ہے اور نہ بغیر تعلیم کے سیاست، لیکن تعلیم کی ایک الگ دنیا ضرور ہونی چاہئے تاکہ وہ سکون واطمینان کی فضا میں نئی نسلوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کر سکے تعلیمی اداروں کا یہ کام ہے کہ وہ سیاست کے ہر مسئلے پر محض علمی نقطۂ نظر سے غور کریں اور اپنے نتائج فکر سے قوم اور ملک کو آگاہ کریں۔ غرض یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر جامعہ کے بعض محسنین موجودہ پالیسی کے خلاف تھے چنانچہ ان لوگوں نے کوشش کر کے جامعہ کو اس راستے سے ہٹایا اور صحیح شاہ راہ پر لے آئے۔ اُنھوں نے اعلان کر دیا کہ جامعہ کا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک آزاد خود مختار تعلیمی ادارہ ہے جو اپنے دائرۂ عمل میں کسی بیرونی مداخلت کو گوارا نہیں کرتا اس کے علاوہ ایک دوسری تجویز کے ذریعے یہ بھی منظور کیا گیا کہ جامعہ کا فنڈ خلافت سے الگ رہنا چاہئے۔ اس جماعت میں حکیم اجمل خاں مرحوم۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم پیش پیش تھے لیکن ان حضرات کو جامعہ کی اندرونی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا تعلیمی منصوبوں کو بروئے کار لانے اور جامعہ کو ایک صحیح تعلیمی ادارہ کے نہج پر چلانے کا بڑا اور اہم کام جناب عبدالمجید خواجہ صاحب کے ذمہ تھا کیونکہ آپ اس وقت شیخ الجامعہ تھے اور جامعہ کو صحیح تعلیمی ادارے کی شکل میں دیکھنے کی لگن آپ کو دل سے لگی تھی، اور سچ پوچھئے تو حکیم صاحب مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کو جامعہ کی اس ضرورت کی طرف خواجہ صاحب نے ہی توجہ دلائی۔

اب جب کہ جامعہ کے مطلع سے سیاسی بادل چھٹ چکے تھے خواجہ صاحب کو اپنے ہم خیال سیاسی رہنماؤں کی مدد سے کام کرنے اور اپنی خدا داد صلاحیتوں کی بدولت جامعہ کو اس کے صحیح مقصد پر چلانے کا موقع ملا۔ چنانچہ اُنھوں نے تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا، مختلف تعلیمی اداروں کی تشکیل کی، نئے شعبے اور نئے ادارے کھولے۔ اُنھوں نے صرف کالج کی تعلیم پر اکتفا نہ کی بلکہ ایک طرف ایم اے، آنرز تحقیق مطالعہ کا ادارہ کھولا اور

دوسری طرف مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کا بھی انتظام کیا تاکہ قوم کے بچوں کو جامعہ کے اس چشمۂ فیض سے پوری طرح سے سیراب ہونے کا موقع مل سکے۔ موصوف کے زمانے میں ایسا تعلیمی اسٹاف جامعہ میں جمع ہوگیا تھا جو سب اپنے فن کے امام کہے جاسکتے ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم۔ ڈاکٹر شیخ محمد عالم، محمد حبیب صاحب بی اے، آنرز، (آکسن)، مولانا محمد سورتی مرحوم، بابو پی کے باسو سابق پرنسپل ہندو کالج۔ بابو چند ڈے صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب۔

موصوف نے محسوس کیا کہ ہماری موجودہ سرکاری تعلیم گاہیں سوائے سستے داموں کے غلام پیدا کرنے کے اور کوئی مفید جذبۂ عمل یا خدمت کا اعلیٰ تصور اور زندگی کا بلند مقصد اپنے طالب علموں کے سامنے نہیں رکھتیں۔ اس لئے نہ وہ دنیا کے کام کے رہتے ہیں اور نہ دین کے۔ حالانکہ مسلمان ان دونوں میں سے کسی کو چھوڑ کر فلاح و سعادت نہیں حاصل کرسکتا۔ چنانچہ انھوں نے جامعہ میں دینی اور دنیاوی تعلیم کا ایک ایسا مکمل خاکہ تیار کیا جس میں دونوں علوم یکجا سمو دئے گئے تھے اور طلبہ کی تربیت اس نہج پر کی کہ وہ حکومت اور امرا کے رحم وکرم اور ان کی سرپرستی میں زندگی نہ گذاریں بلکہ اُن سے آزاد رہ کر آزاد اور خود مختار زندگی اپنے قوتِ بازو اور اپنی محنت کے بل بوتے پر بسر کریں، اُنھوں نے کتابی اور مخصوص نصابی طریقۂ تعلیم کے علاوہ دستکاری اور گھریلو صنعتوں کی تعلیم بھی ضروری سمجھی، اور اس کا بھی انتظام کیا۔ اُن کے زمانے میں جرنلزم کے علاوہ الیکٹر پلیٹنگ، طباعت، قفل سازی۔ پارچہ بافی وغیرہ کی تعلیم شروع ہوئی تاکہ طلبہ میدان عمل میں خالی ہاتھ اور خالی دماغ نہ جائیں بلکہ علم وفن کے علاوہ صنعت وحرفت کے بھی ماہر ہوکر نکلیں۔ اس کے علاوہ تصنیف وتالیف سے شوق رکھنے والوں کے لئے تصنیف وتالیف اور مکتبہ قائم کیا گیا تاکہ انھیں علمی خدمت کا موقع مل سکے۔

جامعہ کے کاموں کو اس طرح منظم کر کے پیش کرنے اور اس کو نمونے کی ایک درسگاہ بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ہر طرف قومی نظام تعلیم کا چرچا ہونے لگا برسوں کے سوئے اور ایک ڈگر پر آنکھ بند کر کے چلے جانے والے ادارے بھی چونکے اور انھوں نے جامعہ کے کام کو دیکھا اور اپنی اصلاح کی۔ ان قدیم مدارس کے علاوہ ملک میں جگہ جگہ نئے سکول کالج اور مدرسے قائم ہوئے اور ان کا الحاق جامعہ سے ہوا۔

جامعہ کے تعلیمی خاکہ کی تیاری میں اس وقت کے سب سیاسی رہنما کسی نہ کسی حیثیت سے شریک تھے اور تحریک خلافت کا اس میں کافی دخل تھا۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد جامعہ کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی۔ کام کرنے والوں کی طبیعتیں مردہ اور قویٰ مضمحل ہو گئے، جامعہ کے اکثر معاونین اور ہمدرد اس ردعمل میں جامعہ سے کنارہ کش ہو گئے اور اس کے دہلی منتقل ہوتے وقت اس کے بہت سے اچھے اور قابل کارکن بھی ہمت ہار گئے اور جامعہ کو خیرباد کہہ کر چلے گئے لیکن خواجہ صاحب کی ذات گرامی ان مصائب سے نہ گھبرائی اور اُن کی پیشانی پر بل بھی نہ آیا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تندہی اور جاں سوزی سے جامعہ کے کاموں میں لگے رہے۔ بادِ مخالف کا کوئی جھونکا، مصائب کا کوئی طوفان، اُن کے پائے ثبات کو لغزش نہ دے سکا اور اس وقت تک وہ برابر جامعہ کی خدمت کرتے رہے: جب تک اُنھوں نے اس کی باگ ڈور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے لائق ہاتھوں میں نہ دیدی۔

عبدالحلیم ندوی

خواجہ عبدالمجید صاحب

سابق شیخ الجامعہ اور موجودہ امیر جامعہ

ذاکر صاحب

ذاکر صاحب کو کوئی برا کہتا ہے تو میں بھونچکارہ جاتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد جو بات میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ یا تو یہ شخص شیطانِ محض ہے یا ناواقفِ محض۔ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ذاکر صاحب سے واقف نہ ہوں۔ اس کے بعد ذاکر صاحب کے بارے میں غیر شریفانہ خیالات رکھنا یا پھیلانا شیطنت نہیں تو اور کیا ہے۔ کیسے یہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو ہر چیز پر قربان کر دیتے ہیں۔

مجھے آج کم و بیش ۴۱ سال علی گڑھ میں رہتے، بستے گذرے ہیں۔ میں نے علی گڑھ کی زندگی کا ہر پہلو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ اس دوران میں جتنے لوگ طالب علمی کے مراحل سے گذرے ہیں ان میں سے سب کو نہیں تو بیشتر کو جانتا ہوں اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہاں کا ہر طالب علم اپنے عہد کے تقریباً ہر طالب علم سے کم و بیش واقف ہوتا ہے۔ میں نے آج تک یہ نہ دیکھا کہ یہاں کے جن لوگوں کی طالب علمی کی زندگی جیسی رہی ہو اس سے مختلف ان کی پبلک لائف ہو۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہر حال میں ہر جگہ ملیں گے ان کا کردار بجنسہٖ وہی ہوگا جو یہاں تھا۔ خواہ وہ بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہوں خواہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ پر۔ یہ بات علی گڑھ کے سوا کہیں اور بمشکل ملے گی۔

علی گڑھ کی خصوصیت یہاں کی اقامتی زندگی ہے۔ یونیورسٹی کے حدود سے باہر طلبا کے لئے تفریح کی کوئی جگہ نہیں۔ کوئی دریا نہیں، پہاڑ نہیں، باغات نہیں، پُر رونق بازار نہیں، تاریخی آثار نہیں سال میں ایک بار نمائش البتہ ہوتی ہے جب طالب علم

کباب پراٹھے کھاتے اور کبھی کبھار پولیس والوں کے "سراپا ناز" ہوتے یا نہ ہونے کا جشن مناتے ہیں! اس لئے گھوم پھر کر ہر طالب علم کو فرداً فرداً یا مجموعی طور پر اپنے دلچسپی کا سامان یونیورسٹی کے احاطے کے اندر ہی مہیا کرنا پڑتا ہے۔ کرکٹ ہاکی، فٹ بال ٹینس، سوئمنگ باتھ، ڈائننگ ہال، یونین کلب، الیکشن، ٹڈرائٹ، چارپائی الٹنا، سرسید کی فاتحہ ہی میں جوانی کی ترنگ دکھاتے رہتے ہیں۔

علی گڑھ میں ہر طرح کے نوجوان طلبا ہر گوشۂ ملک سے آتے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذاق یا میلان کا ہو۔ اپنا رفیق و ہمدم ملجاتا ہے علی گڑھ کی اس خصوصیت کا یہ اثر ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم رفتار، گفتار و کردار میں بے نقاب ہو کر رہتا ہے خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ کوشش کرے یہی سبب ہے کہ یہاں کے ہر طالبعلم کا ایک رابطہ نہانی علی گڑھ سے مدت العمر قائم رہتا ہے۔ اور وہ علی گڑھ کی یاد کو اپنی زندگی کی سب سے اچھی یاد سمجھتا ہے چنانچہ کسی علی گڑھ والے کو میں پبلک لائف میں پاتا ہوں۔ تو اس کے طالب علمی کے اعمال نامہ پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لیتا ہوں کہ وہ کیا ہے یا کیسا ہے خواہ پبلک میں اس کے اعزاز میں نعرہ ہائے تحسین بلند کئے جا رہے ہوں، خواہ نعرہ ہائے نفریں۔

ذاکر صاحب اور ان کے تین اور بھائیوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ یہ خاندان تقریباً بارہ سال تک علی گڑھ کی رزم و بزم میں پورے طور پر بے نقاب رہا۔ وہ بھی اس زمانے میں جب علی گڑھ اپنے طنطنہ اور دبدبہ کے نصف النہار پر تھا۔! جب یہاں دوسرے درجہ کی کوئی بات معاف نہیں کی جاتی تھی اور ہر شخص کی ہر حرکت ایسی میزان میں تلتی رہتی تھی جو بڑی ہی بے درد و بے خطا تھی۔ ذاکر صاحب کے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں مرحوم اور منجھلے بھائی عابد حسین خاں مرحوم کی شرافت قابلیت اور ذہانت

کا اس عہد میں جواب نہ تھا چھوٹے بھائی زاہد حسین خاں مرحوم نے فرسٹ ایر ہی میں وفات پائی۔
اس زمانے کے لوگ اب بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا کہ ان بھائیوں کا معلم
طلباء اور اساتذہ میں کیا درجہ اور رکھ رکھاؤ تھا اور آج تک اس پایہ کے اور طالب علم علیگڈھ
سے نکلے یا نہیں۔

ذاکر صاحب کے سب سے چھوٹے دو بھائیوں نے ذاکر صاحب ہی کی سرپرستی میں
جامعہ میں تعلیم پائی ان میں ڈاکٹر محمود حسین خاں ڈھاکہ یونیورسٹی میں، اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر ہیں۔ ان دونوں کی زندگی بھی ہم سب کے سامنے ہے۔ میں
ان سارے بھائیوں کو جب ذہن میں لاتا ہوں تو اقبال کا یہ مشہور شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہو بے داغ، ضرب ہو کاری

بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ وہی شخص کھرا ہے جو علی گڑھ میں کھرا رہا۔ اور وہ یقیناً کھوٹا ہے
جو علی گڑھ میں کھوٹا تھا!

ذاکر صاحب کے زمانے میں بھی طالب علم وہ سب کرتے تھے جو کم و بیش آج کرتے
ہیں لیکن فرق یہ تھا کہ اس زمانے میں کوئی تحریک یا ہنگامہ خواہ کسی قسم کے طالب علم نے
کسی بنا پر اٹھایا ہو اس کی سربراہی صرف وہ کرتا تھا جو معاصر طلبا میں اپنی قابلیت، سچائی
اور وقار کے لئے مشہور ہوتا۔ اس زمانے کی روایت یہ تھی کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے
ایف۔ اے تک کا کوئی لڑکا، خواہ وہ کوئی ہو، کسی معاملے میں دم نہیں مار سکتا تھا۔ تھرڈ
ایر سے وہ کالج کی زندگی میں دخیل ہونا شروع ہوتا تھا۔ اگر وہ کہیں اور سے ایف اے کر کے
آیا ہے تو پھر اس کی حیثیت صرف نووارد یا FRESHERS کی ہوتی تھی۔ اور اس کا رتبہ
قریب قریب ایف اے والوں کا ہوتا۔ اور علی گڑھ میں جو شخص باہر سے بی اے کر کے آیا
وہ شاید ہی کبھی برادری کا آدمی سمجھا گیا۔ ذاکر صاحب کسی ہنگامے کے کبھی بانی نہ ہوئے لیکن

ایسا کوئی موقعہ آجاتا تھا تو تمام طلبا متفق ہو کر انھیں کو اپنا پیشوا قرار دیتے۔ ذاکر صاحب کی جماعت اساتذہ میں بھی بڑی مان دان تھی اس لئے جب کبھی وہ کسی تحریک کی سربراہی کرتے تو ان کی باتوں کو وقعت دیجاتی اور طالب علموں سے اکتانے یا بیزار ہونے کے بجائے ارباب حل و عقد، ان کے حقوق اور وقار کی اہمیت تسلیم کرتے تھے۔

غالباً ۱۹۲۰ء کا زمانہ یہ تھا۔ ایم اے۔ او کالج کے یوروپین اسٹاف نے بالاتفاق استعفا دے دیا۔ یہ بڑا نازک اور معرکے کا وقت تھا۔ قوم کے اکابر جمع تھے۔ ایسے مواقع پر علیگڈھ میں بالعموم یونین کا جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں تمام Big guns قلعہ شکن توپیں" مدعو ہوتی ہیں۔ سربرآوردہ طلبا، اساتذہ اور باہر سے آنے والے مقرر خوب خوب تقریریں کرتے ہیں۔ سر علی امام مرحوم تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ حاضرین پر مکمل سکوت طاری تھا۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ٹرکش کوٹ اور سفید پائجامے میں ملبوس طلبا کا شاندار مجمع عجب سماں پیدا کر رہا تھا۔ سر علی امام نے بڑے وقار کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اور ابتدائی فقروں کو تول تول کر بولنا شروع کیا اور فرمایا کہ مجھے استعفاء کی اچانک خبر ملی اور میں سوچ رہا...... یہاں پہنچ کر کسی قدر زیادہ توقف کیا کہ ذاکر صاحب نے لقمہ دیا" جی ہاں علی گڈھ کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو اچانک گرفتار کر لیتا ہے اور نکل بھاگنے کے سارے راستے منقطع کر دیتا ہے۔ (انگریزی کا فقرہ یہ تھا one feature of Aligarh is that it always takes you by surprise and cuts all meanes of escape)

علی امام اچھل پڑے اور سارا مجمع فرط آفریں سے جھومنے لگا۔

ابر اٹھا تھا کعبہ سے جھوم پڑا میخانے پر

سر علی امام نے ذاکر صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا، شاباش، خوب کہی۔ اس کے بعد مقرر نے نہایت آزادی اور بے باکی سے تقریر شروع کر دی۔ ذاکر صاحب کا یہ فقرہ علی گڈھ میں مدتوں مقبول رہا۔ ممکن ہے کسی منحوس نے اس کو کبھی اسطور پر استعمال کر دیا ہو کہ جب

سے آج تک یہ جملہ پھر کبھی، علی گڑھ میں استعمال نہ ہوا اور نہ ایسا کوئی موقع آیا۔

۱۹۲۰ء میں ہم سب صاحب باغ میں ایم اے پریویس اور قانون کے طالب علم تھے۔ قانون کے امتحان میں مشکل سے ۱۵ دن باقی تھے اور کورس سارے کا سارا کورا تھا کئی دن سے ہم لوگوں کی توجہ اس مصیبت پر مرکوز تھی۔ ذاکر صاحب کہتے تھے، پڑھنا تو ہے ہی چاہے امتحان سے پہلے پڑھا جائے چاہے بعد میں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ناشتہ اور کھانے کا مکمل پروگرام بنا لیا جائے نصیر مرحوم نے پوچھا، پروگرام سے تمھارا کیا مطلب ہے۔ ذاکر صاحب نے کہا، آپ نے دو باتیں ایک ہی سانس میں کیوں پوچھ لیں۔ آپ پروگرام کے بارے میں میری ہدایت چاہتے ہیں۔ یا صرف مطلب دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے دونوں ایک نہ ہوں! نصیر صاحب نے ذرا چیں بہ جبیں ہو کر کہا ذاکر تم پڑھائی میں گھنڈت ڈالنے آئے ہو اور اب بھی اس کے درپے ہو۔ اچھا بتاؤ، پروگرام اور مطلب میں کیا فرق ہے؟ ذاکر صاحب نے کہا، پروگرام تو عوام کے لئے بنایا جاتا ہے، اور مطلب اپنا ہوتا ہے۔ پروگرام تو یہ بتائے گا کہ کون کون سی چیزیں، کس کس وقت کھانے پر موجود ہوں گی اور مطلب یہ ہے کہ کس کو کیا اور کتنا ملے گا۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کھانا ہر حال میں ڈائننگ ہال ہی کا ہوگا۔ لیکن پروگرام کے ساتھ کھانے سے ذرا کھانے والوں کی آبرو بڑھ جاتی ہے۔

بڑی رد و قدح کے بعد پروگرام بھی بنا اور مطلب کی بھی رعایت رکھ دی گئی۔ پڑھائی شروع ہوئی، ہم تین چار آدمی ساتھ پڑھتے تھے، ذاکر صاحب ہیں، سید نصیر الدین علوی مرحوم اور خلیل الدین مرحوم۔ بحث اس پر چھڑی کہ بہ آواز بلند کون پڑھے۔ اس پر کوئی نہیں تیار ہوتا تھا۔ نصیر مرحوم ہکلاتے تھے ان کو پڑھنے سے معاف کر دیا گیا تھا اور بحث کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی خلیل مرحوم پڑھنے سے شرماتے تھے

ان کا کالج کا نام بھی گلفام تھا۔ میں نے کہا، میں پڑھنے کے لئے تیار ہوں لیکن پھر ذاکر صاحب نے قائم گنج سے جو گھی منگوایا ہے وہ دوپہر اور شام کو دال میں ڈالنے کے لئے دو چمچے زائد لوں گا۔ نصیر صاحب طیش میں آکر بولے ...... ہر ...... ہر ...... ہرگز ...... نہیں ...... میں ...... پ پ پ ...... پڑھوں گا۔ میں نے کہا، تو پھر میں تین چمچے لوں گا۔ ذاکر صاحب بولے وہ کیوں، میں نے کہا نصیر صاحب پڑھیں گے تو مجھے ایک چمچہ سر میں بھی ڈالنا پڑے گا۔ ذاکر صاحب نے کہا پڑھنے کے لئے میں تیار ہوں لیکن صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میں آپ سب سے تین منٹ پہلے کھانا شروع کر دوں، اس کے بعد آپ لوگ شروع کریں۔ اس پر ہر شخص بیک وقت چیخ پڑا اور بولا ہرگز نہیں۔ ہم پڑھنے کے لئے آئے ہیں بھوکوں مرنا نہیں چاہتے!

غرض پڑھائی شروع ہوئی۔ علوی مرحوم اور ذاکر صاحب میں کبھی کبھی قانونی نکتوں پر بڑے لطف کی اور بڑے زور شور سے بحث ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ بحث طوالت پکڑ گئی تو علوی مرحوم نے جھنجھلا کر کہا اس قانون کو بناتے وقت واضع نے غالباً آپ سے مشورہ کر لیا تھا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا، اس نے تو مشورہ نہیں کیا لیکن آپ کو میرا مشورہ یہی ہے! اس جملے پر مرحوم کا فرط مسرت سے ناچنا، کودنا اور قہقہے لگانا اب بھی یاد آتا ہے۔ صاحب باغ ہی میں ایک صاحب اور تھے جو اپنے آپ کو بڑا قانون داں گردانتے تھے اور قانونی بحثوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی ہائی کورٹ کی جدید ترین نظیر پیش کر دیا کرتے تھے ان کے چہرے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی نظیر آسمان سے نازل ہونے والی ہے یا اللہ تعالےٰ نے ان کا رتبہ خاطر میں لائے بغیر ان کو دنیا میں بھیج دیا۔ یہ رات بھر تو قانون پڑھتے تھے اور دن بھر پڑھنے والوں کے ہاں باری باری پہنچ کر یا تو اونگھتے تھے یا ہر شخص کو قانونی سمجھ کر ہیچ پوچ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ہم لوگوں میں بھی آ بیٹھتے تھے۔ ان کے آجانے سے بڑی سوخت

ہوتی تھی، لیکن ذاکر صاحب سب چھوڑ چھاڑ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب کچھ تو یہ تھا کہ یہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح پڑھنے کا سلسلہ ٹوٹنے، اور کچھ اس سبب سے کہ ذاکر صاحب کو سر پھرے احمقوں سے یوں بھی بڑی الفت تھی اور ان کے ہاں ہیں ہاں ایسی ملاتے تھے اور اپنی طرف سے ایسی ایسی گڑھتے تھے کہ کوئی ناواقف دیکھے تو ذاکر صاحب کو معلوم نہیں کیا کہے۔

میں نے ایک دن کہا ذاکر صاحب اس غریب پر رحم کیجئے۔ اس پر نہیں تو اس کے والدین یا اس کی آیندہ ہونے والی بیوی بچوں پر ترس کھائیے۔ ساری منزلیں تو یہ خود طے کر چکا ہے۔ یہ آپ سہارے دے دے کر اس کو تباہی کے گڑھے میں ہمیشہ کے لئے کیوں گراتے ہیں۔ ایک روز ہم سب بڑے انہماک اور لطف سے پڑھائی میں مصروف تھے کہ یہ آن پہونچے۔ اس دفعہ ذاکر صاحب بھی کسی قدر منغض ہوئے۔ حسب معمول نووارد نے ایک موقعہ ڈھونڈھ نکالا اور نکتہ چینی شروع کر دی۔ گفتگو ہوتے ہوتے یہاں تک پہونچی کہ نووارد نے کہا، ذاکر صاحب معاف فرمایئے گا۔ آپ اچھی وکالت تو کر سکتے ہیں مگر جج یا واضع قانون ہونا بالکل علیحدہ بات ہے۔ ذاکر صاحب نے کہا۔ یہ آپ واقعہ بیان کر رہے ہیں یا بشارت دے رہے ہیں۔ انھوں نے ایک ہلکے سے زہر خند کے ساتھ فرمایا، دونوں۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا میں واضع قانون ہوتا تو آپ یقین فرمائیں، آپ دنیا میں سب کچھ کرنے پاتے قانون پڑھنے نہ پاتے اور میں جج ہوں گا تو آپ کو معذور قرار دے کر آپ کے لئے ہمیشہ عدالت یا حکومت کے خرچ پر کوئی معقول وکیل مقرر کرا دیا کروں گا۔ اس پر علوی مرحوم اچھل پڑے اور نووارد کو گود میں لے کر اس طرح ناچے کہ سارا صاحب باغ اکٹھا ہو گیا۔ ...... نووارد نے دوسرے دن بورڈنگ بدل دیا۔

ہمارے کمرے صاحب باغ کی دوسری منزل پر شرقی سمت واقع تھے سامنے برآمدہ تھا۔ برآمدے سے اتر کر لمبا پتلا صحن جہاں ہم سب بیٹھے پڑھنے میں مصروف تھے۔

رات زیادہ آ چکی تھی۔ سامنے درختوں کے تاریک گنبد ہجوم کے ٹھیک اوپر چاند برآمد ہو رہا تھا۔ سب کی نظر یک بیک چاند پر پڑی جو اس درجہ خاموش خوبصورت الگ تھلگ اور حزیں نظر آیا کہ سب کے سب تھوڑی دیر کے لئے دم بخود ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نامعلوم قوت نے یک بیک ہمارے حواس سلب کر لئے ہوں اور ہم کو ہمارے گرد و پیش سے اٹھا کر ایسے عالم میں پہونچا دیا ہو جہاں جسم و جان صرف احساس حسن و حیرت میں جذب ہو کر رہ گئے ہوں۔

ذاکر صاحب کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ دونوں کہنیاں میز پر تھیں اور ہاتھوں کی دو انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے یوں کھولے ہوئے تھے جیسے "بادام" کے عوض نکال کے بھیجنے والے تھے۔ میں نے کہا ذاکر صاحب یہ کیا؟ ذرا چاند کی طرف دیکھئے گا، کہیں سے جنبش کھائے بغیر بولے۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں!

ثاقب لکھنوی کی ایک غزل علی گڑھ کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جسکا یہ شعر بہت مشہور ہوا اور ہر شخص کی زبان پر تھا۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابر بہار جانب کہسار دیکھ کر!

سب ہنس پڑے اور منظر کا سحر کافور ہو گیا۔ علوی صاحب نے پوچھا، ذاکر، آخر یہ ہے کیا؟ کہنے لگے، نہ نیند مانتی ہے، نہ آپ ملتے ہیں، کروں کیا —— نیند آتی ہے پر نہیں جاتی!

دوسرے ہی دن طالب علموں کا ایک ہجوم صاحب باغ پہنچا، معلوم ہوا کسی مسئلہ پر طلباء نے اجتماعی طور پر احتجاج کیا ہے اور ذاکر صاحب سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ وہ اس کی سربراہی کریں۔ ذاکر صاحب فی الفور ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ تین

چار دن تک ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ایک دن یونین کے دار المطالعہ میں مل گئے۔ میں نے پوچھا کیسی رہی بولے بخیر گزشت۔ میں نے کہا، اور جناب پڑھائی ؟ فرمایا اس ہنگامے میں جو دل و جان سے منہمک رہا اس کا کچھ تو اجر ملنا چاہیئے تھا، اللہ نے آپ لوگوں سے نجات دلائی۔ اور کھانا پینا ؟ میں نے پوچھا۔ بولے قوم کا کام کرنے والا بھوکا نہیں مرتا میں نے کہا ذرا احتیاط رکھئے گا، قومی کام کرنے والے بھوک سے تو نہیں مرے لیکن ہیضہ میں اکثر مرے پائے گئے ہیں۔ میں بدحظ ہو کر چلنے لگا تو لپک کر سامنے آگئے۔ کہنے لگے، اللہ میرا کہا مان لیجئے، میں نے کہا وہ کیا، فرمایا، چلئے دہلی چلیں، میں اکتا گیا اور بولا ذاکر صاحب، ہوش میں آیئے۔ امتحان کے کے دن رہ گئے ہیں، اس بات کو اس طور سے ٹال گئے جیسے اس کی ذرہ برابر بھی اہمیت نہ تھی۔ کہنے لگے پڑھ کے کیا کیجئے گا کھانے کمانے بھر کا پڑھ لیا ہے احمقوں کو مرعوب کرنے کے لئے بی اے کافی ہے بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے لئے ہنسنے بولنے کی عادت ڈالنی ہے، اس کے لئے دہلی کا سفر ضروری ہے۔ میں نے کہا اور سفر خرچ کہاں سے آئے گا ؟ بولے اس کی پروا نہ کیجئے۔ خالو صاحب کو لکھ دیا تھا کہ کالج میں دق کی شکایت پھیل گئی ہے۔ کچھ گھی اور روپئے بھیج دیجئے۔ گھی تو پہلے آگیا، روپیہ آج آیا ہے بس دلی چلے چلئے۔ شاہجہاں پوری والے کے ہاں ڈٹ کے کھانا کھایا جائے گا، ہندوستانی دواخانہ سے دوائیں خریدی جائیں گی، رات کو واپس آجائیں گے میں نہ مانا، ذاکر صاحب بھی دلی نہ گئے، صرف کالج میں جہاں تہاں کھاتے یا گپ کرتے پائے گئے۔ امتحان سے تین چار دن پہلے صاحب باغ کی افق پر پھر سے نمودار ہوئے۔ ہم نے ان کی پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ سب کچھ کھو آئے تھے اور ہماری ہمدردی کے مستحق تھے اور وہ اس طور سے ملے جیسے انھوں نے ہمارے گناہوں کو معاف کر دیا ہو۔

امتحان ہوا، نتیجہ نکلا، ہم سب فیل، صرف ذاکر صاحب پاس !

ایک موقعہ پر مجھے ذاکر صاحب کے اعزاز میں تقریر کرنی پڑی۔ میں نے تھوڑی دیر تک یہ سوچا کہ اس پچیس تیس سال میں ذاکر صاحب کی کونسی بات مجھے سب سے زیادہ ممتاز نظر آئی۔ فی الفور میرے ذہن میں یہ آیا کہ ذاکر صاحب نے طالب علمی کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی کام ایسا نہیں کیا جو دوسرے درجہ کا ہو، تیسرے درجہ کا تو سوال ہی نہیں!

ذاکر صاحب علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ نان کوآپریشن میں وہاں سے علیحدہ ہوئے اور جرمنی چلے گئے۔ وہاں سے آکر جامعہ کا کام سنبھالا جامعہ کو ذاکر صاحب نے کس حال میں پایا، کیسے نازک مواقع پر اس کو سنبھالا۔ اور کس کس طرح اس کو سنوارا۔ اس زمانے میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر کیا گزری، اس کی داستان بڑی طویل ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ کئی سال ہوئے دولت آصفیہ سے جامعہ کو گرانقدر مالی امداد ملی۔ ذاکر صاحب سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے مبارک باد دی تو بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے، رشید صاحب، آج گیارہ سال کے بعد جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دی جا سکی! میں متحیر رہ گیا۔ میں نے کہا ذاکر صاحب، یہ واقعہ جامعہ کی تاریخ میں نہیں ہماری تمام قومی تحریکوں میں یاد رکھا جائے گا۔ جہاں ایسے کام کرنے والے ہوں وہاں میرا گذر تو ہو نہیں سکتا۔ لیکن کسی دن ریڈیو پر تقریر کرنے دہلی آیا تو دو رکعت نفل پڑھنے جامعہ نگر ضرور آؤں گا!

نان کوآپریشن کی زد میں علی گڑھ ہی کا ایک حصہ ٹوٹ کر جامعہ بنا، "چشم زلیخا" کو "نور دیدۂ یعقوب" ہی روشن کئے ہوتے ہے۔ اس زمانے کے بیشتر بہترین طالبعلم بھی علی گڑھ سے نکل کر جامعہ میں شامل ہو گئے۔ لیکن جامعہ کو موجودہ شکل، حیثیت اور شہرت دینے کا سہرا تمامتر ذاکر صاحب اور ان کے بے لوث رفقا کے سر ہی علی گڑھ کے بعض لوگوں کی نظر میں جامعہ کا قیام ایک حریف ادارے کی حیثیت سے کچھ دنوں کھٹکا۔ یہ بدگمانی

رفتہ رفتہ دور ہوگئی، لیکن جیسا کہ ہمارے ذہن و اخلاق کا مذموم خاصہ ہے، ہم ہر تحریک کو اکثر اپنے ذاتی محدود و مشتبہ اغراض و مقاصد کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، ذاکر صاحب اور ان کے رفقار کی طرف سے علی گڈھ کا ایک مخصوص طبقہ بدگمان رہا اور اب بھی ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس بدگمانی کے باوجود جو عناد کی حد تک پہنچی ذاکر صاحب علی گڑھ کے ہر انتظام میں شروع سے آخر تک شریک رہے، محض ضابطہ کی رو سے نہیں بلکہ انھوں نے انتہائی خلوص، تندہی، قابلیت اور ہمدردی کے ساتھ یونیورسٹی کے نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں حصہ لیا۔ اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انھوں نے نادانستہ طور پر بھی کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا جو علی گڑھ کے حقیقی مقاصد کے ذرہ برابر بھی منافی ہوتا، ان کا بدترین دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذاکر صاحب نے علی گڑھ کی انتظامی دروبست سے گہرا اور اہم تعلق رکھتے ہوئے بھی کسی معاملہ میں، اپنے خیال، الفاظ یا عمل سے کوئی بات ایسی کی ہو جس سے علی گڑھ کے نام پر حرف آتا ہو، یہی نہیں بلکہ جماعت منتظمہ میں جب وہ شریک رہے، دوست اور دشمن دونوں کو اطمینان رہا کہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو انصاف یا ہمدردی سے بعید ہو! لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ جس معاملہ میں ذاکر صاحب کو قومی پیمانہ پر سب سے زیادہ رسوا کیا گیا، اسی معاملہ میں رسوا کرنے والے ذاتی اور خفیہ طور پر ذاکر صاحب کی رہنمائی اور ہمدردی کے ملتجی دیکھے اور پائے گئے۔

جرمنی سے واپس آنے کے بعد سے آج سے چند سال پیشتر تک ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹو کونسل، اکیڈمک کونسل، اور شعبہ اقتصادیات کے ممبر رہے ان تمام اداروں میں جب بھی کوئی کمیٹی کسی مسئلہ سے متعلق بنائی گئی، ذاکر صاحب کا نام ممبری کے لئے سب سے پہلے پیش کیا جاتا اور بے چون و چرا بڑی خوش دلی اور اعتماد کے ساتھ

قبول کرلیا جاتا۔ سالہا سال وہ مسلم یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں شریک کار رہے۔ بیرونی اشخاص کے ممبر ہونے کی جہاں کہیں ضرورت ہوئی۔ ذاکر صاحب ضرور شریک کئے گئے اور ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جس نے ذاکر صاحب کی معاملہ فہمی، خلوص اور قطعاً بے لوث ہونے کا اعتراف نہ کیا ہو!

تمام واقعات دہرانے کا یہ موقعہ نہیں ہے صرف دو ایک کا تذکرہ کر دینا کافی ہے مسلم یونیورسٹی میں ایک تحریک یہ پیش ہوئی کہ جماعت اساتذہ میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کے عقائد مذہبی قابل گرفت ہیں، اس تحریک میں جو پیچیدگی اور نزاکت تھی اس کا اثر اشاف کے طبائع پر بالعموم جو کچھ پڑسکتا تھا اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ایکزیکٹو کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ سر سلیمان مرحوم وائس چانسلر تھے کونسل میں جو تقریریں ہوئیں ان میں جوش قابلیت قانون دانی بیزاری مایوسی غرض کہ ہر طرح کے جذبات کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ مسئلہ کی نوعیت یہ تھی کہ ہر مسلمان ممبر اشاف سے ایک تحریر لی جائے کہ وہ مذہبی عقائد اور اسلامی روایات کا احترام کرے لیکن سوال یہ تھا کہ اس تحریر کا مضمون کیا ہو! جب بحث نے طوالت اختیار کی تو سر سلیمان مرحوم نے ذاکر صاحب سے فرمایا کہ "ڈاکٹر صاحب آپ نے تو ساری بحث سن لی، اب کوئی فارمولا ایسا وضع کیجئے جس پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اتفاق ہو جائے۔ ذاکر صاحب نے فی الفور ایک مختصر سا مسودہ تیار کر کے مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے حاضرین کو سنا دیا۔ بغیر کسی مزید گفتگو کے ہر شخص نے اسے قبول کر لیا۔ اس میں وہ لوگ بھی تھے جو اس تحریک کی موافقت میں سر بکف تھے اور وہ بھی تھے جو اس کی مخالفت میں شمشیر برہنہ، یہ مسئلہ اس تحریر سے ایسا ہموار ہوا کہ پھر کبھی اس کی کوئی شق معرض بحث میں نہ آئی۔

اشاف اور جماعت منتظمہ میں سر سلیمان مرحوم ہی کے زمانہ میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ یونیورسٹی کی تعطیل متعین کرنے کا اختیار اکیڈیمک کونسل کو تھا کہ ایکزیکٹو کو۔ اس بحث نے

بھی ناخوشگوار فضا پیدا کی اور فریقین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو دونوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے پر آمادہ ہوتا یا اس کی آمادگی نتیجہ خیز ثابت ہوتی سر سلیمان مرحوم نے ذاکر صاحب سے فرمائش کی کہ وہ اسٹاف سے گفتگو کر کے مفاہمت کی کوئی صورت نکالیں، چنانچہ ذاکر صاحب نے اراکین اسٹاف سے گفتگو کر کے اس گتھی کو سلجھایا، ایک صاحب جو ذاکر صاحب اور جامعہ دونوں کو ہمیشہ شبہہ اور حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور قومی تحریکوں اور قومی سرداروں کو اسی نظر سے دیکھا کرتے تھے جس نظر سے یہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں دیکھے جاتے تھے۔ ذاکر صاحب کی گفتگو نے مصالحت سن کر ذاکر صاحب کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ ذاکر صاحب کا دماغ اتنا سلجھا ہوا ہے، اور ذہن اس درجہ رسا۔

علمی وفنی مسائل پر تحقیقات کرنا اور ان سے طلباء کو آشنا کرانا یونیورسٹی کے معلمین کا فرض منصبی ہے۔ ذاکر صاحب کے آنے پر یہ چرچے دن رات کے ہو جاتے ہیں۔ اور ذاکر صاحب سے ہر موضوع پر خواہ وہ عقل اول ہو خواہ ازدواج مکرر بڑے لطف سے اور بڑے اونچے درجہ کی گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اساتذہ، طلباء اجنبی اور احباب کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ذاکر صاحب کا مسائل کے منقح کرنے کا طریقہ دل نشین لیکن نہایت مشکل ہے۔ وہ ہر مسئلہ پر روزمرہ کے پیش آنے والے حالات و واقعات کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔ عام طور پر بحث کرنے میں لوگ صرف اپنے نقطۂ نظر کو پیش پیش رکھتے ہیں اور بحث میں الجھاؤ اور بدمزگی بھی اکثر اسی طریقہ کار سے پیدا ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب گفتگو کرنے میں اپنے مخاطب اور معترض ہی کے نقطۂ نظر کو اپنا لیتے ہیں، اور مسئلہ کو منقح کر دیتے ہیں اسی طور سے معترض کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی قابلیت یا اس کے اصول وعقیدے کو ٹھیس پہنچائی گئی کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خود مخاطب کے نقطۂ نظر کی تنقیح و توضیح اس طور سے کر دی کہ وہ اپنی بڑائی محسوس کرنے لگا اور غیر شعوری طور پر ہمیشہ کے لئے ذاکر صاحب کی ہمدردی، قابلیت اور شخصیت کا

شیدائی ہو گیا۔

ذاکر صاحب کی بلند نظری، درد مندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انھوں نے نہ صرف بغیر پس و پیش کے بلکہ بڑے لطف اور خلوص سے ان کی مدد کی۔ واردھا تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلہ میں ان کو جس سفاہت اور سفاکی سے رسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں اور کوئی قابل فخر کارنامہ بھی نہیں اس رپورٹ کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی طرح ڈالی جس کا کام اب تک ختم نہیں ہوا لیکن مجھے معلوم ہے کہ جس زمانہ میں اس کمیٹی پر ایک نازک دور گذر رہا تھا، نواب کمال یار جنگ مرحوم جب کبھی دلی آئے تو ذاکر صاحب سے ملتے اور کمیٹی کے کام کو حسن خاتمہ پر پہنچانے کی سبیل ذاکر صاحب سے دریافت کرتے اور اعانت کے طلبگار رہتے۔ واردھا رپورٹ جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف منازل سے گزر کر صوبہ متحدہ کی حکومت میں پہنچی تو کانفرنس کی حمایت میں اور کانفرنس کے ہی نقطۂ نظر کو ذاکر صاحب نے وہاں کے ماہرین فن کے سامنے واضح کیا اور منوایا! میں نے کہا۔ مرشد یہ کیا بات ہوئی تو فرمایا ہوئی کیا اغیار میں اپنوں کی رسوائی دیکھی نہیں جاتی!

واردھا رپورٹ سب سے پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پٹنہ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ ذاکر صاحب آنکھوں کی سخت اذیت میں مبتلا ہو کر بمبئی گئے ہوئے تھے جہاں ان کی آنکھوں پر آپریشن کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود انھوں نے اسی حالت میں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور طبیعت نڈھال تھی ایک صاحب کو خفیہ طور پر بلا کر ایک خط نواب صدر یار جنگ بہادر سکریٹری کانفرنس کو لکھوایا جس میں انھوں نے کمیٹی کی بنیادی سفارشات کی اہمیت بڑی قابلیت اور بڑے ہی درد سے جتائی تھی۔ یہ خط ذاکر صاحب کے خلوص، قابلیت، دل سوزی اور خود انشاء پردازی کا بڑا نادر نمونہ ہے۔ یہ خط عام نظروں کے سامنے آیا یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے اسے دیکھا ہے۔ غور سے

اور دیر تک پڑھا ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

تری دعا ہی کہ ہو تیری آرزو پوری مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

موقعہ کی اصلیت اور خود لکھنے والے کی حالت کا اندازہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی کچھ ایسے ہی عالم میں پہونچ کر یہ شعر کہا ہوگا۔ شاعری اور انشاء پردازی میں بھی ایک مرحلہ آتا ہے جب ؎

ریحاں دمد از مینار آتش چکد از قلقل!

یہ بات صنعت گری کے بس کی نہیں، یہ تو اسی وقت آتی ہے جب نظر میں وسعت، فکر میں گہرائی دل میں سچائی، اور اخلاق میں پائی ہو۔

ذاکر صاحب کی تقریر و تحریر دونوں میں ایک خاص چیز ملتی ہی جو کہیں اور کم دیکھی گئی۔ ماہرینِ طبعیات کا مدتوں خیال رہا کہ روشنی کی رفتار بخطِ مستقیم ہوتی ہی۔ بعد کی تحقیقات یہ ہی کہ اس کی رفتار بخطِ مستقیم نہیں بلکہ جست و خیز کے ساتھ ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی تحریر تقریر دونوں میں یہ بات ملتی ہی۔ وہ مروجہ طریقوں سے کام نہیں لیتے بلکہ شروع سے آخر تک سامع یا قاری کی توجہ کو اپنے الفاظ اور خیالات کی تازگی اور توانائی سے تب و تاب دیتے رہتے ہیں اور اس کے تصورات کو نہ تھکنے دیتے ہیں نہ دم لینے دیتے ہیں۔ الفاظ و عبارت میں صفائی خیالات میں رفعت اور جذبات میں سچائی ہوتی ہے، کم لوگوں کی تحریر و تقریر حشو و زوائد یا بندھے ٹکے الفاظ و عبارت سے اتنی پاک ہوتی ہے جتنی کہ ذاکر صاحب کی۔ ان کی تقریر میں نہ خطابت ہوتی ہے نہ موعظت لیکن خطابت کا زور اور گرمی اور موعظت کی مرحمت اور شائستگی بدرجہ اتم ملتی ہے۔ ذاکر صاحب تقریر کرتے ہیں تو مجھے پہاڑ کی فضا یاد آجاتی ہی پہاڑ ہی کا اوج، وزن، وقار۔ ان کی تقریر اس چشمہ کی مانند ہوتی ہے جو اپنے سیلِ سفر کی ہر منزل میں شفاف شادماں شگرف کار رہتا ہے۔ لیکن جہاں کہیں ذاکر صاحب نے

ملک پر چھائی ہوئی تاریک کہر اور ساتھیوں کے تذبذب اور تھکن کی طرف اشارہ کیا ہو وہاں ان کا لہجہ دھیما اور حزیں ہو گیا ہے الفاظ میں مرہم ہے لیکن پیغام میں وہی گرمی اور جگر تابی ہے جو ذاکر صاحب کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوتے ہے۔

ابتدائی بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس کئی سال ہوئے جامعہ نگر میں معلموں کے مدرسے کے پاس ایک مرنجہ مرنج شامیانے کے نیچے منعقد تھی۔ ایک دوست کے ہمراہ میں بھی دہلی پہنچا شام کے قریب سورج کی تھکی نرم کرنیں گرد و پیش کے ناہموار پتھریلے ٹیلوں اور کٹیلی جھاڑیوں پر رفتہ رفتہ روشنی اور سایہ کا جال سا بن رہی تھیں۔ مختلف دیار سے آنے والے ماہرین تعلیم کا خاصہ بڑا مجمع تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بستیوں سے دور بھلائے ہوئے کسی ریگستان میں مختلف قبائل کے نمایندے کسی بڑے عزم کو پورا کرنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا اہتمام میں مصروف تھا۔ صدر و بائیں کا کوئی امتیاز نہیں تھا اتنے میں قبیلہ کا شیخ جو ابھی ایک مہمان کو پانی پلا رہا تھا اور ایک چھوٹے بچہ کو اس کی کارگزاری اور مستعدی پر شاباش کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر اس طور سے کھڑا تھا جیسے کوئی مجاہد اپنی تلوار پر ہاتھ رکھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا ہو، مجمع کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

.... میں یہ التجا اپنے ملک کے سب سیاسی رہنماں کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو سدھارئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالئے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزور کو زور آور کا ڈر نہ ہو۔ غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدن تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہو اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنی سماج کا چاکر

جان سے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہدینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی، کہ کچھ مان کر کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابل رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں؟ کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں؟ کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت کو کوئی ایک سیاسی حماقت کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔"

ذاکر صاحب کی تقریر کا لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے۔ جب حاضرین میں سے کوئی بڑا اور بزعم خود غلط آدمی بے سمجھے بوجھے محض اپنی اہمیت جتانے کے لئے اعتراض کردے طالب علمی کے زمانے میں یونین میں ذاکر صاحب کی جوابی تقریر سننے کے لئے ہم سب خاص طور پر جمع ہوا کرتے تھے ایک سال وائس پریذیڈنٹ کے عہدے کے لئے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے۔ سارے طلباء خواص و عوام کے نام سے دو گروہ میں منقسم ہو گئے تھے ذاکر صاحب عوام کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے ہر فریق کے امیدوار کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت و اہمیت کو جتانے کے لئے یونین میں تقریر کرے چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کے لئے عنوان دینا پڑا، مخالف جماعت نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب کے لئے فلاں پروفیسر نے تقریر لکھ دی اور وہ اس کے رٹنے میں مصروف ہیں، مباحثہ کا وقت آیا یونین میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام لیا گیا، اور ہال تالیوں اور سیٹیوں سے اس طور سے گونج اٹھا جیسے" ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار"

ذاکر صاحب اپنی طرف کے اسٹینڈ پر آئے اور بولے میں نہایت ادب کے ساتھ

لیکن ضابطے سے اپنے موضوع بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں مجھے اس بارے
میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں اپنی جوابی تقریر میں عرض کروں گا۔ فی الحال اتنا ہی عرض کرنا ہے
یہ کہہ کر اپنی جگہ پر لوٹ آئے لیکن فوراً ہی ایک اودھم مچ گیا، فریق مخالف نے خوب پھبتیاں
کسیں اور شور مچایا، یہ معلوم ہوا جیسے الیکشن کے نتیجے کا اعلان کر دیا گیا ہے ذاکر صاحب کے
حامیوں کا یہ حال کہ کوئی غصہ میں کوئی مایوس ہو کر کوئی اپنے آپ پر نفریں کرتا ہوا، اور
کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا مجمع سے جانے لگا کچھ اس طور پر جم کر
بیٹھ گئے کہ یا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اٹھیں گے۔ مخالفین کی بن آئی تھی۔ اس دن صرف
مخالفین نے تقریریں کیں اور جس کے دل میں جو آیا اس نے ذاکر صاحب اور ان کے
حامیوں کو سنا ڈالا۔

جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب پھر اسٹینڈ پر آئے ان کے موافقین بھی جو یونین
کے باہر آس پاس چہ میگوئیوں میں مصروف اور کچھ بکھرے ہوئے دروازہ سے لگے کھڑے
تھے رفتہ رفتہ واپس آئے ذاکر صاحب پر عالم کچھ ایسا طاری تھا کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی
ذاکر صاحب نے کہا کہ موضوع بحث پر اب بھی میں کوئی تقریر نہ کروں گا، صرف مخالف
تقریروں کا جواب دوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے ہر مخالف کے دلائل کے جواب دینے
شروع کئے اور جہاں تہاں ان کے آداب محفل انداز و لہجہ پر فقرے بھی چست کرتے گئے۔
مجمع سے صدائے تحسین بلند ہونی شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر
اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے، جس کے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔ تقریر ختم ہوئی
رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا، صدر نے نتیجہ کا اعلان کیا۔ اب ذاکر صاحب
کے موافقین کی بن آئی تھی انھوں نے مخالفین کا پیچھا گھر تک نہ چھوڑا۔ پانی پت کی آخری
لڑائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ
جنوبی ہند میں کوئی ایسا مرہٹہ خاندان نہ تھا جس کے ہاں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ یہی حال

ذاکر صاحب کی تقریر اور ان کے نپے تلے برجستہ فقروں نے مخالفین کا کیا۔

مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک جلسہ میں سر سلیمان مرحوم صدر تھے، اراکین میں سے ایک صاحب اپنے آپ کو بڑا طباع اور یگانۂ روزگار سمجھتے تھے اور ہر لمحہ اپنی نشست سے بیٹھے بیٹھے لوگوں پر فقرے چست کیا کرتے تھے اور کوشش یہ کرتے تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی کی پیش نہ جائے ذاکر صاحب نے ایک مسئلہ پر تقریر کی جس کو ہر شخص نے غور و احترام کے ساتھ سنا، بڑے بڑے مخالف مجمعوں میں بھی ذاکر صاحب کی تقریر ہمیشہ خاموشی اور احترام سے سنی گئی، یہ امتیاز میں نے کم لوگوں میں پایا۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی وہ صاحب تلملا اٹھے اور فوراً اپنی نشست پر سے ایک پوائنٹ آف آرڈر رس کیا۔ جس میں تفاخر اور خود نمائی کی شان پورے طور پر جلوہ گر تھی بولے جناب والا نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے ابھی جو تقریر کی ہے وہ بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کچھ اور ارشاد فرمانے والے ہی تھے کہ ذاکر صاحب نے اٹھ کر فرمایا جناب والا میں نے اپنی تقریر میں کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میری تقریر محترم ممبر کی سمجھ میں آئے گی۔ اس پر ایسا بے محابہ قہقہہ پڑا کہ سر سلیمان مرحوم جیسے ثقہ آدمی جو ایسے مواقع پر اپنی طرف سے کبھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے بے اختیار ہنس پڑے اور معترض صاحب کچھ ایسے سٹ پٹائے کہ دوران مجلس میں صرف سکوت پر قانع رہے۔

کورٹ ہی کا ایک اور جلسہ بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ اس میں جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ اس درجہ اہم اور متنازعہ فیہ تھا کہ کورٹ کے با اقتدار اراکین ہر گوشۂ ملک سے بڑی کثرت سے شریک ہوتے تھے اور جو کچھ فیصلہ ہونے والا تھا اس میں کہیں شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی، فضا ایسی دگرگوں تھی کہ بڑے سے بڑے شخص کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ مخالفت میں تقریر کرنا تو درکنار مخالفت میں چپکے سے ہاتھ اٹھانے کی بھی ہمت کر سکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہر طرف سر نگیں بچھی ہوئی ہیں جس نے قدم اٹھایا وہ جان سے گیا۔

معمولی ابتدائی کارروائی شروع ہوکر ختم ہوئی، تحریک پیش کرنے والوں میں ایسے اصحاب تھے جو قانونی قابلیت قومی خدمات، ذاتی جاہ وحشم ہر اعتبار سے قوم اور ملک میں خاصا درجہ رکھتے تھے۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہوا اور وہ لمحہ آیا جب اس کی مخالفت میں کوئی کھڑا ہو۔ جلد میں ایسا سناٹا رہا کہ ہر شخص اپنے قلب کی حرکت کو سن سکتا تھا۔ معرکہ میں پہلا قدم اٹھانے والا۔ اور پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے والا ہی مرد کہلاتا ہے، ذاکر صاحب سب سے پیچھے کی نشست پر بیٹھے ہوتے تھے اٹھے اور محض ایک جملہ کہہ کر بیٹھ گئے" یہ تحریک قانوناً پیش نہیں کی جاسکتی"۔ سارا مجمع مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ قانون میں جن صاحب کا پایہ ہائی کورٹ تک مسلم تھا اور جو اس تحریک کے قانونی پشتہ بان تھے کڑک کر بولے قانونی سقم کوئی نہیں ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں ا جلسہ میں جو لوگ بحث کرنے یا سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ ہاتھ اٹھانے یا ادھم مچانے کے لئے آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں ان کی بن آئی، ذاکر صاحب نے ایک لفظ نہ کہا بڑی مشکلوں کے بعد جب مجمع کو کسی قدر خاموش کیا گیا اور فاضل معترض نے اپنا چیلنج دہرایا تو ذاکر صاحب نے ان کو ایک اور موقع کی یاد دلائی جب انھوں نے ایسے ہی ایک مسئلہ میں ذاکر صاحب کو چیلنج دیا تھا اور بعد میں اپنی غلطی تسلیم کی۔ اور فرمایا ایسے موقعہ پر چیلنج نہیں دیتے سوچتے ہیں، ذاکر صاحب نے اب ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنے اعتراض کی بڑی سنجیدگی لیکن وثوق اور دبدبہ کے ساتھ وضاحت کی جلسہ کے مدبروں نے غور کیا تو ذاکر صاحب کا اعتراض صحیح نکلا۔ معترض نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ ہال کے اندر بڑی دیر تک دوڑ دھوپ اور خفیہ سرگوشیاں ہوتی رہیں، بالآخر ذاکر صاحب ہی کے مشورے سے مطالبہ کی نوعیت بدل گئی۔ اور کارروائی شروع ہوئی۔

ذاکر صاحب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ ان کی اردو کی تقریر و تحریر بہتر ہوتی ہے یا انگریزی کی۔ طالب علمی کے زمانے میں کالج میگزین میں ان کے

RIP کے نام سے وہ کالج کی زندگی پر بڑے دل کش مضامین لکھا کرتے تھے جس کا لوگ بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے۔ انگریزی کے بارے میں ایک بار مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مسٹر ریمز ہاشم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر بالخصوص ان کی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بہترین اراکین سے کیا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ میں رہ کر اور اس سے باہر بھی میں نے انگریزی ہی کی اچھی تقریریں سنی ہیں لیکن ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، رواں، جچی تلی، دل نشین، فکر انگیز۔ انگریزی تقریریں تو ذاکر صاحب ہی سے سنی۔ ان کی تقریر کا ایک جملہ بھی زائد از ضرورت نہیں ہوتا۔ اور شروع سے آخر تک استوار، شریفانہ۔ اور ہر فقرہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے آپ ان کے کسی فقرے کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہیں بتا سکیں گے کہ اس فقرہ کی یہ پرداخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا۔ ہمیشہ وہ اس کو اس طرح ختم کریں گے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔ عام تقریر کرنے والوں کے مانند وہ جسم کے کسی حصہ کو خاص طور پر جنبش یا جھٹکے نہ دیں گے لیکن بحیثیت مجموعی آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں ان کے سارے جسم و جان کی کارفرمائی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویسی ہی فضا پیدا کرلیتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس سے ویسی ہی تقریر برآمد ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کو خاموش دیکھ کر اکثر ذہن غالب کے اس مصرعہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے!

اب تک آپ نے ذاکر صاحب کی شخصیت کو گفتار کے غازی کی حیثیت سے دیکھا اب ذرا اس کردار کے غازی کو جامعہ میں دیکھئے۔ جامعہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی ابتدا میں اس کو جو دشواریاں پیش آئیں وہ نئی نہ تھیں۔ جامعہ کا قیام بڑی ہلچل میں عمل میں آیا تھا۔ سیاست کے لیڈر بالعموم تعلیم کے لیڈر نہیں ہوتے لیکن طالب علم اور

تعلیمی اداروں کو اپنا سب سے موثر اور آسان حربہ سمجھتے ہیں اور بنا لیتے ہیں۔ تعلیم کو سیاست کی باندی بنا لینا ہی عبث اور خطرناک ہے۔ جیسے سمندر کی لہریں سمندر کی وسعت اور گہرائی کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کریں۔ سیاسی لیڈر ہمیشہ طالب علموں سے اپنا کام لیتے ہیں ان کی زندگی کو سدھارنے کی پرواہ نہیں کرتے۔ انھیں وجوہ سے جامعہ کا ابتدائی دور علی گڑھ میں کامیاب نہ رہا۔ اور حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب اسے دہلی لے گئے۔ تھوڑے دن بعد جب ذاکر صاحب اور ان کے رفقاء اپنی اپنی تعلیم ختم کر کے یورپ سے ہندوستان واپس آئے تو جامعہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جامعہ اور اس کے کارکنوں نے سیاسی سرگرمیوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان پچیس سال میں جامعہ کو کن آزمائشوں سے گزرنا پڑا کون مصیبتیں دور ہوئیں اور کن نئی آفتوں کا سامنا ہوا یہ داستان تو جامعہ کا کوئی مستند مورخ لکھے گا۔ میں تو صرف یہ دیکھ سکا ہوں کہ جامعہ کس طرح ذاکر صاحب کی شخصیت کے سہارے اور اس سے سیراب ہو کر اپنے مخصوص بلند نصب العین سے قریب تر ہوتی رہی اور باوجود صدہا دشواریوں کے اس نے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں ایک نئی ذہنی بیداری پیدا کی، اور اسے پروان چڑھایا۔

اونچے درجہ کی تعلیم گاہوں میں معلم اعلیٰ کی حیثیت جس کے سپرد ادارہ کا نظم و نسق بھی ہو۔ دوسرے اداروں کے افسروں کی حیثیت سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتی ہے۔ تعلیم گاہوں میں ایسے عہدے کی حیثیت منصبی نہیں ہوتی۔ علمی ذہنی و اخلاقی ہوتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں اونچے درجہ کا علمی و تعلیمی کام ہوتا ہے۔ یہاں کا ہر معلم اپنے فن کا امام ہوتا ہے خواہ اس کا عہدہ یا اس کی تنخواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ افسر اعلیٰ کا علمی ذہنی اور اخلاقی درجہ اپنے ماتحتوں یا ساتھ کام کرنے والوں کے علمی و اخلاقی درجہ سے واضح طور پر بلند نہ ہو تو کم درجہ کا کسی طرح نہ ہو۔ ایسی تعلیم گاہوں

میں منصب، دولت، امارت، رسوخ کی کوئی اہمیت نہیں۔ برخلاف سرکاری اداروں کے
جہاں منصب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ کلکٹر ہزار نااہل ہو اور تحصیلدار کیسا ہی قابل کیوں نہ
ہو ہر حال میں اول الذکر ہی کا بول بالا رہے گا۔ یونیورسٹیوں میں علمی اور ذہنی صلاحیتوں
کا مقابلہ صرف علمی و ذہنی صلاحیتوں سے ہوتا ہے۔ زور بازو سے کام نہیں چلتا۔ یہاں زور
بازو یا "دخل فضل" سے کام لینا نری حماقت ہے جس کو بڑے سے بڑا معاف کرنے والا
بھی معاف کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

ذاکر صاحب جامعہ کو پچیس سال سے چلا رہے ہیں اس دوران میں جامعہ اور
جامعہ میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ دونوں پر مسلسل اور بے
پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے لیکن نہ یہاں کوئی اسٹرائیک ہوئی، نہ کوئی بدل ہوا، نہ
جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر
رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانا نہ
ہو بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان
کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں ان کی پذیرائی احترام کے ساتھ ہوسکتی تھی، یہ صرف
ذاکر صاحب کی بلند اور برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھرنے
سے بچا لیا بلکہ اس کو مضبوط و مستحکم کر دیا۔

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور
ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں سارا قصہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا۔ ذہنی
قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا وہ ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے
سر جھکا دیتا۔ اپنے ایثار، قربانی، اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ
ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و
نجابت یا سوشل یا سرکاری تعلقات و رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سر ار

خاندانی اعتبار سے بھی زر خالص ہو اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وسیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں۔ محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقہ میں ان جیسا کوئی اور نہ تھا۔ کسی کو اپنے ذوق ذہانت و فطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں، چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں اور بوڑھا یہ جانتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا تھا تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے!

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فائدہ کے لئے جان کھپاتے ہیں اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی عزت و فراغت کو اپنی عزت و فراغت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔

ذاکر صاحب وہ سب کر سکتے تھے اور پا سکتے تھے جو آجکل کے ہمارے بڑے آدمی کو نصیب ہے۔ ان کو بڑی سے بڑی نوکری مل سکتی تھی وہ عوام کو بہکا کر یا بھڑکا کر شریفوں پر دنیا تنگ کر سکتے تھے وہ رشوت لے یا دے کر دولت و اقتدار حاصل کر سکتے تھے خدا و رسول کے نام پر خانقاہیں یا یتیم خانے قائم کر کے غریبوں کی کمائی اور ناموس لوٹ سکتے تھے۔ وہ ہر طرح کے فسق و فجور میں مبتلا رہ کر بھی اپنی قوم کے آخری نجات دھندہ قرار دیئے جا سکتے تھے۔ ذاکر صاحب کی ذہنی استعداد جس پایہ کی ہو اس سے ان کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اس استعداد کو اپنے نفس کی خاطر بے لگام کر کے وہ تمام باتیں حاصل کر سکتے تھے جن کو ہم رشک و حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن وفات پا جاتے ہیں! نفس کے اس بے پناہ عفریت کو جس کے ادنیٰ اشارہ پر ہم اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی قیمتی سے قیمتی متاع تلف کر دینے

پر آمادہ رہتے ہیں اور اسے نصیبہ کی یاوری یا قوم کی بیداری سمجھتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے کس طرح زیر کیا اور کیوں کیا اسے کون سمجھے گا اور کیوں سمجھے گا جب اسکے سمجھنے سے بخش در معمون متیں بے نقاب ہوتی ہوں!

ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہو کر لیکن سب کے لئے جامعہ کی بنیاد ڈالی محنت سہی، بے بسی دیکھی گالیاں سنیں، رسوائی اٹھائی، انتظار جھیلا لیکن منہ نہ موڑا، مسکرانے سے باز نہ آئے دشمن سے نہ ڈرے نہ اسے دھتکارا، اس نے مانگا تو دے دیا اس نے چرا لیا تو جانے دیا خود بہتے رہے جامعہ کو سپر نہ بنایا اس کو صرف سنوارا، وہ انتظار کرنے سے گھبرائے نہیں اس لئے کہ اچھے اور بڑے کام کرنے میں "انتظار" کی منزل سب سے مفقود ہوتی ہے۔ انجام کا ڈر نہیں ہوتا، کام و انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں انجام یا انعام کا جو یادہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ اطمینان، سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپ کو دے سکیں نہ وہ جو دوسرے سے ملے!

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ جامعہ کا پروگرام لمبا ہے اس کے نتائج دیر میں برآمد ہوں گے ملک کے حالات اسکے مقتضی ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں میں جلد سے جلد حصہ لیا جائے۔ اس سے جہاں اور فوائد ہیں وہاں جامعہ کے کاموں کو بھی تقویت پہنچے گی۔ ملک و قوم کی حالت روز بروز دگرگوں ہو رہی ہو تو لمبے پروگرام کو اپنی توجہ کا تنہا مرکز بنانا مناسب نہیں۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیاسی سرگرمیاں بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان میں صحت اور استواری اسی وقت آتی ہے جب ان کی آبیاری کے لئے ہمارے ذہنوں میں صاف اور شفاف پانی کے گہرے اور نہ سوکھنے والے سوتے ہوں یہ سوتے تعلیم ہی میں منکشف بھی ہوتے ہیں اور پیدا بھی۔ بازاروں اور اخباروں میں قومیں بنتی نہیں بدنام ہوتی ہیں تعلیم کو سیاست پر قربان کرنا تنگ نظری اور خود غرضی ہے۔ سیاست کو تعلیم کی باندی ہونا چاہیئے۔ تعلیم میں نتائج کی دیر سویر بے معنی سی بات ہے۔

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم وہ مردِ دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ، مزاج جس کا قلندرانہ

وہ جس کا دستور حق پسندی وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثارِ بیکراں کا ہے معترف آج تک زمانہ

جلال بھی ہے جمال بھی ہے، یہ شخصیت کا کمال کہیے
خیال میں بجلیاں پرافشاں لبوں پہ اک دلربا ترانہ

وہ جس کی تحریر سے ہویدا جہان میں حکمتِ کلیمی
وہ جس کی تقریر سے جھلکتی ہے تب و تابِ غازیانہ

وہ جس کی چشمِ ستارہ بیں نے فلک بھی دیکھا جہاں بھی دیکھا
پسند لے دے کے جس کو آیا مگر کچھ اپنا ہی آشیانہ

چمن بھی آتش فشاں بھی دیکھے، نئے نئے آسماں بھی دیکھے
کہیں سنی داستانِ انجم، کہیں سنا جنگ کا ترانہ

غلام قوموں میں کیا بصیرت نظر میں گرمی نہ دل میں وسعت
کسی کو پہچانتی نہیں ہیں وہ مردِ حر ہو کہ مردِ دانا

سکوتِ ساحل سے کون دیکھے کنارِ ساحل پہ کون سمجھے
کسی کا موجوں سے جنگ کرنا کسی کا طوفاں کو آزمانا

یہ بزم ابھی آشنا نہیں ہے جگر ابھی خوں ہوا نہیں ہے
ابھی مغنی نے ہلکے ہلکے سروں میں چھیڑا ہے اک ترانا

افق پہ ہے روشنی سی لیکن وہ چشمِ بینا کہاں سے لائیں
ابھی جبینوں سے جن کی چھوٹا نہیں ہے بندگی کا آستانا

ورق ورق ہے مرا صحیفہ ملے تو کیونکر بنے تو کیونکر
ادھر تھی آرزو کی گرمی، ادھر خمارِ مئے شبانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

(آلِ احمد سرور)

مرد درویش

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دئے ہیں انداز خسروانہ

یادِ رفتگان

سید شرف الدین یاسؔ

ریاست ٹونک میں شہر پناہ سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں حموی خاندان کے ایک بزرگ سید محمد اسحاق صاحب رہتے تھے۔ پرانی وضع کے پابند اور قدیم رکھ رکھاؤ کے قائل تھے۔ تاریخ اور علم الانساب کے تو گویا حافظ ہی تھے۔ ان کے صاحبزادے حافظ سید نظام الدین صاحب بڑے درویش صفت بزرگ۔ ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف اور ذکر اذکار میں مشغول رہتے۔ ان کی اہل خانہ شمس النسا بی نیک نفسی اور خدمت خلق کے لئے تمام خاندان میں مشہور تھیں۔ ان کی والدہ عائشہ بی ہر وقت کلام پاک کا ورد کرتے کرتے ایسی حافظ ہوگئی تھیں کہ اچھے اچھے حافظ ان کے سامنے پڑھتے ہوئے گھبراتے تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جذب کی سی حالت میں رہتی تھیں۔

اسی گھر میں بڑی آرزوؤں کے بعد حافظ سید نظام الدین صاحب کے خاندان کے چشم و چراغ سید محمد شرف الدین ۱۲۸۷ھ میں پیدا ہوئے اور تاریخی نام اشرف خاندان پایا۔ یہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اس دریتیم کو دادا، نانی اور والدہ نے بڑے ناز و نعم سے پالا اور ایسی پرورش کی کہ خاندان کی تمام روایات کو ان کی زندگی میں سمو دیا۔ والد کی درویشی و عبادت گزاری۔ دادا کا حافظہ علم و مہمان نوازی والدہ کی خدمت خلق اور نانی کے جذب و اخلاص سب ہی سے حصہ لیا اور ایسا پورا پورا لیا کہ آج جب کہ مرحوم کو اس دنیا سے گئے سات آٹھ برس ہو گئے ہیں۔ اپنے بیگانے دوست آشنا سب ہی تو یاد کرتے اور کہتے ہیں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

جب عمر کی ابتدائی منزلیں طے کرلیں تو حسب دستور تعلیم شروع ہوئی۔ حکیم سید سعید احمد صاحب فارسی کے بڑے ادیب اردو کے مستند شاعر اور بڑے نباض طبیب تھے۔ انہی شفیق ماموں اور قابل استاد سے فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انہی کے فیضِ تربیت نے علم کی سچی طلب اور مطالعہ کا ذوق پیدا کیا اور اسی صحبت نے سخن سنجی و سخن فہمی کی صلاحیتوں کو ابھارا جو مرورِ عمر کے ساتھ استادانہ رنگ اختیار کرگئیں۔ عربی کی تعلیم میں مرحوم اس سے بھی زیادہ خوش قسمت رہے۔ مولوی امام الدین صاحب یکتائے روزگار تھے ان سے صرف و نحو پڑھی اور بعد میں حدیث و فقہ کی کچھ کتابیں بھی مولانا ہی سے پڑھیں۔

استادوں کی صحبت اور طبیعت کی افتاد نے مل کر شاعری اور ادبی ذوق کا خمیر اٹھایا اور سولہ سترہ برس کی عمر میں شاعری شروع کردی۔ ہندوستان میں اس وقت داغ کا طوطی بول رہا تھا۔ ٹونک پر بھی انہی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ہر نوخیز شاعر ان کے کلام کا مطالعہ کرتا اور اسی میزان میں اپنی کاوشِ فکر کو تولتا تھا۔ مرحوم نے اسی رنگ میں شاعری شروع کی پہلے سعید میاں مرحوم اور بعد میں استاد ظہیر دہلوی مرحوم سے تین تین غزلوں پر اصلاح لی "لیکن طبیعت کہیں مطمئن نہ ہوسکی پھر اصلاح کی کچھ پروا کی نہ ضرورت سمجھی" اس لئے انداز کلام برابر بدلتا رہا لیکن ابتدائی کلام بھی خراج تحسین سے محروم رہا۔ جیسا کہ صبیح الدین میاں مرحوم نے تاریخ شاہجہانپور میں لکھا ہے:۔

نہ گئی دل سے کسی حال میں کیفیتِ شوق (یاس) ہم نے غصہ کا ترے نام ادا رکھا ہے

مرزا داغ نے اس شعر کو بہت پسند کرکے آپ کو بہت داد دی تھی۔

لیکن داغ کا رنگ آخر تک نہ جما۔ کیوں؟ اول تو سعید میاں مرحوم غالب کی تعریف سن کر کہا کرتے تھے "اردو میں بعد مومن پایا انھیں بے نظیر" اس لئے مومن کے

رنگ کا خیال زیادہ ہوا پھر خود زمانے کا چلن بدلا۔ مذاق بدلا جس نے یاس مرحوم کو داغ
سے برگشتہ کر دیا۔ ایک جگہ انتخاب کلام داغ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں اس کے بعد کی غزل
سوقیت کا خمیر اور ہزل سے گزری ہوئی بڑھاپے کی بچر شاعری کا نمونہ ہے جس میں دوسرے
دور کے شعراء شاہ آبرو وغیرہ کی شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔"

اسی زمانے میں شادی کی تجویز ہوئی اور ۱۳۱۳ھ میں شاہ جہانپور جانا ہوا۔ بزرگوں
کے وطن پہنچنے اور بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملنے کی خوشی کو ان دل نشین الفاظ میں
بیان کرتے ہیں:۔

میں نے بچپن کے زمانہ میں اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ ہمارا قدیم وطن شاہجہانپور
ہے ایک صدی سے زیادہ مدت کے بعد چوتھی پشت میں ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ
میں ۱۸۹۶ء میں اپنے آبائی وطن آیا اور مدتوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر مستحکم ہوا۔ آمد و رفت
کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد اپنے اعزہ کے علاوہ ..... سے ملا اور صبیح الدین صاحب
سے ملاقات ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ ہم دونوں نوجوان نہ سہی جوان ضرور تھے۔" شادی
سے پہلے اور شادی کے کچھ عرصہ بعد تک ٹونک میں ملازمت کا سلسلہ رہا اولاً مدرسہ خلیلیہ اور
بعدہٗ پرگنہ علی گڑھ میں لیکن شادی کے چار ہی سال بعد پانچ چھ برس کا عرصہ پے در پے
آلام و مصائب کا دور بن گیا۔ ۱۹۰۰ء میں شفیق دادا نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایک
سال بعد رفیقۂ حیات نے داغ مفارقت دیا اور چار برس بعد والدہ کے سایہ سے
محروم ہوئے۔ پہلا زخم ہی کاری تھا کہ دو اور داغ لگے اور ایسے لگے کہ زندگی کا رنگ
ہی بدل گیا یا تو پہلے "نوجوان نہ سہی جوان ضرور تھے" اور اب میرا معیار انتخاب تو آہ
ہے واہ سے کچھ سروکار نہیں " کی یاس پرور فضا میں زندگی بسر ہونے لگی داغ کے شعر

عدم کو چلے جائیں گے ہجر میں ہم   اکیلے رہیں گے اکیلے رہے ہیں

کے سلسلہ میں لکھتے ہیں " اکثر جذبات جدائی اور گردش زمانہ کی تصویریں کھینچی ہیں لیکن یہ

شعر برسوں میری زبان پر وظیفہ رہا ہے۔ ہجر کے صدمے اور وصل کی مایوسی سے جو ناسور دل میں پڑتا ہے اور پھر وہ رستا رہتا ہے تو یہی حالت ہوتی ہے بس وہی جانتا ہے جس کے دل پر گذرتی ہے :

سولہ سترہ برس کی عمر سے خیال تھا کہ کچھ کیا جائے۔ اس امنگ کو غم نے دبانا چاہا لیکن غم کے تیر و نشتر بھی کام کر گئے۔ دل پہ چوٹ لگ چکی تھی طبیعت گداز ہوئی اور شاعری پروان چڑھی دل کو بہلایا ہی جاتا ہے۔ دوستوں نے زور دیا کہ قابلیت لاکھ سہی زمانہ ڈگری کو دیکھتا ہے اس لیئے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا جائے : سنہ ۱۹۰۶ء میں پنجاب جاکر امتحان دیا اور عرصہ تک وہیں قیام رہا۔

پنجاب سے کنارہ کشی کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں ہیڈ مولوی کی جگہ تقرر ہوا۔ اور یہ سلسلہ سنہ ۱۹۱۲ء سنہ ۱۹۱۳ء کو نکال کر سنہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔ اٹاوہ میں طلبہ کی مذہبی نگرانی اور فرائض مذہبی کی پابندی کی تاکید کے علاوہ اردو کی خدمت خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اسکول میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی جس کے روح رواں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے بڑے بھائی عابد حسین خاں مرحوم تھے اور بعد میں نور الرحمن صاحب ہوتے۔ اٹاوہ کے قیام نے اردو کے مرکز سے قریب تر کر دیا تھا۔ یوپی میں ہر بڑے شہر میں شعرا اور ادیبوں کا اجتماع ہوتا تھا جس میں یاس مرحوم بھی شریک ہوتے تھے چنانچہ اکثر غزلیں علی گڑھ۔ فرخ آباد۔ مین پوری۔ کانپور کے مشاعروں کے لئے کہیں اور استادان فن خصوصاً مولانا حسرت سے داد سخن لی اس شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور یاس عظیم آبادی کے چراغ سخن کے جواب میں رسالہ مرتب کیا جس کا تاریخی نام ترازدئے سخن رکھا۔

یہ زمانہ قومی ہل چل کا تھا برطانیہ کے جھٹکوں نے مسلمانوں کو خوب جھنجوڑا تھا۔ یاس نے دل درد آشنا پایا تھا اور بزرگوں سے سنا تھا کہ مولوی مدن صاحب نے حافظ

رحمت خاں کی حمایت میں جاگیر کو خیرباد کہا۔ اس کے بعد دوسروں نے ۱۸۵۷ء میں خون سے کفن رنگا۔ ان روایات نے اس دور میں حب وطن کا رنگ چڑھایا جس کا عملی اظہار سودیشی کی ترویج تھا۔ راقم الحروف کو اب تک یاد ہے کہ ۱۹۱۲ء میں شیروانی کا ایک خوبصورت کپڑا دے کر کہا "یہ سودیشی ہے سودیشی" وہ یہ کہے جاتے تھے اور فخر سے آنکھیں روشن ہوتی جاتی تھیں۔ الفاظ تو سیدھے سادے ہیں لیکن حب وطن کا زندگی بخش جذبہ ان کو گرما رہا ہے۔ اور یہ صرف اتفاقی امر ہی نہ تھا بلکہ سید محمد عمر حسینی صاحب مرحوم سے مل کر ریاست میں ایک کمپنی قائم کی اور دوکان چلائی جس میں سودیشی اور صرف سودیشی چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔

یہ چنگاری سلگ ہی رہی تھی کہ ۱۹۲۰ء آپہنچا اور اسے جو کام کرنا تھا کر گیا۔ ۱۹۲۰ء اسٹیٹ اسکول سے قطع تعلق کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اپنا رشتہ جوڑا۔ اس واقعہ کی تفصیل خود ان کی زبان سے سنیئے۔

جامعہ آنے سے پہلے جس جماعت سے وابستہ تھا۔ وہاں کے ارباب حل و عقد ایک جلسہ کی اجازت دینے میں پس و پیش کر رہے تھے بلکہ منع ہی کرنا چاہتے تھے کہ میں یہ اکتا کر کہہ اٹھا کہ آپ منع کر دیجئے سب سے جانا ہوگا وہ چلا جائے گا۔

سوال۔ کون جائے گا۔

جواب۔ میں جاؤں گا۔

سوال۔ آپ ایسے دلیر کب سے ہو گئے۔

جواب۔ جب سے کمزور ہوا۔

سوال۔ کیا۔

جواب۔ بات یہ ہے کہ سن کہولت سراسر افسردگی کا زمانہ ہے کسی جوشیلی زندہ دل جماعت میں شامل ہو کر ممکن ہے کہ تازہ زندگی میسر ہو جائے سو الحمدللہ وہ خیال

صحیح نکلا اور تقریباً دس سال تک غیر معمولی طور پر بہت اچھی بسر ہوئی جوشیلی جماعت میں آکر بھی دو تین سال چہل پہل رہی۔ چنانچہ ۲۹ اکتوبر کو جب مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنے پاک ہاتھوں سے مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں جامعہ کا افتتاح کیا تو یاس وہیں موجود تھے اور اس دن سے بانیاں اور طلبائے جامعہ سے جو تعلق ہوا وہ آخر عمر تک نہ ٹوٹا۔ یہ گویا نئی زندگی تھی نیا پیام تھا جو انھیں ملا تھا اس نے افسردگی کی جگہ تازگی اور جوش پیدا کیا۔ چنانچہ ایک جگہ ڈائری میں لکھتے ہیں "محض عطیہ اللہ کی شادی (سنہ ۲۰ء) کے بعد سے قدرے حالت سنبھلی کہ علی گڑھ کے قیام تک یا زیادہ سے زیادہ ٹونک جانے تک" حب وطن کا یہ رنگ گہرا ہوتا گیا اور قومی جلسوں میں شرکت بڑھتی گئی۔ خصوصاً جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں سے تو شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں شریک نہ ہوتے ہوں انتقال سے چند دن پہلے دہلی میں علماء کا شاندار اجتماع ہوا۔ اس کے ہر جلسے میں شرکت کی اور آخری نشست سے واپسی پر جو درد دل میں لے کر آئے اس نے تیسرے دن عالم بقا ہی کو پہنچا دیا۔ اس زمانے میں مذہبی احساس بہت گہرا ہو گیا تھا۔ جس نے یاس تخلص سے بدل کیا۔ اور مومن اختیار کرایا۔ علاوہ ازیں دو تین قومی نظمیں بھی قلم سے نکلیں ایک مصطفیٰ کمال اور دوسری مولانا محمد علی مرحوم پر۔ افسوس کہ تلاش کے باوجود وہ نہ ملیں ورنہ نمونتاً پیش ضرور کرتا۔

سنہ ۳۲ء میں یکایک حج کا ارادہ ہوا اور توفیق الٰہی سے آناً فاناً سب سامان بھی مہیا ہو گئے۔ اور چھوٹے بھائی مولوی سید محمد اسماعیل صاحب کے ساتھ حج کو روانہ ہوئے اس وقت وارفتگی کی کیا کیفیت تھی بیان نہیں کر سکتا جس شخص نے والہانہ انداز میں برسوں

یاس کی آس کی ہے شرم تجھی کو مولا ۔۔۔ اس کو ہر وقت ترا محو تمنا دیکھا

کا ورد کیا ہے اس کی رگ رگ ریشہ ریشہ پر جذب و خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گی۔ جب وہ خانہ مولا کی حاضری کے شرف سے مشرف ہو رہا ہو۔ ڈاکٹر مظہر الحق گوہر مرحوم

کو ایک خط میں لکھا "آپ سے جانے اور آنے کی کیفیت کیا بیان کروں بس سرور و خمار کی سی کیفیت تھی۔ جاتے وقت سرور تھا واپسی میں خمار" حرم پاک میں ان پر کیا گزری۔ اس کا کچھ کچھ اندازہ ان دو نظموں سے ہوتا ہے جو وہاں لکھی گئیں۔ ایک آقائے مدینہ کی نعت میں ہے جو سوز و گداز سے بھری ہے اور دوسری کا ایک مصرع یہ ہے "کچھ کسک دل میں لیتا جا یہ کسک پھر رنگ لاتے گی" افسوس کہ پوری نظم نہ مل سکی۔ ورنہ نقشہ پورا ہی کھنچ جاتا۔ غرض

تڑپتا ہوں مزے لیتا ہوں یا رب شکر ہے تیرا ۔ علاج درد دل بھی تو نے درد دل میں رکھا ہے

کی کیفیت پہلے ہی موجود تھی اب جو دیار حرم سے کسک ملی وہ نقشہ ہی بدل گئی۔ زندگی میں ایسی نمایاں تبدیلی ہوئی کہ با یدو شاید۔ حج کا یا پلٹ گیا۔ اب قدم قدم پر احتساب نفس۔ اعمال کا جائزہ۔ کوتاہیوں پر سرزنش۔ ڈائری کا ایک ایک لفظ اس کا گواہ ہے۔

۱۹۳۵ء میں بعض شکایتوں کی وجہ سے جامعہ سے کنارہ کشی کی ذاکر صاحب کو استعفیٰ بھیجا۔ ذاکر صاحب نے خط لکھا۔ ان کو جواب دیتے ہیں خاص اس بنا پر کہ آپ نے میرے استعفیٰ کا سبب مالی مشکلات کو قرار دیا ہے میں ہرگز اس سال اپنی علیحدگی پسند نہیں کرتا اور قسم کے ساتھ تو عہد نہیں کرتا مگر اللہ پاک سے توفیق کا طالب ہو کر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ مجلس منتظمہ کی تجویز کے خلاف کبھی کوئی احتجاج و استدعا نہیں کرنے کا۔ ہاں خیر خواہانہ حیثیت سے دوسری باتیں جو ہیں ان کے پیش کرنے سے کسی حال میں قاصر نہیں رہنے کا۔ خدا جانتا ہے کہ مجھے آپ سے محبت ہے اور محبت بھی عقیدت مندی کی صورت میں یہ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کا سچا خیر خواہ ہوں اور آپ سے لڑتا بھی ہوں غیبت میں عام جلسوں میں آپ کی تعریف بھی کرتا ہوں۔ برائی بھی کرتا ہوں"

جامعہ سے استعفیٰ تو واپس لے لیا مگر صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ اختلاج قلب کی شکایت پہلے ہی تھی۔ ضعف پیری نے اس میں اضافہ کر دیا اور درس و تدریس کا

تحمل نہ کر سکے۔ اس لئے جامعہ کی ملازمت سے دوبارہ سبکدوشی حاصل کی مگر روحانی تعلق قائم ہی رہا۔

ضعف بڑھتا جاتا تھا۔ اوراد وظائف کی پابندی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ پھر احباب و اعزہ سے ملنا جلنا بھی محبت و اخلاص کا تقاضا تھا۔ اس سلئے چلنے آنے جانے سے تکلیف بڑھی۔ مرض قوی ہوا لیکن تعلقات نے اس کو گوارا نہ کیا کہ مرض کے خیال سے ان میں کمی کی جائے۔ آخرش جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا۔ اسی ضعف و بیماری کی حالت میں جمعیۃ العلماء کے جلسے میں گئے۔ طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ شام کو لوٹے تو دل کو ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھے۔ اسی حالت کرب و تکلیف میں ایک دن اور دو راتیں بسر کیں۔ دوسری شب ختم ہو رہی تھی صبح صادق طلوع ہو چکی تھی نماز کے لئے اٹھے وضو کرنا چاہا۔ نہ کر سکے۔ تیمم کیا اور ۱۳ محرم الحرام کو اپنی عمر کے اکہترویں سال جان جاں آفریں کے سپرد کر کے اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

یہ زندگی کیسی گذاری، کاغذات کو تلاش کرنے سے معلوم ہوا کہ ابتدائی عمر میں جو خیالات پکائے جاتے تھے جو منصوبے ہوتے تھے انھوں نے عملی جامہ پہنا اور مرحوم نے کم سے کم دس تصانیف چھوڑی ہیں۔ تسخیریاس (ابتدائی کلام) چھپ چکا ہے باقی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں سے تین رسالے ہیں جن میں ادبی بحث ہے مثلاً اثر۔ تاثیر۔ تاثر" "مرحبا اللہ" "قافیہ پیمائی" تین ریڈریں ہیں بچوں کے لئے دو اردو کی ایک فارسی کی۔ ایک بچوں کے لئے اردو کا قاعدہ ہے جو جامعہ کی فرمائش پر بہت اہتمام سے لکھا گیا اور خوبی یہ ہے کہ جدید تجربوں کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے کی آخری کڑی انتخاب کلام داغ بھی ہے جس کا سطور بالا میں اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ اس انتخاب سے ان کے مذاق شعر پر روشنی پڑتی ہے اس لئے دو تین اقتباس پیش کرنا موزوں ہو گا۔

جراحت دل کی لائی رنگ آنسو ضبط کرنے سے　　کیا ہے تازہ اس سیراب نے زخم کہن اپنا

مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی نے صرف محاورہ کی بنا پر اس شعر کو انتخاب کیا ہے
صرف محاورہ ہی محاورہ ہے شعر نہیں ہے۔ ذوق اور ان کے ہم مذاق صرف محاورہ کو
نظم کرکے اس کا نام شعر رکھتے ہیں اور کہتے ہیں اس شعر میں محاورہ ہے ہم کہتے ہیں کہ
شعر کہاں سے ہوگیا جب تک اس میں کوئی نئی انوکھی بات یا تاثیر نہ ہو

مانگتا ہوں جو دعا وصل کی ان کے آگے — چپکے چپکے وہ کہے جاتے ہیں ممکن ہی نہیں

میرا معیار انتخاب تو آہ ہے۔ واہ سے کچھ سروکار نہیں مگر واہ پر بھی واہ منہ سے نکل جاتا
ہے لہٰذا کہنا پڑا کہ کیا خیال کی شوخی ہے جس نے معشوق کی شوخ ادائی کی تصویر کھینچی ہے
دراصل معاملہ باندھنا شوخ مزاجوں اور رنگین مزاجوں کا کام ہے۔"

جذب دل آزما کے دیکھ لیا — اس نے کچھ مسکرا کے دیکھ لیا
غیر کو منہ لگا کے دیکھ لیا — جھوٹ سچ آزما کے دیکھ لیا
داغ نے خوب عاشقی کا مزا — جل کے دیکھا جلا کے دیکھ لیا

اس غزل کے اشعار اس زمین کے لحاظ سے بہترین اشعار ہیں بعض اور استادوں اور
مشاقوں نے بھی طبع آزمائی کی مگر ایسے اشعار کم نکال سکے اور اب بھی یہ زمین موجود ہے
جس کا جی چاہے زور لگا دیکھے...... مطلع لاجواب ہے۔ جذب دل جسے بہت کچھ
سمجھے ہوئے تھے اس کی یہ کائنات اور نتیجہ تھا اور پھر اس نے کچھ مسکرا کے" کیا پر لطف
معنے دے رہا ہے۔ مقطع بھی لاجواب ہے اور اس میں تو آگ ہی لگائی ہے۔"

سطور بالا میں یاس مرحوم کی زندگی کے دو رنگ یعنی ادبی و مذہبی تو سامنے آگئے
اور اگر ان میں خانگی زندگی اور روزانہ معاشرت کا رنگ بھی بھر دیا جائے تو ناظرین پوری
طرح سمجھ سکیں گے وہ کیسے انسان تھے۔ کیسی زندگی بسر کی کہ آج یادرفتگاں کے سلسلہ میں
ان کی یاد پھر تازہ ہوئی آپ نے جگہ جگہ ڈائری کے اقتباسات پڑھے ہیں۔ ڈائری رکھنے
کے یہ معنے ہیں کہ مرحوم نے اپنی زندگی کا نظام بنا لیا تھا اور وہ اپنے اوقات کے بہت

زیادہ پابند تھے۔ اس پابندی کے علاوہ ڈائری سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی اور وہ پچھلے اندراجات کا مطالعہ اور عزائم سابقہ کا جائزہ ہے۔ ڈائری کا یہ انداز شاید آپ نے اور کہیں نہ دیکھا ہو یعنی ہر دور میں دور سابق پر نظر اور آئندہ کے لئے پروگرام بنانا اسی طرح وہ اور بہت سی باتوں میں عام روش سے ہٹ جاتے تھے جیسا کہ محمود علی خاں لکھتے ہیں " آپ کا کلام تمام معائب شعری سے پاک ہے اور اگر کہیں عام روش سے آپ الگ ہوتے ہیں تو ناواقفیت کی بناء پر نہیں بلکہ محض اجتہاد کی بنا پر "

روزانہ معاشرت کے بارے میں محمود علی خاں لکھتے ہیں مولانا ایک بزرگ اور محترم ہستی ہیں اور قدیم وضع اور تہذیب کی مکمل یادگار ہیں آپ کا سارا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ جس جگہ آپ رہے ہر شخص آپ کا ادب و احترام کرتا رہا لیکن اس کے باوجود آپ کا سلوک نہایت شفقانہ ہے۔ جس کسی سے آپ کو اخلاص ہوتا ہے اسے پرانے زمانے کے بزرگوں کی شفقتیں یاد آ جاتی ہیں آپ ایک خاص آن رکھتے ہیں اور فطرتاً بہت نازک مزاج ہیں " اس شفقت اور سلوک کی تشریح یہ ہے کہ سری کرشن داس چھوٹے ہیں شاگرد ہیں لیکن ملنے کا اشتیاق اتنا ہے کہ لکھتے ہیں " اگر دہلی آپ کا آنا ہو تو مجھے مطلع کر دیجئے اگر صرف میری خوشی اور آرزو پوری کرنے کے خیال سے آئے تو یہ شرافت نفس کی ایک عدیم المثال ہو گی " یہ کچھ سری کرشن داس صاحب پر ہی موقوف نہیں۔ مہمانوں کے لیے ہر وقت چشم براہ رہتے اور جو کچھ امکان میں ہوتا کرتے۔

احباب کی خاطر داری کبھی کبھی زہد و ورع سے ٹکراتی مگر وہ ان کی دل شکنی کبھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دن عصر کے وقت راقم الحروف صحن میں بیٹھا کتاب دیکھ رہا تھا کہ مرحوم نشست گاہ سے گھبرائے ہوئے نکلے اور کہنے لگے " نماز کا وقت ہے وہ آئے ہیں اور پی رہے ہیں " گیا تو دیکھا جگر صاحب ننگے سر ننگے پیر نشہ میں مست کہہ رہے ہیں " میں جانتا ہوں کہ یہ کافر خراب ہے۔ حرام ہے مگر آخر کچھ تو ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی پیتا ہوں۔

نماز کا وقت جگر صاحب کی یہ حالت۔ خیال ہوا کہ ان کو بری طرح جھڑکیں گے مگر بڑی نرمی اور دردمندی سے کہا "اس کو چھوڑ دو یہ بہت بُری بلا ہے خدا جانتا ہے کہ میں نے تمھارے لئے حرم میں رو رو کر دعا مانگی ہے"

احباب کی فرمائشوں کے مہیا کرنے میں چاندنی چوک کے چار چار چکر لگاتے تھے لیکن بعض اوقات فرمائش اشعار کی ہوتی۔ اس کو بھی پورا کرتے۔ ایک واقعہ جس سے ان کی زندہ دلی کا ثبوت ملتا ہے انہی کی زبانی سن لیجئے۔

ناگور کے بیل بہت اچھے ہوتے ہیں ٹونک کے ایک رئیس کے ہاں ایک صوفی صاحب تشریف لائے جو اسی نواح کے سیاح تھے صوفی صاحب سے دریافت کیا حضرت آپ نورالدین ناگوری سے بھی واقف ہیں۔ فرمانے لگے سبحان اللہ بڑے بزرگ تھے بڑا شاندار مزار ہے رئیس دوڑے ہوئے خاکسار کے پاس آئے اور کہنے لگے میاں صاحب خدا کے لئے چند شعر نورالدین ناگوری کے شجرہ کے نام سے کہہ دیجئے۔ میں نے چند شعر کہہ دئے۔

بہر نورالدین عنایت کر مجھے آپ و گیاہ ۔۔۔ دور کر بہر نصیرالدین مرے بار گناہ

تغلب الدین جب کریں میدان ہو میں جست و خیز ۔۔۔ سب شوا اور دوڑ کر خدمت میں آئیں تیز تیز

شجرہ تیار ہوتے ہی محفل سماع شروع ہوگئی کوئی نورالدین کی طرح ڈکرا رہا ہے اور کوئی نصیرالدین کی طرح گردن ہلا رہا ہے غرضکہ "سب شوا اور دوڑ کر خدمت میں آئیں تیز تیز کا نقشہ صورت حال سے دکھایا"

احباب کی اس خاطرداری اور خلوص کا اثر ہوتا تھا حج سے واپسی کے وقت احمد بن الشبلی جہاز میں ہم سفر تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "فی الحقیقت جہاز کا اجتماع مونس اور آپ کی صحبت کبھی دل سے فراموش نہ ہوگی" قاضی محمد خلیل صاحب سے برسوں کے تعلقات تھے۔ کیا اثر تھا ۱۱ر اگست ۳۵ء کو لکھتے ہیں "کعبہ خلیل۔ دامت فیوضہم علینا۔

تسلیم و نیاز۔ اعزاز نامہ آیا ــــــ کا پارسل پہنچا اور سب سے بڑی نعمت عظمیٰ اکٹھی تین غزلیں کہاں تک سپاس گزار ہوں "۔ خود مولانا محمد علی مرحوم جب ناگپور کانگریس میں گئے تو جامعہ کی نگرانی اور تمام حساب و کتاب مولوی شرف الدین صاحب مرحوم کے سپرد کیا کیونکہ ان کو ان پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ اعتماد کی یہ حالت تھی کہ بہت سے شاگرد اور دوست۔ محلے دار اپنے نجی معاملات میں مشورہ لیتے اور فخر کرتے کہ مولوی صاحب سے مشورہ لیا ہے۔

حدیث میں ہے "خیرکم خیرکم لاہلہ" تم میں سے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا ہے وہ واقعی اچھا ہے۔ اس معیار پر مرحوم پورے اترتے ہیں اور اس کی مثال ان کی سب سے بڑی قربانی ہے ۱۹۱۰ء میں رفیقہ حیات نے ساتھ چھوڑا۔ اس وقت ان کے صاحبزادے سید عبدالمحض چار سال کے تھے بعد میں راقم کی والدہ بھی رحلت کر گئیں۔ لوگوں نے لاکھ کہا لیکن شادی نہ کی اور ہر اصرار کے جواب میں یہی کہا "یہ دونوں کہاں جائیں گے"۔ پھر جب کبھی ہم بیمار ہوتے تو مطالعہ سے رو کتے اور فرماتے مجھے تمہاری صحت عزیز ہے ڈگری نہیں۔ بچوں سے بے انتہا محبت تھی۔ حج کے زمانے میں بچوں نے ہوائی جہاز دیکھا تو چلا چلا کے کہنے لگے "آہا ابا میاں آتے ہیں ہم کو پیسے دیں گے۔ ۱۹۳۶ء میں سب بچے علی گڑھ چلے گئے۔ لکھتے ہیں متعلقین کے جدا ہونے پر صبر کرنا چاہیئے۔ اللہ کے سب کام حکمت کے ہیں۔ امید ہے کہ اس وقت دل دکھنے کی حالت میں توفیق انابت ہو اور اس کی بہانہ جو رحمت کارسازی فرمائے اور کشف سوء اور کشف ضر کرے۔

درد آشنا یاس جن کا دل متعلقین کی جدائی پر دکھتا۔ احباب کے مصائب سے جگر چور ہوتا جگر کی منحواری پر روتا تھا آج متعلقین کو یاد آتے ہیں بچے کہتے ہیں کہ ابا میاں کے دم سے عید کی رونق تھی وہ کیا گئے کہ عید، عید ہی نہ رہی۔ احباب کی محفل سونی ہے اب اُن سے لطیفوں اور گرم جوشی کی مخلصانہ باتوں سے کون گرمائے۔ سب کو ان کی یاد ستاتی اور چپکے سے کان میں کہہ جاتی کہ دیکھو شریف انسان ایسے جیتے ہیں کہ آج بھی اس دنیا سے جانے کے بعد سینکڑوں ان کو روتے ہیں کہ اب ایسا دردمند شفیق اور مخلص کہاں۔ (سید محمد ٹونکی)

منشی علی محمد خاں مرحوم

زمانہ انسان کو نہ جانے کس کس طرح توڑتا مروڑتا، الٹتا پلٹتا اور گھستا ہے۔ کم ہمت اسی الٹ پلٹ میں کھوئے جاتے ہیں۔ لیکن مردانِ حر کو زمانہ دبا نہیں سکتا۔ دب جاتا ہے۔ ان کو بدل نہیں سکتا تو خود بدل جاتا ہے۔ یہ بڑی سخت آزمائش اور بڑے کٹھن امتحان کا وقت ہوتا ہے جو زمانے کے ہاتھوں ہر کسی سے لیا جاتا ہے۔ مردانِ حر زندگی کو محکم و آراستہ کرتے ہیں اور زندگی سے زندگی کا کام لیتے ہیں۔ وہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ زندگی کو انسان نہیں۔ انسان کو زندگی بخشی گئی ہے۔

میرے منشی جی! میرے علی محمد خاں جن کو مرحوم لکھتے دل تھر تھراتا ہے۔ انہی مردانِ حر میں سے تھے جن کو زندگی اپنی کشمکش سے اور زمانہ اپنے حادثات سے دبا نہیں سکا۔ وہ اس کے بہاؤ کے ساتھ نہیں ہولئے بلکہ اس کے رُخ کو بدل ڈالنے کی سعی میں جان دی۔ کسی کی کامیابی کا اندازہ اس کی فتوحات اور املاک سے نہیں بلکہ اس کے بہتے ہوئے خون اور رستے ہوئے زخموں سے لگایا کرتے ہیں اور یہ حق ہر کسی سے ادا نہیں ہوتا۔

قدرت کی طرف سے بہ قدرِ ہمت اوست ہر کسی کو انعام اور عطیے بخشے جاتے ہیں۔ منشی جی نے قدرت کے اس عطیہ کا حق ادا کر دیا۔ اسی میں انھوں نے جان کھپائی اور ریاضت کی۔ اس میں انھوں نے مزہ نہیں ڈھونڈا۔

منشی جی کے آبا و اجداد نواب بنگش کے زمانے میں فرخ آباد آئے تھے وہاں وہ بڑے احترام اور عزت سے رکھے گئے۔ زمانے کی سب سے پہلی چوٹ ان کے دل

پہ یہ پڑی کہ ماں کی گود سے الگ کئے گئے۔ آٹھ برس کے ہوئے کہ باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ زندگی کی اس چوٹ نے اس کی حمیت میں گرمی پیدا کی اور ان کو حوادثات سے مقابلہ کرنا سکھا دیا۔ زندگی کے طوفانوں سے لڑنا اور مصائب و آلام سے ٹکر لینا انھوں نے اسی منزل میں سیکھا جب کوئی سہارا نہ رہا تو گھر سے نکل کھڑے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ بڑی کس مپرسی کی حالت میں گھر سے نکلا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ مقدر کی اس اندھیاری میں کیسے روشنی ملے گی۔ باپ سے بزرگوں کی عظمت کے چرچے سنے تھے تو دل اور تڑپتا تھا کہ مجھ میں اور ان میں کتنا فرق ہو گیا ہے جو کچھ میرے تن پر تھا وہی میرا سرمایہ تھا۔ بڑی بڑی تکلیفوں سے دہلی پہنچا۔ بھوکا پیاسا پردیسی، جان نہ پہچان، آخر ایک تارکش کے یہاں روٹی کپڑے پر نوکر ہو گیا۔ کہتے تھے میں نے بڑی محنت اور مصیبت اٹھائی اس کے لئے دریا گنج کے کسی کنوئیں سے پانی لایا کرتا تھا۔ اور دوپہر شام رات کسی وقت کی قید نہ تھی فرمایا کرتے تھے کہ میرے اس سب سے پہلے محسن میں یہ بڑی عادت تھی کہ اپنی تمام آمدنی کو شراب جیسے برے کاموں میں صرف کر دیا کرتا تھا۔ اس کی اس حالت پر میرا دل بہت کڑھا کرتا تھا۔ میں جب کبھی کوئی بات کرنے کی ہمت کرتا تو وہ ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ وہ میرا محسن ہے اپنا کام کرتا ہی رہا۔ اور اس وقت میری خوشی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ جب اس نے اس بری بات سے توبہ کی۔ اور میری کوشش بار آور ہوئی۔ کہتے تھے ایک مرتبہ وہ میرا محسن بیمار پڑا تو اس کو بڑی تکلیف تھی جاں کنی کی حالت میں حکیموں نے شراب تجویز کی۔ کہ اس کے حلق میں ٹپکانے سے اس کو تسکین ہو گی۔ کہتے تھے جوں ہی اس کے منہ میں شراب ٹپکائی گئی۔ اس کی جان نکل گئی۔ اس وقت میں تڑپ گیا کہ انسان کی نیت پر اس کا خاتمہ ہوا کرتا ہے جب وہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے تو بہت آزردہ ہو جاتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تارکشی میں جب کوئی فلاح نہ دیکھی تو اس کی دھن لگی کہ پڑھنے لکھنے کا ماحول ملے۔ مطبع مجتبائی میں نوکری کر لی۔ وہاں صرف ردیوں ہی پر رہا۔

بعد میں آٹھ روپے میری تنخواہ مقرر ہوئی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بڑی تن دہی سے کام کیا معکوس نویسی میں نے سیکھی۔ پھر خطاطی کی مشق کی اور اس میں کافی مہارت حاصل کی۔ کہتے تھے کہ اچھے استاد کی تلاش میں آگرہ گیا اور دہلی میں مختلف استادوں کے پاس حاضری دی لکھنو اور کان پور بھی گئے۔ استاد کی خاطر نہ جانے کہاں کہاں کے سفر کئے جس جس سے اصلاح لی اس نے سال چھ مہینے کے بعد ہی یہ کہہ دیا کہ اب صرف مشق کی ضرورت ہے اصلاح کی گنجائش نہیں۔

ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی پریس زوروں پر تھا۔ وہ علی گڑھ چلے آئے اور وہاں کام شروع کر دیا۔ کہتے تھے ساتھیوں کے مقابلے نے مجھے بڑا فائدہ پہنچایا۔ ان کی اور میری بھی کوشش رہتی تھی کہ اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر کام ہو اور کام لینے والے بھی اچھے سے اچھا کام چاہا کرتے تھے۔ ان کی شہرت گھر سے باہر نکلی۔ رحمت اللہ رعد (نامی پریس والے) نولکشور پریس سے میرے پاس علی گڑھ کام آنے لگا۔ رحمت اللہ رعد فن کے بڑے قدر دان تھے۔ اور سب کچھ ان ہی پر چھوڑ دیتے تھے۔ منشی شمس الدین اعجاز رقم کارکنان مطبع سے ان کی سفارش کرتے اور انھیں کام بھجواتے۔

رام پور سے تقاضہ آیا کسی کو اپنی کتاب اچھی لکھانی تھی۔ رام پور گئے دولہا خاں اور دوسرے خطاطوں سے ملاقات ہوئی فرمایا کرتے تھے کہ ایک صاحب کے یہاں پہنچا ان کو اپنی مشق دکھائی تو انھوں نے بہت پسند فرمایا۔ بڑی تعریف کی اور میرا کتبہ مجھ سے مانگا میں نے ان کی نذر کر دیا اور ان سے ایک دوسرا کتبہ چاہا جو مجھے بہت ہی بھلا معلوم ہوا۔ انھوں نے دے دیا۔ میں اس کو پا کر بہت ہی خوش ہوا۔ اس سلسلے سے احمد حسن صاحب ضیا سہر رقم کے یہاں پہنچا جن کا وہ کتبہ تھا کہتے تھے میں ان کے پاس پہنچا تو بڑے تپاک سے ملے میں نے اپنا مدعا عرض کیا تو بار بار مجھ کو دیکھتے میرے خط کو دیکھتے اور کہتے بھئی تم تو بہت بڑے استاد ہو۔ تم واقعی سیکھنے آئے ہو یا مجھ سے مزاح کر رہے ہو کہتے تھے میں ان سے جتنا اصرار کرتا اتنا ہی وہ پریشان ہوتے۔ کبھی کبھی خفگی کی جھلک

بھی آجاتی۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ واقعتہ میں آپ کے پاس شاگردی کی نیت سے حاضر ہوا ہوں۔ پھر انھوں نے فرمایا کہ تم کو مشق بہت کرنی ہوگی۔ میں راضی ہوگیا۔ انھوں نے مجھ سے لکھوایا (قلم نوشدسے مر) یہ کوئی با معنی جملہ تھا جو مجھے یاد نہیں۔

منشی جی سب سے زیادہ احمد حسین صاحب کے قائل تھے کہتے تھے کہ رام پور کے شاہی کتب خانہ میں ملازم تھے اور فجر سے ظہر تک برابر مشق کرتے رہتے یہی ان کی زندگی کا محبوب شغلہ تھا وہ بڑے متبحر عالم بھی تھے اور بڑے بلند پایہ شاعر۔ وہ میر عیوض علی کے شاگرد تھے ان کا طرز میر عماد سے ملتا ہے۔ وہ میر عماد کے کتبوں سے اپنا خط اس طرح ملا دیتے تھے کہ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کئی دفعہ نواب صاحب رام پور نے ان کے کتبے میر عماد کے کتبوں کے دھوکے میں بڑی بڑی قیمت دے کر خریدے تھے۔

ان کو شہرت سے بڑی نفرت تھی۔ بڑے منکسرالمزاج تھے حسنی سید تھے۔ منشی جی نے دس گیارہ سال تک ان سے اصلاح لی۔ منشی جی کی مشق آخر دم تک جاری رہی کہتے تھے کہ فن کو قائم رکھنے کے لئے یا تو ہمیشہ مشق کرنی چاہیئے یا شاگردوں کو اصلاح دیتے رہنا چاہیئے۔ اسی سے خط میں زندگی آتی ہے۔ استاد کو یہ بہت عزیز تھے، انھوں نے سنگین قلم، فولاد رقم۔ رستم قلم اور اعتماد رقم کے خطابات دئے۔ یہ بھی بوڑھے ہو گئے تھے لیکن استاد کا ادب احترام ہونہار شاگردوں کی طرح کرتے رہے۔ ان کا حقہ بھرتے۔ ان کی خدمت کرتے۔

منشی جی نے علی گڑھ میں اپنا ایک مطبع "فیض عام" کے نام سے کھولا۔ رام پوری ٹوپیوں کی تجارت کی۔ طبابت سیکھی اور مدتوں کھیر ضلع علی گڑھ میں طبابت کی۔ ان کی محبت دردمندی اور ایثار نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ میں چلے آئے۔ اور مختلف حیثیتوں سے یہاں رہے۔ جامعہ پریس کے منیجر بھی اور بچوں کے استاد بھی۔ ہمارے شیخ الجامعہ صاحب اور ان کے برادران

عزیز بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ اور ان سے عام خط کی اصلاح لی۔

فرمایا کرتے تھے کہ کبھی ایسے ویسے استاد کا شاگرد نہ بننا چاہیے۔ پرنالے سے پانی نہیں لیا کرتے سمندر سے لیتے ہیں۔ بڑی دیگ کا کھرچن بھی بہت ہوتا ہے جتنے بڑے اور ماہر استاد کے شاگرد ہوگے اتنے ہی زیادہ فیض یاب ہوسکو گے۔

وہ شاگرد بنانے اور فن سکھانے میں بڑے محتاط تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نااہل کو کبھی فن نہ سکھایا جائے کیونکہ وہ فن کو رسوا کرتا ہے۔ دوسرا خیال ان کا یہ تھا کہ ناشکر کو بھی نہ سکھانا چاہیئے کیونکہ وہ فن کا حق ادا نہیں کرتا۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ حق ادا کرنے میں گھلنا ہوتا ہے۔ یہی وجوہ تھیں کہ وہ شاگرد بنانے میں بڑی بڑی پابندیاں لگایا کرتے تھے۔ اور اپنے شاگردوں کو طرح طرح سے پرکھا کرتے تھے۔ میں نے ان کی خفگی بھی دیکھی ہے اور محبت بھی۔ لیکن میں نہیں بتا سکتا کہ ان کی خفگی میں محبت زیادہ ہوتی تھی یا ملامت۔ وہ وجہ بے وجہ خفا ہوجایا کرتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ ان سے خفگی کی وجہ پوچھی تو بڑی محبت سے فرمانے لگے کہ انسان کی جانچ محبت سے بھی ہوتی ہے اور خفگی سے بھی۔ جو آدمی خفگی میں گستاخ ہوجاتا ہے وہ ناشکر ہوتا ہے۔

وہ بظاہر بڑے سخت تھے لیکن بباطن بڑے نرم جو لوگ اس کا اندازہ ان کی زبان سے لگاتے ہیں وہ ان کے دل سے واقف نہیں۔ جب کبھی ان کی اس سختی کا ذکر ان سے آیا تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ جھرجھری آتی اور آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ فرماتے ہم مجازی حاکموں کے حکم کی تعمیل بے تابانہ کرتے ہیں۔ دل اور جان سے اس میں لگ جاتے ہیں ان کی خوشنودی کا خیال ایمان جان کرتے ہیں لیکن اپنے مالک حقیقی کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ اس کے حکموں کو نہ جانے کیا سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ منہ پھیر لیتے ہیں۔ جیسے اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو بے پرواہ۔ بے باک لیکن مجازی حاکموں کے یہاں ادب و احترام سے ڈرتے اور جھکتے جاتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے

کہ ان سبھوں کی زندگی اور موت اسی حاکم حقیقی کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے بڑی ناشکری کیا ہوگی کہ ہم اس کے بندے ہو کے اس کے حکموں کی تعمیل نہ کریں اس میں کوتاہی کریں۔ مجازی حاکموں کے حکموں کی تعمیل میں تو ہم سخت رہیں اور مالک حقیقی کے حکموں میں نرم۔

منشی جی مصلحت کے بالکل قائل نہ تھے جو ان کے دل میں ہوتا وہی ان کی زبان پر اس کی وجہ سے انھوں نے بڑے بڑے نقصان اٹھائے کہتے تھے میں ہمیشہ نقصان اٹھاؤں گا لیکن دل اور زبان میں دو رنگی نہیں ہونے دوں گا۔

وہ وعدے کے بڑے پکے تھے جو زبان سے کہہ دیتے وہ کر بھی دیتے۔ اکثر یہ آیت پڑھ دیتے یاایہا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون۔ کبر مقتا عند اللہ الآیۃ (اے ایمان والو! ایسا کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کی اس میں ناراضی ہوتی ہے کہ جو کہو وہ نہ کرو)

کہتے تھے جھوٹے کے وعدے سے رنج اور سچے کے وعدے سے راحت ملتی ہے۔ اس پر ان کا عمل بڑے بڑے دکھوں میں بھی رہا۔

منشی جی مرحوم کا جن سے واسطہ رہا وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے جتنی خدمت دوسروں کی کی ہے اتنی خدمت انھوں نے لی نہیں۔

ان کی عبادت گزاری کا یہ عالم تھا کہ راتوں کو سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز آتی۔ ایک دفعہ غلطی سے میں نے دریافت کر لیا کہ منشی جی کیسا مزاج ہے؟ تو چپ ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے کبھی نہ ٹوکا۔ پیروں پر ورم ہو جاتا اور چاہے جتنے بیمار ہوتے لیکن باجماعت نماز کبھی قضا نہ کرتے۔ کہتے تھے بعض دفعہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ مکان گر گیا ہے اور چھت میرے اوپر آ پڑی ہے۔ میں لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہتا اٹھتا تو اذان ہوتی سنتا اور فوراً وضو کر کے مسجد کو چلا جاتا۔ کہتے تھے میں جب کبھی کسی کی مریدی کا خیال کرتا تو رات کو عجیب عجیب خواب دکھائی دیتے اور میں اپنا ارادہ ترک کر دیتا۔

کہتے تھے کہ کسی قوم میں مسلمانوں سے بہتر اور دلکش خطاطی نہیں ملتی۔ تصویر کشی اور

مصوری۔ ادب اور شاعری انسان کے فطری جذبات ہیں۔ چونکہ تصویر کشی اور مصوری پر مذہب اسلام کا چوکیدار بیٹھا ہے اس لئے ان لوگوں نے جن میں یہ جذبہ موجود تھا پہلے تو انتہائی جرأت سے اس کو دبانے کی کوشش کی مگر قدرتی اور فطری چیزوں کا دبانا آسان نہیں۔ آخر یہ جذبات ابھرے تو وہ پھل پھول درخت اور مختلف قسم کے بیل بوٹوں کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ مگر جب اس طرح بھی ان کی پیاس نہ بجھی تو سب سے زیادہ زور انھوں نے خوشنویسی پر دکھایا اور آج جو خطاطی کے بہترین نمونے دیکھنے میں آتے ہیں یہ وہی قوت اور جذبہ ہے جس نے نقاشی کو حروف کی شکل میں منتقل کر دیا ہے۔

خطاط کا قلم حروف میں جان ڈال دیتا ہے۔ اس کو رواں۔ لطیف، تندرست اور پرشوکت بنا دیتا ہے جیسے بیمار آدمی کا چہرہ بشرہ اچھا نہیں معلوم ہوتا اسی طرح روکھے پھیکے۔ بیمار، سخت اور بے روح حروف بھی بھلے نہیں لگتے۔ پرشوکت حروف کی تعریف اس طرح کرتے تھے کہ ایک مرتبہ احمد حسن صاحب کے پاس کوئی صاحب بڑا اچھا کتبہ لائے اور استاد سے داد چاہی۔ تو انھوں نے فرمایا۔ بہت خوب حروف کو دلہن بنا دیا ہے۔ جب میں نے تشریح چاہی تو فرمایا کہ دلہن کی چال ڈھال میں نسوانیت ہوتی ہے وہ حسین ضرور ہوسکتی ہے لیکن اس میں شوکت نہیں ہوسکتی۔ جنگل میں ہرنیاں بھی پھرتی ہیں اور شیر بھی رہتے ہیں۔ جب ضیغم ڈکارتا ہوا کچھار سے نکلتا ہے یا ہرنیاں مرغزاروں میں کلیلیں کرتی ہیں تو دونوں چیزیں دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ایک میں طوفان ہوتا ہے۔ جس سے زندگی ٹپکتی ہے ایک میں افسردگی ہوتی ہے جس سے نیند آتی ہے اور سکون طاری۔ ایک سے عظمت برستی ہے۔ ایک سے لطافت۔ یہ اپنا اپنا ذوق ہے۔ بعض دل ہرنیوں پر ریجھتے ہیں۔ بعض کے قلوب ضیغم کی ڈکار سے متاثر ہوتے ہیں۔ بعض طوفان بن کر دریاؤں کے دل دہلانا چاہتے ہیں۔ بعض شبنم بن کر گل لالہ میں ٹھنڈک پہنچانا چاہتے ہیں۔

منشی جی کے خط میں مردانہ بانک پن پایا جاتا ہے۔ جب خطاط کا قلم جوش سے

لبریز ہو کر لکھتا ہے۔ خط کا اصلی حسن وہی ہوتا ہے۔ منشی جی بہت بڑے مصور بھی تھے۔ لیکن جب سے وہ مذہب کے رنگ میں رنگے مصوری سے تائب ہو گئے۔ پھر کبھی کوئی تصویر نہ بنائی۔

کہا کرتے تھے کہ فن کے حاصل کرنے میں دو منزلیں بڑی کٹھن آتی ہیں۔ ایک ریاضت دوسرے اس کا احترام۔ انھوں نے اپنے فن کے سلسلہ میں ان دونوں چیزوں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ کہتے تھے جتنی محنت کسی چیز کے حاصل کرنے میں کرنی ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ محنت اس کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں کرنی پڑتی ہے۔ فن میں جب تک فنا کا رتبہ حاصل نہ کیا جائے فن کا حق ادا نہیں ہوتا۔ فن پیٹ پالنے اور وقت کاٹ لینے کا ذریعہ نہیں بلکہ خدا کی دین کا احترام کرنا اور شکرانہ بھیجنے کا وسیلہ ہے۔

کہتے تھے جب منزل آجاتی ہے تو سواری سے اتر جایا کرتے ہیں جو لوگ کسی فن میں ماہر ہو جاتے ہیں وہ غرور اور تمکنت کی سواری سے اتر جاتے ہیں منشی جی فن کے متعلق فرماتے تھے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کسی کا یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ کامل ترین فن کار ہے۔ یہ بات تو صرف انبیا کے لئے مخصوص ہے۔ باوجود سخت سے سخت ریاضت کے، باوجود انتہائی محنت و استقلال کے فن میں کوئی نہ کوئی خامی رہ جاتی ہے۔ یہ انسان کی لاچاری اور بے بسی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ریاضت اور خوبی کے پہلوؤں کے بل بوتے پر کمزور پہلوؤں کو نبھالے اور وہ خامیوں میں خوبیاں پیدا کر دے یا خامیوں کے عیوب کو چھپالے۔ وہ اپنے استاد کے متعلق کہتے تھے کہ استاد نے مجھے بہت سی مشقیں دیں جن کو بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ کہا کہ لو۔ میں تم کو ایک چمن دئے دیتا ہوں۔ یہ مت کہنا کہ استاد کو کچھ آتا نہیں۔ اس میں اچھی سے اچھی چیزیں تم کو ملیں گی اور بری بھی۔ بری کو چھوڑ دینا اور اچھی کو لے لینا۔ جو حروف کھرچ کھرچ کر اچھے بنائے جاتے ہیں وہ خوب صورت ضرور ہو جاتے ہیں لیکن ان کا زور، قوت

اور جوش کم ہو جاتا ہے۔ احمد حسن صاحب جیسے بڑے خطاط تھے اس سے زیادہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کا اپنا ایک قطعہ اپنے خط کے بارے میں ہے جس سے ولولہ ٹپکا پڑتا ہے۔

رنگ و بوئے گل بامن چیزے نیست   خطاطی خویش را چمن می دانم
بوئیکہ بر انداز حروف بافتن آرا   دل من واندو من می دانم

انھوں نے میر عماد کے ایک قطعہ کے مقابل میں قطعہ لکھا ہے مقابلہ کریجئے کہ جوش کس میں زیادہ ہے۔ میر عماد کا قطعہ یہ ہے۔

شد شہرۂ آفاق قلمرانی من   در خطۂ خط نیست کسے ثانی من
از روز ازل نمود تعلیم خطم   سرمشق نویس خط پیشانی من

استاد احمد حسن صاحب ضیا کا قطعہ یہ ہے۔

در شیوۂ خط وحید آفاق منم   گویند مرا امام فن اہل عجم
چوں کرد نظر بہ حسن خطاطی من   منشی فلک ندوست انداخت قلم

کہتے تھے کہ جس طرح بڑے سے بڑے شاعر کا ہر شعر اچھا نہیں ہوتا اسی طرح خوشنویس کا ہر کتبہ یا کتبے کے سب حروف اچھے نہیں ہوتے کچھ حروف بڑھیا ہوتے ہیں بعض گھٹیا۔ جس طرح کسی اچھے شاعر کے کسی پھسپھسے شعر سے اس کی قابلیت کا اندازہ نہیں لگایا کرتے اسی طرح خطاط کے خراب حروف سے اس کے فن کا اندازہ نہیں لگانا چاہیئے۔ انھوں نے بعض قطعات بڑی محنت سے لکھے تھے لیکن ان کو وہ ہمیشہ ناپسند فرماتے۔ کہتے تھے ان کو نہ دیکھا کرو۔

اچھے معلم کی لوگوں نے بڑی بڑی نشانیاں بتائی ہیں منشی جی اچھے معلم بھی تھے وہ شاگرد کی ہر ہر چیز پر نظر رکھتے تھے جو چیز اچھی ہوتی اس میں اضافے کی کوشش کرتے جو بُری ہوتی اس کا رخ بدل دیتے اور جو یہ کام کرتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کتنا کٹھن کام ہے۔

منشی جی تصویر کھچوانے کے ہمیشہ مخالف رہے ایک دفعہ اتفاق سے جامعہ میں کسی
تقریب پر گروپ لیا جا رہا تھا۔ اس میں منشی جی بھی موجود تھے فوٹو لیتے وقت انھوں نے منھ
پھیر لیا اور ان کا فوٹو نہ آیا۔
ان کا قد درمیانہ تھا۔ لیکن چلتے وقت بلند قامت معلوم ہوتے تھے چہرہ جلال برساتا
آنکھیں چھوٹی لیکن روشن جن سے ذہانت اور بلندی ٹپکتی۔ گندم گوں رنگ سر پر پٹھے۔
بڑے ملائم۔ کشادہ اور بلند پیشانی، ابھری ہوئی ناک کسی قدر لمبوترہ چہرہ، آنکھوں کے نیچے
کی ہڈیاں ابھری۔ لمبی گردن۔ بڑا دہانہ لمبی گھن کی ڈاڑھی لبیں کترواتے۔ آواز میں کرارا
پن زبان میں لکنت انگلیاں پُر گوشت۔
ہمیشہ گھٹنوں سے نیچا کرتا پہنتے۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ۔ گول اونچی ٹوپی
اس پر پٹکا لپٹا ہوتا۔ کڑھی ہوئی صدری۔ پیلے رنگ کا عربی رومال کا سموسہ بنا کر یا یونہی
کندھے پر ڈال کر چلا کرتے دور سے وجاہت ٹپکتی، چال میں سپاہیانہ پن۔ اگر مڑتے
بھی تو بڑی شان سے لیکن انکسار کو نہ چھوڑتے۔ کھری چارپائی پر ننگے سر پاؤں پہ پاؤں
رکھ کر بیٹھتے اس وقت ان کے چہرے سے بلندی اور شوکت برستی۔
لکھتے وقت سیدھے ہو کر لکھا کرتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قلم کو حکم دے رہے ہیں
اور قلم ان کے حکم کی تعمیل میں مردانہ وار چل رہا ہے جس طرح بہادر سپاہی کا ہاتھ میدان
جنگ میں جاتے وقت تلوار کے قبضہ پر پڑتا ہے۔ اور وہ بڑی شان سے اٹھتا ہے اسی
طرح منشی جی قلم کو اٹھاتے اور اسی بانک پن سے رکھتے۔
ان کو مردانہ کھیلوں سے بھی بڑا شغف تھا کشتی لڑتے۔ بانک بنوٹ کو انھوں نے
مدتوں سیکھا اور اس میں بڑی مہارت حاصل کی۔ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں گولی چلی تھی لوگ
زخمی ہو ہو کر گر رہے تھے چاروں طرف سے گولیاں شائیں شائیں اور زائیں زائیں آتی
تھیں اور منشی جی مرحوم اپنی کمر میں پٹکا باندھے گرتے ہوئے لوگوں کو اٹھا اٹھا کر لے جاتے

تھے سب ہی نے منع کیا کہ ایسے خطرے کے وقت ہٹ آئیے۔ منشی صاحب ہم لوگوں پر رحم کیجئے کہنے لگے موت دو مرتبہ نہیں آتی۔ موت نہ وقت سے پہلے آتی ہے نہ بعد میں اس لئے میں مطمئن ہوں۔

سنہ ۳۵ء میں نئے انتظامات کے ماتحت کچھ تبدیلیاں ہوئیں اسی سلسلہ میں منشی جی جامعہ سے علیحدہ کر دئے گئے۔ چھٹیوں کا زمانہ تھا منشی جی وطن گئے ہوئے تھے۔ ان کو اطلاع بھیجی گئی کہ اب جامعہ کو آپ کی خدمات کی ضرورت نہیں۔ منشی جی بڑے اطمینان سے وطن سے آ ستے۔ میں نے دریافت کیا منشی صاحب اب کیا کیجئے گا؟ بڑے اعتماد سے فرمایا۔ مجھے اس کی فکر کیوں ہو جس کا بندہ ہوں. س کی فکر اُسے ہو؟ غرض منشی جی اپنے وطن فرخ آباد چلے گئے اور فتح گڈھ میں کوٹلے والی مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگے وہاں ایک مدرسہ بھی کھول لیا جو ان کی زندگی تک چلتا رہا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ان کا بلاوا آیا اور آخر وقت میں جب کہ کوڑی کوڑی کو تنگ تھے مردانہ وار مفلسی سے مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کے پیارے ہو گئے۔ اور فرخ آباد میں مسجد بی بی رابعہ کے پاس ایک املی کے پیڑ کے سایہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

(محمود حسن)

مولانا سیّد محمّد سورتی

مولانا سورتی صاحب کو جامعہ کی موجودہ برادری میں سے کم ہی لوگ جانتے ہوں گے۔ مرحوم سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۲۸ء تک جامعہ میں عربی کے استاد رہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ جو اس وقت جامعہ کے کام کر رہے ہیں، مولانا کے شاگرد ہیں۔ مرحوم جامعہ والوں کے بڑے تھے اور جامعہ کے سب استاد شاگرد مرحوم کی بڑی عزت کرتے اور ان کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں مولانا کے انتقال کی خبر آئی تو ہم لوگوں نے یوں محسوس کیا جیسے خاندان کا بزرگ چل بسا۔ وہ گو اب ہم میں نہیں رہتے تھے لیکن اس بعد مکانی کے باوجود نہ ہم نے ان کو اپنے سے دور سمجھا اور نہ وہ ہم سے حقیقتاً جدا ہوئے۔ وہ جامعہ کے تھے اور آخر تک جامعہ نے ان کو اپنا ہی سمجھا۔ ان کی بے وقت موت ایک ایسا صدمہ ہے جس کا غم ہمیشہ تازہ رہے گا۔

مولانا کے انتقال سے عربی علم و ادب کی دنیا کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ عربی ادب میں موصوف کے پایہ کا ہندوستان تو کیا شاید ساری اسلامی دنیا میں کوئی عالم نہ تھا۔ مرحوم کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور نظر بڑی دقیق۔ عربی زبان کی شاید ہی کوئی قابل ذکر تصنیف ہو گی جو مولانا کی نظر سے نہ گذری ہو۔ موصوف صرف کتابی عالم نہ تھے بلکہ صاحب تحقیق بھی تھے۔ عربی ادب پر ان کو کلی احاطہ تھا۔ جاہلی اور اسلامی دور کے تمام مشہور شعراء کے ہزارہا اشعار زبان زد تھے۔ مرحوم کا شعر کا مذاق بڑا پاکیزہ تھا۔ اور ہمیشہ بڑے اصرار سے شاگردوں کو اپنی پسند کے شعرا کا کلام پڑھاتے

اور مطلق اس کی پروا نہ کرتے کہ مدرسے کے مجوزہ نصاب میں وہ حصہ موجود بھی ہے یا نہیں
پڑھاتے پڑھاتے اگر کوئی غیر معمولی عمدہ شعر آجاتا تو مولینا اچھل پڑتے اور بار بار جھوم کر
اسے دہراتے اور اتنے محفوظ ہوتے کہ طالب علم بے ساختہ اس شعر کی داد دینے لگتے
مولینا کو علم حدیث سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ بخاری کے رجال پر بڑی بصیرت سے
محاکمہ کیا کرتے تھے۔ موصوف گو مذہباً اہل حدیث تھے لیکن اصول فقہ پڑھنے کی بڑی تلقین
فرمایا کرتے۔ اندلس کے مشہور ظاہری عالم ابن حزم سے مرحوم کو بڑی عقیدت کی اور
ایک زمانے سے ان کے متعلق عربی میں ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ دراصل مولانا کا
مسلک قدیم علمائے اہل حدیث کا تھا جو قیاس کے مقابلہ میں حدیث کو ترجیح دیتے
تھے چنانچہ تقلید و عدم تقلید اور فقہ و حدیث کی لفظی بحثوں سے ان کا دامن علم ہمیشہ
الگ رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ حدیث اور علوم دینیہ سے مولانا کا شوق ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔
موصوف کا اپنا مضمون عربی ادب تھا۔ چنانچہ عربی ادب ساری عمر ان کا اوڑھنا
بچھونا رہا۔ ادب میں مولانا کا اپنا ایک خاص مسلک تھا۔ خالص اور بے میل عربی زبان
کے وہ عاشق تھے۔ وہ شعر کو وہ شعر ہی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ شعر میں معمے
اور پہیلیاں کہنے کے وہ سخت خلاف تھے۔ اسی لئے عہد جاہلیت کے شعراء کا کلام ان
کو سب سے زیادہ پسند تھا اور ان میں بھی جو شاعر صحرائی اور بدویانہ زندگی میں زیادہ
رچا ہوا ہوتا، مولینا کا ربط اس سے اور ہی زیادہ ہوتا۔ عہد امویہ کے شعراء کو بھی وہ
غنیمت مانتے تھے، اور عباسیوں کے ابتدائی عہد کے شروع شروع کے شعرا بشار
اور ابو نواس وغیرہ کو بھی وہ پڑھانا منظور کر لیتے تھے۔ لیکن بعد میں ادب کے تکلف
تصنع کے دور کے اہل علم اور ارباب شعر کی تصنیفات کو پڑھانا وہ کبھی گوارا نہ کرتے
صرف و نحو اور معانی و بلاغت کے علوم میں بھی ان کا نظریہ سادگی پسند تھا۔ وہ تکلف

اور پیچیدگی کو خواہ وہ شعر میں ہو یا نثر میں، نحو کے قاعدوں میں ہو یا استعاروں یا تشبیہوں کی قسموں میں، دل سے ناپسند کرتے تھے تعجب یہ ہے کہ مولینا مرحوم کو عام طور پر رجعت پسند سمجھا جاتا تھا اور ان کا سارا ذخیرہ علم بھی زیادہ تر قدیم طرز کا تھا لیکن اس کے باوجود موصوف کا ادب و شعر کا مذاق عہد حاضر کے مصری اور شامی ارباب نقد سے بہت کچھ ملتا ہے۔

راقم الحروف کو دوران قیام مصر میں عربی زبان میں سب سے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین عمید جامعہ مصریہ کے لیکچروں کے سننے کا اتفاق ہوا جو وہ جامعہ اور بیرون جامعہ میں اکثر دیا کرتے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ پوچھئے جب میں نے "تجدید و تفرنج" کے اس امام کو جو پیرس یونیورسٹی کا ڈاکٹر ہے، اور اپنی قدامت دشمنی کی وجہ سے بہت بدنام ہے، ادب و شعر اور علوم معانی و بلاغت اور صرف و نحو کے متعلق کم و بیش وہی باتیں کہتے سنا جو دو برس پہلے ہندوستان میں مولینا سورتی جیسے قدامت پسند اور بقول شخصے "یکٹ ملا" سے جامعہ ملیہ کے درسوں میں سن چکا تھا۔

مولینا کا وطن سورت تھا صغر سنی میں علم کی کشش انھیں دہلی کھینچ لائی۔ مرحوم کبھی کبھی شاگردوں کو اپنے بچپن کے حالات سنایا کرتے۔ فرماتے تھے "کہ ہم توکل بخدا دہلی کے ارادے سے گھر سے نکل پڑے۔ زاد راہ ہمارے ساتھ صرف اللہ کا نام تھا۔ سورت سے دہلی تک کا اکثر راستہ پیدل طے کیا۔ دہلی پہنچے تو ایک مدرسہ میں جگہ مل گئی۔ ان دنوں کتابیں خریدنا ہماری بساط میں نہ تھا۔ ہم یہ کرتے کہ جس کتاب کی ضرورت پڑتی۔ اس کی نقل کر لیتے۔ اور اکثر تو کتابیں ہمیں ازبر یاد ہو جاتی تھیں۔ اس زمانے میں چاندنی چوک سے نہر بہتی تھی۔ اور اسٹیشن کے پاس کی زمین میں سایہ دار درخت کثرت سے تھے ہم سارا سارا دن درختوں کے نیچے مطالعہ میں گزار دیتے، پڑھنے سے جی اکتاتا تو دریا پر تیرنے چلے جاتے۔ چنانچہ تیرنے میں ہمیں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ بھرے دریا میں تیرا کرتے تھے۔ مولینا کہتے تھے کہ اول اول برسوں تک ہم پڑھا کئے۔ ہم محنت سے اپنے سبق بھی یاد کر لیتے۔ اور

کتابیں بھی ہمیں حفظ یاد ہو جاتیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم یہ سب ایک فرض سمجھ کر کیا کرتے تھے۔
علم کی لذت جو ہمیں بعد میں حاصل ہوئی اس سے ہم شروع میں عرصہ تک بے بہرہ رہے۔ بعد
میں جب کامل استادوں سے پڑھا تو پھر محسوس ہوا کہ علم کی لذت کیا ہے اور ادب میں
کیا لطف ہے۔

مولانا نے دہلی، ٹونک اور رام پور کے مدرسوں سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن ان
کے فضل وکمال میں زیادہ تر حصہ ان کے اپنے ذاتی مطالعہ اور شب و روز کی محنت کا ہے۔ ایک
زمانہ میں موصوف حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے ہم سبق بھی رہ چکے تھے۔ حکیم صاحب
مرحوم مولانا کی علمیت کے بڑے معترف تھے چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب علی گڑھ میں جامعہ کی
بنا رکھی گئی۔ تو حکیم صاحب کے بلانے پر مولانا جامعہ میں تشریف لائے اور عربی ادب
کی اعلیٰ تعلیم ان کے سپرد کی گئی۔ مولانا جامعہ میں سب کے مخدوم و محترم تھے۔ ان کے شاگرد
تو ان کی عزت کرتے ہی تھے۔ لیکن دوسرے طلباء اور اساتذہ بھی ان کی بزرگی کا بڑا خیال
رکھتے۔ مولانا بڑے سخت متشرع تھے اور عام نشست و برخاست اور وضع قطع میں ذرا سی
بھی بے راہ روی ان کو کھلتی تھی۔ چنانچہ اکثر مولانا ایسی باتیں دیکھ کر بگڑ جاتے۔ اور اپنا ڈنڈا
اٹھا لیتے۔ جامعہ کے خورد و کلاں ان کی طبیعت سے واقف تھے۔ چنانچہ مولانا کے عتاب پر ان
کی گردنیں جھک جاتیں اور انھیں مجبوراً آئندہ را احتیاط کا وعدہ کرتے بنتی۔ جامعہ کے اساتذہ
اور طلبہ سب کے سب مولانا کی ان باتوں کا برا نہیں مناتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مولانا
صاف دلی سے سب کچھ کہہ رہے ہیں۔ مرحوم دراصل ان کی مکروہات کو دل سے سخت ناپسند
کرتے تھے اور چونکہ وہ سب جامعہ والوں کو اپنا سمجھتے تھے اس لئے برملا اور بے دھڑک
جو محسوس کرتے کہہ دیتے اس میں نخوت یا تکبر کی بو نہ ہوتی تھی اور نہ کسی پندار زاہد کا مظاہرہ
یوں مولانا بڑے خوش طبع تھے۔ چھوٹے بڑوں سے کھل کر ملتے۔ ہر ایک سے اپنایت
برتتے۔ اور جامعہ کی برادری میں یوں معلوم ہوتے تھے، کہ گویا وہ بزرگ خاندان ہیں اور

واقعہ یہ ہے کہ جامعہ والے ان کو یوں مانتے بھی تھے۔

جامعہ جب دہلی آئی تو کچھ عرصہ کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر انھیں جامعہ سے الگ ہونا پڑا۔ وہ مجبوریاں ایسی تھیں کہ ان کا مداوا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مولانا دل سے نہیں چاہتے تھے کہ وہ جامعہ سے جائیں اور نہ جامعہ والوں کو مولانا کی علیحدگی گوارا تھی لیکن حالات پر کسی کا زور نہیں ہوتا۔ مولانا جامعہ سے چلے گئے۔ لیکن جامعہ کو بھولے کبھی نہیں، جب کبھی وہ دہلی تشریف لاتے جامعہ میں ضرور آتے ہفتوں ہفتوں یہاں ٹھہرتے اور ان کے آنے کے ساتھ جامعہ میں پھر پچھلی صحبتیں تازہ ہو جاتیں۔ مولٰینا کی وہی ڈانٹ ڈپٹ، برہمی اور عتاب اور ان کے شاگردوں کا جو اب خیر سے جامعہ میں استاد بن چکے ہیں۔ نیازمندی میں آنکھیں نیچی کر لینا اور گردن جھکا لینا۔ مولٰینا کی ذات بڑی بابرکت تھی ان کے اٹھ جانے سے علم و ادب کو جو صدمہ ہوا، وہ تو ہوا لیکن جامعہ کی برادری کو بھی ان کی وفات سے کچھ کم نقصان نہیں پہنچا۔ مولٰینا کی ذات ایسی تھی جس کی ہم سب عزت کرتے تھے، ایسے شخص جماعت میں بہت کم ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی کے گزر جانے کا صدمہ واقعی بڑا جانکاہ ہوتا ہے۔

مولٰینا نے کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں چھوڑی۔ وہ مطالعہ میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ تصنیف کے خیال کی انھیں کبھی فرصت نہ ملی۔ معلومات کا ذخیرہ اتنا وسیع تھا کہ اسے سمیٹنے کی اور اسے ترتیب دے کر کتاب کے قالب میں ڈھالنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ابن حزم پر انھوں نے کچھ لکھا ہے۔ لیکن شاید ہی اسے کوئی شائع کرے، لیکن مولٰینا کا قابل فخر کارنامہ ان کی مشہور کتابوں کی تصحیح ہے جن میں سے بعض حیدرآباد سے چھپ چکی ہیں، مرحوم قدیم کتابوں کے بڑے پرکھنے والے تھے۔ جامعہ میں آنے سے پہلے ان کا یہی مشغلہ تھا، پرانی کتابوں کی تلاش میں وہ کتب خانوں کو چھانتے پھرتے اور اگر کہیں انھیں کوئی نادر چیز مل جاتی تو اسے حاصل کرتے، اسے دیکھتے بھالتے، اس کی تصحیح کرتے۔ چنانچہ بڑے بڑے معاوضہ

پر سرکاری کتب خانے ان سے یہ نادر نسخے خریدتے تھے۔ مولینا کا اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں امید ہے بڑی نایاب اور نادر کتابوں کے نسخے ہوں گے۔ مولینا کو کتابوں سے عشق تھا، اچھی کتاب کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرتے تھے۔

الغرض مولینا ایک خوش طبع اور زندہ دل بزرگ تھے اور عربی کے ایک بے نظیر عالم اور محقق، علم کے سچے عاشق اور قدیم اسلامی تصنیفات کے بہترین ناقد اور واقف کار ان کمالات کے حامل اب کہاں ملتے ہیں بے شک مولینا ایسے بزرگ اور عالم کا انتقال صحیح معنوں میں ایک قابل تلافی نقصان ہے کسی نے کتنا ٹھیک کہا ہے، موت العالِم موت العالَم (صاحب علم کی موت ایک عالم کی موت ہے)۔

(محمد سرور)

آپا جان، مس گرڈ فلپس بورن

جہاں تک مجھے یاد ہے مس فلپس بورن سے ذاکر صاحب. عابد صاحب کی اور میری پہلی ملاقات ایک دعوت میں ہوئی جو برلن میں مسز نائیڈو کی سب سے چھوٹی بہن مسز نمبیار کے مکان پر ہوئی تھی۔ یہ دعوت کھانے پینے کی نہیں تھی اس کا مقصد ہندوستانیوں اور مہذب خوش اخلاق جرمنوں کے درمیان میل جول کے موقعے فراہم کرنا تھا۔ دعوت کی تاریخ کیا یاد رہتی سال کا بھی خیال نہیں غالباً ۲۴ء تھا اس پہلی ملاقات کے بعد دو ایک مرتبہ اور ایسی محفلوں میں ملنا ہوا پھر مسز نمبیار کسی بات پر خفا ہو گئیں اور دعوتوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

پھر ایک روز ذاکر صاحب نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ "جب سے وہ دعوتیں بند ہو گئیں ہیں نئے لوگوں سے ملنے کی نوبت ہی نہیں آتی" شاید انھیں اس معاملے کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔

شاید لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا معقول لوگوں سے ملنا انھیں کی عنایت سے ہو سکتا ہے

"پھر کچھ کیجئے نا؟"

"کیا کروں؟"

"مس فلپس بورن ہی کو ٹیلیفون کیجئے"

"آپ نے اچھا یاد دلایا ابھی کرتا ہوں"

ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی تو میں پاس کھڑا تھا چائے کی دعوت میں، میں بھی بلایا گیا

ہم لوگ پہنچے تو مس فلپس بورن گھر پر نہیں تھیں۔ ماں باپ پریشان تھے انھیں نئے زمانہ کا یہ
طریقہ بالکل پسند نہ تھا کہ مہمان آجائیں اور میزبان گھر پر موجود نہ ہو۔ لیکن وہ اس ذرا سی
بات کی کیا شکایت کرتے۔ جب نئے زمانے کی لڑکیاں خود مختاری کا دم بھر رہی تھیں۔
گھریلو زندگی بسر کرنے اور شادی کرنے سے انکار کر رہی تھیں۔ جس سے جی چاہتا ملتیں۔
جہاں جی چاہتا جاتیں جب جی چاہتا گھر واپس آتیں نہ کھانے کی فکر کرتیں نہ کپڑے کی نہ انھیں
اس کی پروا ہوتی کہ ماں باپ کا سایہ سر پر نہ رہے گا تو کیا کریں گی۔ مس فلپس بورن کی
بڑی بہن ڈاکٹر کارل مائیر دق کے ایک ماہر کے یہاں کام کرتی تھیں۔ میں ڈاکٹر مائیر سے
اپنا معائنہ کرانے گیا تو وہ مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرائیں گویا برسوں سے جانتی ہیں۔ انھیں
سے مجھے معلوم ہوا کہ مس فلپس بورن کی بڑی بہن ہیں اس کے بعد ان سے پھر کبھی ملاقات
نہیں ہوئی اور ہوتی کیسے وہ کسی کام، کسی مقام کی پابند نہ تھیں۔ ڈاکٹر مائیر کے یہاں کچھ
دنوں کام کرنے کے بعد وہ جرمنی سے چلی گئیں۔ چند سال ہسپانیہ میں گزارے اب شاید
جنوبی امریکہ میں ہیں۔ ماں باپ کو جو ذرا تسلی رہی وہ سب سے چھوٹی لڑکی کی ذات سے۔
انھوں نے ایک خوش حال تاجر سے شادی کی تھی، ان کا گھر بار تھا بچے تھے، اطمینان
سے زندگی بسر ہوتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ قسمت نے ان کے گھر کو بڑی بے دردی سے
اجاڑا۔ ان کی دولت لٹ گئی اور اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ آسٹریلیا میں ہیں۔ ان
کے بچے متحدہ ریاستوں میں دوسرے عزیزوں کے ساتھ۔ مس فلپس بورن کے ماں باپ
کے آخری دن بڑی مصیبت میں گزرے ان پر ایک طرف نازی حکومت کی مار پڑ رہی
تھی دوسری طرف اولاد سے جدائی کا صدمہ تھا۔

مس فلپس بورن اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور ہنرمند تھیں، ان کی طبیعت
میں ویسی ہی بے قراری تھی جیسی کہ بڑی بہن میں۔ لیکن ہنر کا سہارا ملنا بڑی بات ہے۔ انھیں
یقین تھا کہ جو کچھ کرنا چاہیں گی وہ کر سکیں گی۔ مہذب لوگوں میں ان کی قدر رہے گی انھوں

نے میونخ کے مشہور اسکول میں گانا سیکھا تھا۔ وہ اس فن کو جسے جرمنی میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے برتتی رہتیں تو خاصی مشہور ہو جاتیں۔ ان کی معقول آمدنی ہوتی اور وہ اپنی زندگی آرام سے گزارتیں لیکن اطمینان سے رہنا انھیں گوارا نہ تھا۔ شاید اسی لئے انھوں نے خاندانی زندگی کی پابندیاں قبول نہیں کیں، وہ ایسا کرتیں تو شاید ان جذبات کو جنھیں قدرت نے عورت کے حصے میں رکھا ہے معمولی طریقوں پر تسلی حاصل ہو جاتی لیکن معمولی طریقوں کو پسند نہ کرنے سے قدرت کا نظام نہیں بدل جاتا۔ دنیا کو مرد نے بنایا ہے تو اس کی پرورش عورت کی گود میں ہوئی ہے اور سچی عورت کو تسلی نصیب ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ نسوانیت کے عالمگیر منصوبے میں کسی نہ کسی طرح سے شریک نہ ہو۔ مس فلیس بورن کی حساس اور قدر شناس طبیعت پرورش اور پرداخت کے کسی ادنیٰ منصوبے کو عمر بھر کے لئے کافی نہیں سمجھ سکتی تھی انھوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کے رنج اور پریشانیاں، فکریں اور الجھنیں، امیدیں اور حوصلے اپنائے کیونکہ یہ لوگ ایسی ہمدردی کے مستحق معلوم ہوتے تھے اس سے کہیں بڑھ کر یہ بات تھی کہ ان کے دل میں پرورش کرنے کا جو جذبہ تھا وہ انھیں غیر شخصی مقاصد میں مصروف اور محو رکھ سکتا تھا اور یہ ایک خصوصیت تھی جس نے ان کی اعلیٰ طبیعت کو اعلیٰ تر بنا دیا۔ برلن میں لاوارث یہودی بچوں کے لئے ایک تربیت گاہ قائم کرنا تجویز ہوا مس فلیس بورن خوشی سے اچھل پڑیں اور ایک مدت اس تربیت گاہ کے سوا اور کسی چیز کا خیال ان کے دل میں نہ آیا۔ اس کے لئے انھوں نے چندہ جمع کیا۔ گھر گھر مانگ کر اس کے لئے ضروری سامان اکٹھا کیا اور سامان کو مزدوروں کی طرح برلن کی سڑکوں پر ٹھیلوں میں لے گئیں۔ تربیت گاہ کا کوئی سرپرست نہ تھا۔ مس فلیس بورن اس کی والی وارث بن گئیں۔ ہندوستان آتے ہوئے وہ چند مہینے فلسطین میں ٹھہری تھیں۔ یہاں کا سارا کام شروع سے شروع کیا جا رہا تھا۔ اور اس سے ان کو ایک لگاؤ ہو گیا جو جامعہ کی محبت کے باوجود قائم رہا۔ جامعہ کی بے سروسامانی

نے ان کی ہمت پست کرنے کی بجائے ان کے شوق کو دوبالا کردیا۔ وقت کے ساتھ جامعہ والوں کے حوصلے بڑھتے رہے، روپیہ ملتا رہا۔ عمارتیں بنیں لیکن بے سروسامانی کا احساس بھی پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہوتا گیا۔ مس فلپس بورن صفر سے عدد بناتی رہیں۔ ان کا سلیقہ ہماری مفلسی میں رونق پیدا کرتا رہا۔ جامعہ کی خدمت ان کی زندگی کا آخری منصوبہ تھا۔ اور اس میں وہ اس طرح لگ گئیں کہ اب کوئی ان کو اس سے الگ نہیں کرسکتا۔

مس فلپس بورن کو سب سے زیادہ مرغوب وہ کام تھے جو نئے ہوں، مشکل ہوں جنھیں کرنے والے کم ہوں مگر جو انسانیت یا اخلاق کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہوں۔ لوگ ایسے کاموں کی ذمہ داری لینے سے بچتے ہیں اس لئے کہ ان میں جان کھپانا پڑتی ہے اور ان سے روحانی تسکین کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مس فلپس بورن کے لئے ان کی سب سے بڑی کشش یہی تھی۔ یورپ میں ایسے بہت سے کام کئے جاسکتے ہیں اور کئے جاتے ہیں لیکن وہاں قومی مقاصد، افراد اور چھوٹی جماعتوں کے مقاصد پر اس طرح چھاگئے ہیں، زندگی کا دھارا اتنی تیزی سے بہتا ہے، افراد کی شخصیتیں، ریاست کی ہمہ گیر شخصیت میں اس طرح گم ہوگئی ہیں کہ جب تک قومیت کا جذبہ انھیں سہارا نہ دے اور تقویت نہ پہنچائے افراد اور چھوٹی جماعتیں سماجی خدمت کے کام کرنے کے لائق معلوم ہی نہیں ہوتے۔ ہم سب اپنے آپ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں آخر کیوں کرتے ہیں اور اگر ہم اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکیں تو ہمارا جی چھوٹ جاتا ہے۔ یورپ میں خدا کی خدمت کی نہیں جاسکتی کیونکہ وہ لوگ جو سماجی کاموں کو پرکھتے ہیں اور جن کی ہمت افزائی شوق کو بڑھاتی ہے خدا کو جانتے ہوں تب بھی مانتے نہیں۔ خلق کی خدمت کی جاسکتی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ خلق اپنی قوم ہی ہو۔ مس فلپس بورن یہودی تھیں۔ جرمن قوم ان کی قوم بن نہیں سکتی تھی، یہودیوں کو ایک قوم بنانا خدا کو منظور نہیں وہ کرتیں تو کیا کرتیں۔ اس سات سال کی مدت میں جو ہماری پہلی

ملاقات اور ان کے جامعہ آنے کے درمیان گزری۔ یورپی زندگی سے ان کا رشتہ کمزور ہوتا گیا۔ ان کا دل آزاد تھا کہ جہاں چاہتا اپنا ٹھکانا بنا سکتا تھا۔ جامعہ میں آکر وہ جامعہ کی ہوگئیں انھوں نے ہندوستان کو اپنا ملک مسلمانوں کو اپنی قوم اور رہتے ہوتے اسلام کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اس طرح جامعہ کو ایک بے لوث خادم مل گیا اور مس فلپس بورن کو اپنے حوصلے پورے کرنے کے لئے ایک دنیا جو نئی تھی اور ان کی اپنی تھی۔

مس فلپس بورن نے اپنے طریقے پر جامعہ کی خدمت اسی زمانہ میں شروع کر دی تھی جب کہ ہم لوگ برلن میں تھے انھیں ہمارے ہر کام سے اور ہر شوق سے دلچسپی تھی، ہماری ذات سے لگاؤ تھا جیسے کسی بہن کو ہو سکتا ہے جو دوست بھی ہو۔ اس وقت میرے کئی مشغلے تھے جنھیں یاد کر کے اب ہنسی آتی ہے لیکن ان کی وجہ سے مس فلپس بورن کو خیال ہوا کہ میں یورپی تہذیب کے لطیف پہلو سے واقف ہوں۔ ذاکر صاحب مجھ سے زیادہ ہی جانتے اور سمجھتے تھے لیکن وہ انجان بننا بھی جانتے تھے۔ وہ بدیہی باتوں کی تردید، پسندیدہ چیزوں کی مذمت، تہذیب اور فن کے مانے ہوئے اصولوں کی مخالفت بڑے دلچسپ انداز اور شاید تفریح کی خاطر کیا کرتے تھے اس لئے مس فلپس بورن نے ان کے مذاق کو تربیت دینا ضروری سمجھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئیں مگر اس کا انھیں یقین ہو گیا ہوگا کہ اگر وہ ہندوستان آئیں اور جامعہ کی خدمت کا بیڑا اٹھائیں تو تہذیب کی اعلیٰ قدریں ان کی نظر سے چھپ نہ جائیں گی۔ آدمیت کو فروغ آدمی سے ہوتا ہے، مقاصد کا اندازہ ان کے خادموں سے کیا جاتا ہے۔ مس فلپس بورن کو ہندوستان نہ کسی کی شخصیت ہی کھینچ کر لائی نہ محض ایک مقصد بلکہ شخصیت اور مقصد کی وہ ہم آہنگی اور مناسبت جو دل میں اعتماد پیدا کرتی ہے اور کامیابی کی امید۔ یہ تو مس فلپس بورن ہی جانتی ہوں گی کہ جرمنی سے انھوں نے ہندوستان آکر کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس کا مجھے یقین ہے کہ وہ کسی کام میں اور کام کرنے والوں کی کسی جماعت میں اس طرح کھپ نہیں سکتی تھیں

جیسے کہ جامعہ اور جامعہ کے خادموں میں۔
ہمارے اور ان کے درمیان کسی قسم کی غیریت یا بیگانگی کبھی تھی ہی نہیں۔ ہم انھیں کوئی آرام نہیں پہنچا سکے۔ ان کی رہائش میں جو انقلاب ان کے ماحول میں جو بنیادی تبدیلی ہوئی تھی اس کے صدمے کو ہم ہلکا نہیں کر سکے۔ ہماری اس کوتاہی کی شکایت انھوں نے کبھی کبھی کی مگر ان کا منشا کچھ اور ہوتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ تکلیف اٹھائے بغیر کام کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور انھیں کام پسند ہوتا تو اس کی خاطر تکلیف اٹھانے میں بھی مزا آتا تھا۔ اسی وجہ سے اگر کبھی جامعہ کے عام دستور کے خلاف انھیں آرام پہنچانے کی کوئی کوشش کی جاتی تو وہ اس پر ناراض ہوتی تھیں۔ انھوں نے ہماری زندگی کے آداب کو خوشی سے سیکھا اور قبول کیا اور ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ہمیں خلاف معمول یا نامناسب معلوم ہو۔ وہ جامعہ کی، جامعہ کے تمام ہمدردوں، اور سرپرستوں کی۔ بچوں اور بڑوں کی "آپا جان" بن گئیں۔ اس طرح کہ ان کے عورت ہونے کا احساس بالکل مٹ گیا اور اپنے سلیقے اور استعداد سے جو فائدہ وہ جامعہ کو پہنچا سکتی تھیں وہ پورا پورا حاصل ہوا۔
آپا جان کبھی بے فکر اور بے کار نہیں رہ سکتی تھیں، کام کے خیال کو اپنے دل سے نکال نہیں سکتی تھیں۔ محنت کرنے والے تھکتے ہیں اور تھکن کو دور کرنے کے لئے ستانا چاہتے ہیں آپا جان کو ستانا بھی گراں گزرتا۔ اگر کبھی ان کے سپرد کوئی ایسا کام نہ ہوتا جس میں وہ منہمک رہ سکیں تو وہ رنجیدہ اور پریشان ہو جاتیں۔ سمجھنے لگتیں کہ جامعہ کو ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر انھیں اتنے کام دے دئے جاتے کہ جنھیں معمولاً تین چار آدمی کرتے ہیں تو ان کی خوشی، چہرے کی رونق اور رفتار کی تیزی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ بیماری کے زمانے میں ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری طبیعت ہر کام سے تھوڑے دنوں میں ہٹ جاتی ہے، جی چاہتا ہے کہ کوئی اور، کوئی نیا کام شروع کروں۔ آپا جان

کی طبیعت میں استقلال نہیں تھا اور اس میں شک نہیں کہ پکا کام وہی ہوتا ہے جس میں شوق اور سلیقہ اور استقلال تینوں شریک ہوں لیکن آپا جان کا منصب یہ نہیں تھا کہ ایک دو کام پابندی سے کرتی رہیں۔ جامعہ جس دور سے گزر رہی ہے اس میں یہ مفید نہیں ہو کہ اس کے خادم اپنے مقررہ فرائض انجام دیتے رہیں اور نئی ضرورتوں اور مصلحتوں کا خیال نہ کریں، آپا جان ہر وقت نئے کاموں کے لئے بے قرار رہتی تھیں اور ان کی اس بے قراری کے سبب سے جامعہ کے کئی چھوٹے بڑے کام ہو گئے ہیں جن کے لئے قاعدے سے چلنے والے شاید فرصت ہی نہ نکال سکتے۔ آپا جان کی طبیعت میں صبر اور استقلال کی جو کمی تھی اس پر ان کے شوق کی شدت اور سلیقہ کی جمال آفرینی نے ایک خوش نما پردہ ڈال دیا، ہم ان کے کاموں کی خوبی کو دیکھتے رہے اس پر خوش ہوتے رہے کہ ان کی توجہ سے ایک ہی کام نہیں بہت سے کام خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں لیکن ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ آپا جان خود بڑی کشمکش میں رہتی ہیں انھیں ان کا شوق ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو یہ احساس کہ معمول کی پابندی کرنا چاہیئے دوسری طرف، ایک کام کو کرتے وقت انھیں دس اور کاموں کی فکر ستاتی رہتی، پھر بھی جتنے نمونے کے کام آپا جان نے کئے جامعہ میں اور کسی نے نہ کئے ہوں گے۔ ان کا اٹھنا اور بیٹھنا، کھانا اور پینا، ان کے دل کا اجالا، ان کی زندگی کا ماحصل ان کے یہی کام تھے انھوں نے جامعہ کی بستی اور اس کے کاروبار کو اپنے دل میں بسا لیا تھا، جیسے ماں اپنے بچے کو گود میں بٹھا لیتی ہے۔ اسے وہ بھول سکتی تھیں نہ چھوڑ سکتی تھیں جو کچھ وہ کرتیں اسی کے لئے کرتیں۔ جامعہ کے کام بہت تھے آپا جان کو جامعہ سے محبت بہت تھی وہ کاموں کا انتخاب نہیں کر سکیں ان کو ترتیب نہیں دے سکیں اس کے لئے جو ذرا سی بے تعلقی ضروری ہے اسے بھی ان کی طبیعت گوارا نہ کر سکی۔

کاروبار بڑے سے بڑا ہو سکتا ہے مگر آدمی کے دل کو اس سے بھی بڑا ہونا چاہیئے

جامعہ کو سب کچھ دے دینے کے بعد بھی آپا جان کے دل میں بہت جگہ رہ گئی۔ اپنے اور کاموں کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کی سرپرستی اور مدد کرنے کے موقعے تلاش کرتی رہیں۔ لاوارث یہودی مردوں اور عورتوں کے خط آخر تک ان کے پاس آتے رہے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان تمام یہودیوں کو جو جرمنی سے بھاگ کر آتے تھے۔ جانتی ہیں اور اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتی ہیں کہ جس کا ٹھکانا نہ ہو اسے ٹھکانے سے لگائیں جامعہ میں عورتوں اور بچوں کا علاج اور تیمارداری ان کے نزدیک ان کا خاص فرض تھا۔ اور انھیں بڑا دکھ ہوتا اگر ان کی مصروفیتوں کی وجہ سے کوئی بیمار ان کی توجہ سے محروم رہتا۔ اور تمام معاملات میں بھی ان کی انسانی ہمدردی ہر وقت مشورے اور مدد اور خدمت کے لئے حاضر رہتی۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرتی تھیں کہ کوئی ان سے مشورہ لے یا مدد مانگے۔ خود ہی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کو پہنچ جاتیں۔ ہندوستانی عورتیں تیمارداری اور بچوں کی تربیت کے متعلق بہت سی باتیں نہیں جانتی ہیں، آپا جان کو اس کی وجہ سے بڑی فکر رہتی اور وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح بھی ہو سکے دوسری عورتوں کو جلدی سے وہ سب کچھ، سکھا دیں جو خود انھیں آتا ہے انھیں اس کی بھی بڑی آرزو تھی کہ مسلمان عورتوں میں کام کرنے کا سلیقہ اور خدمت کا شوق عام ہو جائے۔ ان کی ہمدردی اور محبت جہاں تک بیداری پھیلا سکتی تھی پھیلاتی رہی۔

عورتوں ہی کے لئے نہیں مردوں کے لئے بھی آپا جان ایک مثال تھیں۔ کام کی دشواریاں ان کے جوش کو کبھی ٹھنڈا نہ کر سکیں۔ جامعہ کی بے مائگی سے ان کے حوصلے کبھی پست نہیں ہوئے۔ اپنے ساتھیوں کے شوق اور ان کی استعداد پر انھیں ہمیشہ اعتبار رہا۔ ایسا اعتبار دوسروں میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور بارہا ایسا ہوا کہ آپا جان کی ہمت افزائی نے وہ کام کرا دیئے۔ جن کے انجام پا سکنے کی کسی کو امید نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں جیسے یہ نہ آتا تھا کہ کام کے ہوتے ہوئے لوگ مطمئن کیسے رہ سکتے ہیں۔

دیسے ہی وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ وہ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ امید تو امید کہلانے کی مستحق تب ہی ہوتی ہے جب وہ قرائن اور استدلال کی پروا نہ کرے، یاس شرپی کی منطق کو اپنے اندر سے اسی طرح گزر جانے دے جیسے کوئی مضبوط درخت گرم ہوا کے جھونکے کو۔ آپا جان کو جامعہ ہمیشہ پھولتی پھلتی، آسمان کی طرف بڑھتی، زمین پر اپنا سایہ پھیلاتی نظر آئی اور انھیں یقین تھا کہ اس کے خلاف کسی کو کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ نظر کا فریب ہے، آپا جان کو سمجھنا اور قائل کرنا آسان نہ تھا۔ آخر میں ہم ہی کو ماننا پڑتا کہ ہمارے اندیشے غلط ہیں مایوسی بے بنیاد۔ آپا جان کے دل میں امیدوں کی جو روشنی تھی وہ ہماری آنکھوں کا نور بن جاتی۔

بیماری کی بے بسی انسان کا بڑا سخت امتحان لیتی ہے بیمار کا کوئی فرض نہیں ہوتا حق ہی ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ حق لے پورا پورا لے۔ آپا جان کو اصرار تھا کہ انھیں کم سے کم دبا جائے۔ انھیں برابر اس کی فکر رہتی تھی کہ ان کی وجہ سے جامعہ کے کسی کام کا ہرج نہ ہو۔ آپریشن کے بعد کچھ دن ان کی طبیعت اچھی رہی۔ لوگ ان سے ملنے جاتے تھے تو جامعہ ہی کا ذکر رہتا تھا۔ ان کی حالت بگڑ گئی تب بھی جو دو چار جملے بول سکتی تھیں وہ جامعہ کی نذر ہوتے تھے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو ان کی سانس اکھڑ چکی تھی انھیں دیکھنے کے لئے معمول سے زیادہ لوگ چلے گئے۔ کئی گھنٹے بعد انھیں ذرا سا ہوش آیا اور انھوں نے چار پانچ لوگوں کو پلنگ کے گرد کھڑا پایا تو کہا "آج جامعہ میں جلسہ نہ ہوگا آپ سب یہاں آ گئے ہیں" ہم نے انھیں یقین دلایا کہ "قومی ہفتہ" کا جلسہ ایک دن پہلے ہو چکا ہے تو انھیں اطمینان ہو گیا اور انھوں نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جامعہ کی فکر کے ساتھ انھیں آخر وقت تک آس پاس کے لوگوں کا بھی خیال تھا۔ ہسپتال کے جس مریض کو ضرورت ہوتی اس کے پاس وہ اپنی دوا اور غذا، اور نرس کو ضد کر کے بھیجتیں، مریضوں کا حال دریافت کرتی رہتیں ان کی تکلیف کو اپنا دکھ درد

بتاتی تھیں۔ انتقال سے ایک دن پہلے جب ان کی طبیعت ذرا دیر کے لئے سنبھلی تو انھوں نے ایک بچے کو جو قریب کے وارڈ میں رہتا تھا، روتے سُنا۔ انھوں نے فوراً نرس کو بھیج کر اپنے پاس بلوایا، بسکٹ کھلائے، پیار کیا اپنے پاس لٹایا اور تھپک کر سلا دیا۔ یہ ان کی محبت کا آخری کرشمہ ان کی نسوانیت کا معراج تھا۔

یہ سب کچھ میں نے دیکھا یا سُنا ہے اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہ کہنا چاہیے۔ ڈرتا ہوں کہیں بے ادبی نہ ہو جائے مگر دل نہیں مانتا۔ آپا جان، جامعہ کو ایک بہت بڑے احسان سے شرمندہ کر کے گئی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے جو بارہ سال ہمارے ساتھ گزارے۔ ان میں وہ برابر تکلیف اٹھاتی رہیں اور آخر وقت میں بھی وہ جامعہ کی خاطر ایک ایسے حق سے دستبردار ہو گئیں جس کو وہ اپنا حق سمجھتی تھیں۔ انھوں نے دل کی تنہائی قبول کی، عشق کو صبر کا کڑوا گھونٹ پلایا وعدہ کو امید، امید کو حسرت، حسرت کو موت بن جانے دیا اور کہتی رہیں کہ یہی مناسب ہے ان کی قربانی بار آور ہوئی، ان کی سانس اکھڑی تو جامعہ والوں کو مبارکباد دے کر اکھڑی، بس اور کچھ نہ کہوں گا یہ وہ مقام ہے کہ جہاں مجھے قدم رکھنے کی تاب نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جامعہ والوں میں سے دو ایک بھی اس مقام تک پہنچ جائیں تو ہماری خدمت خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لائق ہو جائے گی۔

(پروفیسر محمد مجیب)

چودھری اکبر علی مرحوم

موت کسی عمر میں آئے اور ہم سے بے تعلق سے بے تعلق آدمی کو آئے۔ کسی کے مرجانے کا سن کر ہمارے دل کو ایک بار تو ضرور دھکا لگتا ہے اور ہماری نظروں میں خود اپنی زندگی بلکہ ساری کی ساری دنیا تاریک دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن جب موت کسی ایسی زندگی کو ختم کرے۔ جس کے زندہ رہنے پر صرف اس کے خاندان اور مخلوص احباب کی زندگی کا دارومدار نہ ہو بلکہ اس کے دم سے جماعت کے بیسیوں کام چلتے ہوں اس کے حسن اخلاق کا سکہ ہر دل پر نقش ہو۔ اس کے علم سے طالبان علم اپنی تشنگی بجھائیں۔ اس کی فرزانگی اور تدبیر سب کے کام آئے۔ وہ جس مجلس میں بیٹھے ہر شخص یہی چاہے کہ وہ وہاں سے کبھی نہ اُٹھے۔ وہ جب باتیں کرے تو سب کے دلوں کی کلیاں کھل جائیں۔ اس کی صحت و تنومندی ضرب المثل ہو۔ علم و حکمت کی صحبتوں میں وہ پیش پیش نظر آئے۔ شعرو نغمہ کا باب کھلے۔ تو سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں۔ تدبیر امور اور نظم و نسق کا سوال آئے تو اس کی رائے کا ہر ایک کو خیال ہو۔ ورزش اور کسرت کے مقابلے ہوں تو وہ سب میں آگے ہو۔ تیراکی کے معرکوں میں اس کا نمبر سب سے اوپر ہو۔ الغرض ہر کام میں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہو اور ہر جگہ اس کی غیر حاضری لوگوں کو کھلکے۔ وہ اپنے آپ سے زیادہ اوروں کے لئے جئے۔ اور یہ اور چند گنتی کے لوگ نہ ہوں بلکہ اس کے سارے جاننے والے ہوں۔ ایسے ہمہ گیر صاحب دل و دماغ انسان کی موت کے صدمے سے جنے سن کر بیگانوں کے سانس رُک جاتے ہیں۔ اس کے

جاننے والوں اس کے ساتھیوں، اس کے احباب، اس کے بزرگوں اور اس کے بوڑھے ماں باپ، جوان بھائی اور نئی بیاہتا بیوی پر کیا گزری ہوگی، اس کے تصور سے روح کانپ جاتی ہے۔ اس صدمہ کی المناکی اس خیال سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اکبر صاحب ابھی ابھی زندگی کے اس مقام پر پہنچے تھے۔ جہاں دل اور دماغ کی صلاحیتیں اپنے پورے عروج پر ہوتی ہیں۔

خدا کے فضل سے اکبر صاحب کی صحت ہزاروں کے لئے قابل رشک تھی۔ وہ محض کتابوں کے شیدا نہ تھے بلکہ کسرت کا بھی انھیں غیر معمولی شوق تھا۔ ان کے قوئے اتنے مضبوط تھے کہ ناواقف دیکھتا تو انھیں پہلوان سمجھتا۔ صحت کا ان کو اس قدر خیال تھا کہ کھانے پینے اور دوسرے معمولات میں حد درجہ احتیاط برتتے۔ ان کا علمی مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے جسم کی بھی خوب نگہداشت رکھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس عمر میں جب کہ انھوں نے تعلیم اور تعلیم کے بعد ابتدائی تجربوں سے فارغ ہو کر عملی زندگی کے ایک وسیع دائرہ میں قدم رکھا تھا۔ ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ اور وہ سخت سے سخت کام کرنے کی پوری استعداد رکھتے تھے۔ برسوں کے مطالعہ اور تربیت کے بعد خدا نے ریاست رام پور میں ان کو کام کرنے کا ایک بڑا اچھا موقع عنایت فرمایا۔ ان کے سامنے ایک وسیع میدان عمل تھا۔ دل میں بڑے بڑے ولولے تھے۔ دماغ میں منجھی ہوئی عقل اور تجربوں پر کسی ہوئی سمجھ کی فراوانی تھی بازوؤں میں طاقت تھی۔ ان کی صحت کا تو کیا کہنا۔ اس بھرپور جوانی میں جبکہ اکبر صاحب کی ہر صلاحیت اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ موت نے ان کے فیوض سے ان کے ساتھیوں جامعہ کی برادری اور ریاست رام پور کو ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔ جن لوگوں کو اکبر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے یا جن بزرگوں کے ساتھ اکبر صاحب نے کام کیا ہے یا ان کے وہ احباب جو ان کی دلی امنگوں اور آرزوؤں کو جانتے ہیں، وہی اس بات

کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی بے وقت موت نے جامعہ اور رام پور کی زندگی میں کتنا بڑا رخنہ پیدا کر دیا ہے جس کا بھرنا شاید ہی ممکن ہو۔

اکبر صاحب جامعہ سے بی اے کرکے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے آپ نیویارک گئے اور کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کی۔ امریکہ کے دوران قیام میں آپ کو ۱۹۳۰ء تک نیویارک کے سب سے بڑے ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں کہیں گھوڑے سے گرا تھا اس وقت تو کچھ محسوس نہ ہوا، لیکن بعد میں اس چوٹ نے ناسور کی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ نیویارک میں ۱۹۳۱ء تک اس کی وجہ سے موت سے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ قسمت اچھی تھی۔ کہ وہاں کے ڈاکٹروں کے لاعلاج بتلانے کے باوجود بچ گئے۔ اور دیار غیر میں موت نہ آئی اس بیماری نے گو پیٹ کی جلد کو چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔ لیکن صحت کے بحال ہوتے ہی اکبر صاحب پھر پہلے کی طرح تنومند اور مضبوط ہوگئے۔

امریکہ سے لوٹے تو اپنی مادر علمی کی خدمت میں لگ گئے۔ چنانچہ جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کی نگرانی آپ کے سپرد کی گئی۔ ایک برس کے بعد مدرسہ ابتدائی قرول باغ کو دریائے جمنا کے کنارے جامعہ نگر کی نئی عمارتوں میں منتقل ہوا تو اکبر صاحب جامعہ نگر اپنے مدرسے کو لے کر یوں پہنچے جیسے کوئی ملاح سمندر کے طوفان کا مارا ہوا کسی جزیرے میں جا نکلے۔ اور وہاں اسے از سر نو زندگی کی تعمیر کرنی پڑے۔ مدرسہ ابتدائی کی عمارت ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہیں کہیں چھتیں چڑھ رہی تھیں کواڑ تو شاید ایک بھی نہ لگا تھا، اتفاق سے اس سال بارش بھی زیادہ ہوئی۔ اور پھر ارد گرد چاروں طرف جنگل تھا اور آس پاس کے لوگ نئے آنے والوں سے بالکل نامانوس تھے۔ عمارت ناکافی، بارش حد سے زیادہ ملیریا پھیلا، اور خوب پھیلا، چھوٹی عمر کے بچے، عمارت کے ذرا باہر جائیں تو سانپوں کے غول رینگتے نظر آئیں اس پر ہر وقت چوروں کا خطرہ، اور سب سے بڑی بات یہ

تھی کہ جامعہ کی مالی حالت سقیم۔ اتنے دام کہاں کہ ضرورت کا سارا سامان ایک دم مہیا کیا
جاتے۔ استادوں کو کبھی کبھی ماہ تک پیسے کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ اس لیے بے سروسامانی
کے باوجود اور ان برے حالوں میں بھی یہ وحشت زا فضا اکبر صاحب کے دم سے مسرت
زار بنی ہوئی تھی۔ اساتذہ اتنے خوش و خرم نظر آتے کہ قرول باغ والے ان کے ساتھی ان
پر رشک کرتے۔ چھوٹے بچے جامعہ نگر کی زندگی کے شوق میں گھروں کو بھول جاتے۔ جنگل
سیر و تفریح، تیراکی اور کھیلوں کے آئے دن کے مقابلے اس جنگل کو یہاں کے رہنے والوں
کے لیے پر رونق آبادیوں سے زیادہ دل کش بنا رہے تھے۔ اکبر صاحب نے جامعہ نگر میں
صرف مدرسہ کی زندگی کو بہتر نہ بنایا بلکہ انھوں نے آس پاس کے دیہات میں جو چودھری
تھے، ان سے تعلقات استوار کیے، وہ ان کی غمی خوشی میں جاتے۔ ان کی شادیوں میں
شریک ہوتے اور نیوتے ڈالتے۔ اکبر صاحب کو اس زمانے میں جب کوئی چھوٹے بچوں
کے ساتھ کھیلتا دیکھتا تو وہ انھیں بھی ایک بچہ سمجھتا۔ بچے ان سے اتنے مانوس تھے، کہ شاید
وہ اپنے والدین سے بھی نہ ہوں۔ وہ ان کی انگلیاں پکڑ لیتے ان کے کندھوں پر سوار
ہو جاتے۔ کوئی شکایت ہوتی تو سیدھے ان کے پاس پہنچتے۔ دن ہو یا رات کوئی وقت
ایسا نہ تھا کہ کسی بچہ کو کوئی ضرورت پڑے، اور اکبر صاحب وہاں موجود نہ ہوں۔ اساتذہ
کی مجلس میں اکبر صاحب ایک بے تکلف دوست کی حیثیت میں چھپ جاتے نظر آتے۔ وہ مدرسہ
کے صرف ہیڈ ماسٹر نہ تھے بلکہ وہ ہر استاد کے دلی دوست، ہر مشورہ میں اساتذہ کے
شریک اور ہر کام میں ان کے ہمدرد تھے۔ وہ تعلیمی معاملات میں ان کی رہنمائی کرتے۔ علمی
گفتگوؤں میں اکبر صاحب سے استفادہ کیا جاتا نجی امور میں ان سے رائے لی جاتی۔ یہاں
تک کہ کپڑوں، کتابوں اور عام زندگی کے معاملات میں ہر شخص اکبر صاحب سے استصواب
کرنا ضروری سمجھتا اور پھر اکبر صاحب جامعہ نگر کے قرب و جوار کے دیہات کے چودھریوں
میں بیٹھے یوں معلوم ہوتے کہ گویا وہ بھی ان میں کے ایک چودھری ہیں۔ چونکہ دیہات

کی زندگی کے ہر شعبے کو جانتے تھے۔ اس لئے وہ آسانی سے دیہات والوں سے گھل مل جاتے۔ اور سب ان کو اپنا سمجھنے لگتے، اور ان کی ہر بات کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتے۔

اکبر صاحب پورے پانچ برس تک مدرسہ ابتدائی کے نگراں رہے۔ اس زمانے میں مدرسہ ابتدائی کی شہرت ہندوستان کے ہر کونے میں پھیل گئی۔ چنانچہ ہر نئے سال کے شروع میں داخل ہونے والے طلبہ کی اتنی درخواستیں آتیں۔ کہ ان میں سے اکثر کو مسترد کرنا پڑتا۔ اکبر صاحب کو یہ مدرسہ اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں سب لوگ گھروں کو چلے جاتے لیکن اکبر صاحب بدستور جامعہ نگر ہی میں مقیم رہتے۔ اور فرصت کے ان اوقات کو وہ جس طرح صرف کرتے تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کو یہ مدرسہ کس قدر عزیز تھا۔ صبح ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرتے اور پھر فقیرا مالی کو پھاوڑوں کے لئے پکار پڑتی۔ فقیرا اپنے ساتھی مالیوں کو لے کر آ جاتا۔ اِدھر اکبر صاحب نیکر پہن کر نکل آتے اور کھدائی کا کام شروع ہو جاتا۔ اکبر صاحب کو یہ فکر ہوتی تھی کہ برسات سے پہلے پہلے باڑ کے لئے نالیاں کھد جائیں تاکہ اگست میں مدرسہ کھلے تو نئی باڑیں مدرسہ کی زینت کے لئے اگ کر تیار ہوں۔ انھیں اس کام میں اتنی جلدی ہوتی تھی کہ اگر اتفاق سے ان کا کوئی دوست آ جاتا تو وہ اس کے ہاتھ میں بھی ایک پھاوڑا دے دیتے۔ اور جب تک دھوپ کافی تیز نہ ہو جاتی، بڑے انہماک سے اس کام میں لگے رہتے۔

اکبر صاحب بڑی دلچسپی اور خوش اسلوبی سے مدرسہ ابتدائی کے کام کو چلا رہے تھے کہ ریاست رام پور کی طرف سے شیخ الجامعہ سے درخواست کی گئی کہ وہ جامعہ میں سے کسی ایسے صاحب کو مستعار دیں جو ریاست کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ یہ کام غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا۔ ریاست میں کئی پرائمری اسکول تھے۔ بہت سے مڈل اسکول بھی تھے۔ دو تین ہائی اسکول تھے اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ اکبر صاحب

شعبہ تعلیم کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ اور تعلیم کے متعلق تمام کاموں کی نگرانی آپ کے سپرد ہوئی
اکبر صاحب نے یہ کام جس عمدگی سے کیا، اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ بدقسمتی
سے مرحوم کو موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ جو کچھ وہ کرنے کا عزم رکھتے تھے اس کو تمام کر
پاتے۔ لیکن اس قلیل مدت میں بھی ہر شخص آپ کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ مرحوم کے
ساتھی تو ان کی خوبیوں کے معترف تھے ہی چنانچہ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ آپس کی
ملاقاتوں میں ناغہ ہو جائے۔ ان کے علاوہ مرحوم کے بڑے بھی دل سے ان کی عزت
کرتے اور ان کو اپنا ایک عزیز سمجھتے۔ اور ان کی رائے اور سمجھ پر پورا بھروسہ کرتے تھے
لیکن سب سے زیادہ جن لوگوں کے دلوں میں مرحوم نے گھر کیا تھا وہ ان کے ساتھ
کام کرنے والے کالج اور اسکولوں کے اساتذہ تھے۔ اکبر صاحب خود استاد رہ چکے تھے
اور وہ ہمیشہ بڑی سے بڑی مجلس میں نہایت فخر سے یہ کہا کرتے کہ میں جامعہ کے پرائمری
مدرسہ کا استاد ہوں۔ اس لئے وہ اپنے ماتحت استادوں سے بڑی محبت اور دل سوزی
سے پیش آتے، اور ان کی سنتے اور نہایت عمدہ طریقہ سے ان سے اپنی کہتے ریاست رام پور
کے چھوٹے سے چھوٹے اور دور افتادہ مدرسہ کے کسی استاد سے پوچھئے وہ سکرٹری صاحب
کا مداح نظر آئے گا ممکن ہے ایک بار ہی اس مدرس کو سکرٹری صاحب سے ملنے کا اتفاق
ہوا ہو لیکن ایک ملاقات میں جس خوش دلی، بے تکلفی اور مسکراہٹ سے انھوں نے بات
کی ہو گی اس کا اثر مدرس پر اس قدر اچھا پڑا ہو گا کہ وہ انھیں اپنا ہمدرد دوست سمجھنے
لگ گیا ہو گا۔ اور ساری عمر ان کو دعائیں دیتا رہے گا۔

اکبر صاحب رام پور میں تھے صحت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی۔ انہی دنوں چیف
منسٹر صاحب نے انھیں دہلی بھیجا کہ ریاست کی ایک سرکاری عمارت کی تعمیر کے سلسلہ میں
ایک مشہور (ARCHITECT) سے مشورہ کریں اس سے مل کر وہ باہر نکلے تو
اِدھر اُدھر کہیں ٹیکسی نظر نہ آئی۔ آپ نے ایک تانگہ لیا۔ اور کناٹ پلیس (نئی دہلی) سے

چل دئے۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ کوچبان نے گھوڑے کو مارنے کے لئے چابک بڑے زور سے گھمایا۔ مرحوم تانگہ کی اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے چابک بجائے گھوڑے کے لگنے کے آپ کے ماتھے پر لگا اور آپ تقریباً بیہوش سے ہو گئے۔ کوچبان نے پوری قوت سے چابک کو حرکت دی تھی چنانچہ چابک کے تسمے مرحوم کی آنکھ اور ماتھے کو چھیلتے نکل گئے اس وقت مرحوم کو بڑی مشکل سے سنبھالا گیا۔ اس چوٹ کے بعد چند دنوں تک آنکھ میں سخت درد رہا۔ لیکن سینکنے سے افاقہ ہو گیا اور چابک کی چوٹ کا ان کو خیال نہ رہا۔ دو تین ماہ بعد یک لخت ان کے ماتھے میں درد اٹھا اور انھوں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی بینائی بھی کم ہو رہی ہے وہ اسے معمولی آشوب چشم سمجھے اور آنکھوں کا معائنہ کروا کے عینک لے لی لیکن گاہے ماہے ماتھے میں برابر درد کی ٹیسیں اٹھتی رہیں اور بصارت اتنی کم ہو گئی کہ قریب کی چیز بھی مشکل ہی سے نظر آتی۔ پہلے رام پور علاج ہوا۔ پھر مرحوم دہلی آئے۔ دہلی سے مدراس گئے آخر ایکس رے EXRAY سے یہ پتہ چلا کہ دماغ میں ٹیومر (پھوڑا) ہے اس سلسلے میں سارے جتن کئے گئے۔ اور ہر طریقہ علاج آزمایا گیا۔ مرحوم مسلسل ایک برس تک بڑے صبر و رضا سے درد کی ناقابل برداشت تکلیف کو جھیلتے رہے، نظر بالکل جا چکی تھی۔ جب درد کا دورہ پڑتا تھا تو جب تک برداشت کی سکت رہتی، برداشت کرتے رہتے اور آخر جب یارائے ضبط نہ رہتا تو بے ہوش ہو جاتے جس طرح زندہ دلی۔ خوش مزاجی، قہقہوں اور ہنسی خوشی میں انھوں نے زندگی کے دن گزارے تھے۔ اسی طرح جب اس موذی اور جان لیوا اذیت کی مرحوم پر افتاد پڑی تو اس کرب اور مصیبت میں بھی ان کی طبعی زندہ دلی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور وہ بڑی ہمت اور دلاوری سے ہر دکھ کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔

بیماری کے آخری دنوں میں مرحوم کی بصارت بالکل جا چکی تھی۔ تنومند جسم مضمحل ہو گیا تھا۔ درد کی ٹیسیں بھی برابر اٹھتی رہتی تھیں۔ لیکن جب کبھی ذرا سا سکون ہوتا اور

کوئی دوست تیمارداری کو آنکلتا تو پھر لطیف گفتگو شروع ہو جاتی۔ بیماری کے زمانے میں جن جن مصیبتوں سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ مرحوم نے نہایت موثر اور دل کش اشعار میں ان کا نقشہ کھینچا تھا۔ باتیں کرنے تو یوں معلوم ہوتا کہ کوئی تکلیف ہی نہیں۔ گھنٹوں اپنے حافظہ سے علم و حکمت کے انمول موتی جو برسوں کے مطالعہ سے فراہم کئے ہوئے تھے سناتے بیماری کے اس تمام زمانے میں جس کی تکلیفوں کی دیکھنے والے بھی تاب نہ لا سکتے تھے مرحوم نے کبھی اپنی زبان سے ایک کلمہ شکایت بھی نہیں نکالا۔ آپ اکثر فرماتے کہ مجھے قدرت سے کسی بات کا کوئی شکوہ نہیں۔ اس نے مجھے بہت کچھ دیا اور بہت زیادہ فراخی سے دیا۔ والدین کی محبت دی، دوستوں کا اعتماد دیا، علم کی نعمت عطا فرمائی۔ جب تک تندرست رہا۔ بھرپور صحت دی۔ اس نے دیا اور وافر دیا۔ اب مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں، میں اس کی رضا پر راضی ہوں۔

بیماری کے ان ہولناک ایام میں جو کچھ وہ فرمایا کرتے تھے۔ اگر کبھی فرصت ملی، تو اس کے لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ بے شک وہ اس دنیا سے رضائے الٰہی پر راضی ہو گئے۔ اور ہم مجبوروں کی کیا مجال کہ اس کی رضا میں دخل انداز ہوں لیکن اکبر صاحب کی موت ایسا حادثہ نہیں کہ ان کے جاننے والے اسے بھول جائیں۔ اکبر آج ہم میں نہیں لیکن ان کی یاد دلوں سے کبھی محو نہ ہو گی۔ وہ ہمیشہ یاد رہنے والی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے مرنے سے وہ خوبیاں مر نہیں سکتیں۔ جامعہ کی برادری اور ان کے رام پور کے ساتھی مرحوم کو کبھی بھلا نہیں سکیں گے۔

عربی زبان کی مشہور شاعرہ خنساء جو ساری عمر اپنے جواں مرگ بھائی صخر کا نوحہ کرتی رہی، مرحوم بھائی کے متعلق ایک شعر میں کہتی ہے "آفتاب مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو وہ مجھے صخر کی یاد دلاتا ہے (کیوں کہ وہ صبح میدان کارزار میں شجاعت کے جوہر دکھانے کا عادی تھا) اور جب سورج مغرب میں ڈوبتا ہے تو مجھے صخر یاد آتا ہے (شام کو وہ

مہمان نوازی کے فرائض ادا کرتا تھا) خنساء کو تو صرف صبح اور شام کو صخر یاد آتا تھا۔ لیکن اکبر کے دوست، اس کے بھائی، اور اس کے ساتھی جب تک وہ زندہ ہیں ہر محفل میں اور ہر دلچسپی کے موقع پر اس کو یاد کرتے رہیں گے۔ کیونکہ شعر و نغمہ کی کوئی مجلس ہوتی تھی تو اکبر اپنے دل سوز نغمہ اور پُر کیف اشعار سے سب کو محظوظ کرتا تھا۔ علم و حکمت کا موضوع ہوتا تو اکبر اس میں اپنے کمالات علمی دکھاتا۔ اور جسمانی مجلس اور کسرت کی سرگرمیوں میں شریک ہوتا، تو سب سے اپنے جوہر کا خراج تحسین حاصل کرتا وہ ہر محفل کی جان تھا احباب کی صحبتیں اس کے دم سے زندہ تھیں وہ مر گیا۔ زندہ دلی، علم، حقیقت رس نگاہ اور ایک لفظ میں زندگی ہمارے ہاں سے رخصت ہو گئی۔

(محمد سرور)

چودھری اکبر علی مرحوم

آہ سعد

راستے میں کوئی ساتھی چھوٹ جاتا ہے یا الگ ہو جاتا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ جب وہ ملے گا تو اس سے لڑیں گے اور جو پریشانی ہم نے اٹھائی ہے اسکا پورا بدلہ لیں گے جسے موت جدا کردے اس سے کس منہ سے شکایت کیجئے؟ اور ہمارے سعد صاحب کو تو کوئی تکلیف، کوئی دنیاوی امید جامعہ سے جدا نہ کر سکتی تھی۔ زندگی کے آخری دور میں بھی انھوں نے جامعہ واپس آنے کا سامان کیا تھا۔ تقدیر انھیں کہیں اور لے گئی اور ہم انتظار کرتے ہی رہ گئے۔ اب بھی نظر انھیں ہر طرف تلاش کرتی ہے اور یہ خیال دل سے نہیں نکلتا کہ ہم پکاریں اور بلائیں تو وہ پھر آجائیں گے، پھر ہمارا اور ان کا رنج اور خوشی، کام اور آرام میں ساتھ ہوگا جامعہ کی زندگی نے جامعہ والوں کو ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ، ایک خاص فضا اور کیفیت کا ایسا عادی بنا دیا ہے کہ اگر کوئی بھی چلا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اجتماعی جسم کا ایک حصہ کاٹ دیا گیا ہے۔ جب کسی کی وابستگی ایسی ہو جیسی کہ مرحوم کی تھی اور جوش کی شدت دل کی صفائی، طبیعت کی سادگی انوکھے پھولوں کی طرح کھلتی رہتی ہو تو جدائی دل کے باغ کو بے رونق کردیتی ہے اور نظر مایوس، دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ خدا کی مشیت نے پچیس برس کے بعد ہم سے ایک ساتھی کو چھڑا دیا ہے جسے محبت اکثر بے قرار کردیتی تھی۔ جس کا دل ہمارے دلوں سے کہیں زیادہ حساس تھا۔ جس کا استقلال اور ایثار جامعہ کی استقامت کے اسرار میں سے تھا۔ اس جدائی کا صدمہ اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمیں اپنے ساتھی کی خدمت کرنے کا کوئی موقع نہیں نصیب ہوا! ہم صرف مرحوم کے اس عظیم الشان انکسار پر حیرت کرتے رہ گئے کہ انھوں نے جدائی کو بھی ایک ہنگامہ اور دوسروں کے لئے زحمت جانا۔ اور دنیا سے اس طرح رخصت ہوئے کہ

گویا ابھی کہیں جانا ہی نہیں تھا۔

جامعہ والوں کے منصوبے ان کی زندگی، ان کی جان ہیں۔ ان منصوبوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی تکمیل ایک شخص کی مدت عمر میں ہو سکے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جتنا بڑا کسی کا منصوبہ ہو اتنی ہی لمبی اس کی عمر ہوگی اور وہ اس وقت بھی زندہ رہے گا جب اس کا جسم خاکی خاک بن جائے گا اور اس کے مادی وجود کے کوئی آثار نہ رہیں گے۔ ہمارے مرحوم ساتھی کے جو سب سے عزیز منصوبے تھے ان کا تعلق کسی ادارے اور کسی زمانے سے نہیں تھا۔ وہ نوع انسانی کے دائمی منصوبوں میں سے تھے اور ان کے مقابلے میں ہمارے سارے کام ضمنی اور وقتی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس حقیقت کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھیں۔

خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اتنا صبر دے کہ اپنے رفیق کی جدائی کے صدمے برداشت کریں اور اتنی توفیق دے کہ اپنی زندگی کو خلوص، صداقت اور عبادت کا ویسا ہی نمونہ بنائیں جیسا کہ ہمارے مرحوم ساتھی نے بنانا چاہا تھا۔

پروفیسر محمد مجیب

مولانا سعد الدین انصاری

زندگی میں شخصیت گر افراد تو کبھی کبھار ہی ملتے ہیں معمولاً لوگ خود اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے اپنے گرد ایک حلقہ سا بنا لیتے ہیں۔ اس حلقے میں شخصیت تو بس ایک ہی کی بنتی ہے اور باقی سب اس کے حوالی ہوتے ہیں ایسی غیر معمولی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں اور صدیوں کے انتظار کے بعد پیدا ہوتی ہیں جن کی بدولت قومی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ جو زندگی کے دھارے کو بدل کر نئی راہوں پر لے آتی ہیں۔ بھلا ایک اچھی سماج کے خواہش مند ان گنت افراد اس گنی چنی اور آدمی کی پہنچ سے اونچی۔ اوتار اور اقطاب جیسی ہستیوں کے بھروسے پر کب تک بیٹھے رہ سکتے ہیں کہ وہ آکر ایک نئی سماج کی طرح ڈالیں۔

اچھی سماج کے جنم اور بقا کے لئے تو رواں دواں زندگی میں ایسے عام اور بہت سے نمونوں کی ضرورت پڑتی ہے جو زندگی کی عام معتدل سطح کو نہ تو اتنا گھٹائیں کہ زمین میں پیوست ہو جائے اور نہ اتنا چڑھائیں کہ یہ آسمان کی زینت بن کر رہ جائے۔ زندگی کے چشمے رسنے بند ہو جائیں تو سماج کی کھیتی مرجھا جائے اور اگر ابل پڑیں تو یہ کھیتی سیلاب میں بہہ جائے یا گل سڑ کر رہ جائے اصل چیز یہ ہے کہ اچھی سماج کی زندگی میں ایک ہم آہنگ نغمے کی سی روانی پیدا کی جائے اور یہی آسان سی بات ہے جس کے لئے زندگی کو کیسی کیسی مشکلوں اور کیسے کیسے جھمیلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر بھی یہ ہموار سطح پر نہیں پہنچتی۔

اس آسان اور اچھی زندگی کی تعمیر کے نئے یوں تو ہمیشہ مفکروں کے ذہن میں نئے نئے نقشے بنا کرتے ہیں مگر ان خیالی نقشوں کو حقیقت کا جامہ پہنانا ایک کامل استاد ہی کا منصب ہے۔

جناب مولانا سعد الدین انصاری مرحوم کی سب سے بڑی خصوصیت جو ان کی زندگی کو ہموار انسانی سطح پر قائم رکھ سکی یہ تھی کہ وہ ایک استاد تھے اور سچے استاد۔

سچے استاد کی زندگی معمولی انسانیت کے رنگ میں رنگ کر نکھرتی ہے اور مقبولیت حاصل کرتی ہے مرحوم سعد صاحب کی زندگی کو اس کسوٹی پر پرکھئے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ صرف معروف ہی نہ تھے بلکہ صحیح معنوں میں مقبول بھی تھے۔

مقبولیت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ استاد اپنی بات کہنے کی جگہ ناتجربہ کار شاگردوں کی ہر بات مان کر ان کی زندگی میں گم ہوجائے اور خود ان کے سامنے کوئی نمونہ ہی پیش نہ کرے۔ ایسی نرالی مقبولیت جو قدیم مشرقی شاعر بھی نہ نباہ سکے بھلا استاد کے منصب کے ساتھ کب کھپ سکتی ہے استاد کی مقبولیت کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنے شاگردوں کی زندگی میں ایسا باوقار ساتھی ہو جس کے ساتھ نباہ بہت مشکل نہ ہو۔ اس کی اپنی سیرت میں بختگی ہی نہ ہو بلکہ جاذبیت بھی ہو۔

استاد محترم کی سیرت کا لب لباب یہ ہے کہ انھوں نے سنہ ۲۱ء سے سنہ ۴۶ء تک یعنی مسلسل چوتھائی صدی تک اپنی حقیقی مذہبیت، سچی وطنیت، عزیزوں کی حرمت، رفیقوں کی مروت اور ایک سچے استاد کی محنت کا کھرا اور آسان نمونہ پیش کیا۔

مرحوم کی تعلیم ندوۃ العلماء میں مکمل ہوئی لیکن ایک خالص مذہبی ماحول سے فراغت حاصل کرنے پر علم کی یہ پیاس جو کم ہی بجھتی ہے مرحوم کو دار العلوم سے

علی گڑھ کھینچ لائی۔

نوجوان طبیعتیں عموماً عجلت میں فیصلہ کرنے کے بعد بہت ہی کم اس پر نظر ثانی کرنا گوارا کرتی ہیں لیکن مرحوم کو ترک موالات کے نعروں نے علی گڑھ میں قدم رکھنے سے پہلے ہی چوکنا سا کر دیا۔ ترک موالات کا تقاضہ جو اس وقت "عین ایمان کی علامت" تھی پورے جوش سے آپ کے دل میں موجیں مارنے لگا۔ لیکن اس کی سمت اور دن سے کچھ مختلف تھی۔ بہتوں نے "زندہ باد" کے نعروں سے متاثر ہو کر اور پھولوں کے ہاروں سے دب کر زندگی کو سیاست کے پر شور سمندر میں بے تپوان چھوڑ دیا تھا۔ پر کچھ نے ہمت کر کے اسے کھینے کی ٹھانی۔ کام دیکھنے میں کیسا سادہ تھا۔ کر دکھانے میں کتنا مشکل۔ مگر مرحوم کی جوان ہمتی نے اس سخت مشکل کو ہنستے ہنساتے آسان کر دکھایا۔

علی گڑھ کالج کی جگہ جامعہ ملیہ میں "جدید تعلیم" حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ابھی کچھ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اس نیشنل یونیورسٹی کے قومی کام کرنے والے اساتذہ نے عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ سے جو ان کے ہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے تعلیم کے کام میں کچھ مدد چاہی۔

انگریزی مدارس سے ہجرت کرنے والے طلبہ عربی سے بھلا کہاں آشنا ہوتے لیکن اب اسلام اور قرآن کے عشق میں انھوں نے بھی عربی پڑھنے کی ٹھانی۔ انہی اسلامیات کی تعلیم دینے والے طلبہ میں سے ایک مرحوم سعد صاحب بھی تھے۔ آخر کار اسلامیات کی تعلیم میں دلی شغف اور صحیح دلچسپی کے سبب وہ اپنی انگریزی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ قرآن کریم کے مطالعہ میں ابتدا ہی سے گہرا انہماک تھا اس لئے تفسیر کے مطالعہ کی غرض سے ہندوستان کے مشہور عالم دین اور تفسیر کے فاضل علامہ مولانا حمید الدین صاحب فراہی کے حلقہ

درس میں شامل ہو گئے ۔

سیاست کا بخار اترنے پر جب نوجوانوں کی نظر میں دنیا تاریک ہو گئی تھی اور انھیں ہر تعمیری کام سے وحشت ہوتی تھی اور جب تکان اور ندامت سے ان کی ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں سعد صاحب مرحوم اطمینان قلب سے تعلیم جیسے بے مزہ کام میں دل شوق سے لگ چکے تھے ۔

اس تھوڑے سے عرصہ میں جو زندگی کی نئی نئی مشکل راہوں پر چلنے میں گذرا ان کی پر خلوص ہمت راہ کی ہر تاریکی کو چیر کر رہنمائی کا منصب ادا کرتی رہی ۔

عین شباب کے زمانے میں انھوں نے عہد کیا کہ ۲۰ سال یا تا زندگی جامعہ ہی میں کام کروں گا اور اس عہد کو بڑے شوق و جوش سے نباہ کر قوم سے کوئی داد اور صلہ لئے بغیر دنیا سے اٹھ گئے اور ہم نوجوانوں کو وہ سبق دے گئے جو بھلایا نہ جائے گا ۔

مرحوم کی زندگی کا ایک مختصر زمانہ جامعہ ازھر مصر کی تعلیم میں بسر ہوا ۔ وہی مصر جو نئی زندگی کا گہوارہ بن رہا تھا اور جس پر یہ نیا پن شدت سے مسلط تھا ۔ سچی اور پُر خلوص طبیعت اس شدت کے غلبہ میں بھی راہ اعتدال سے نہ ہٹی ۔

اپنے معمولات کی پابندی اپنے فرائض کی ادائیگی اپنے ساتھیوں کا خیال مہمانوں کی تواضع ان کی زندگی کے اہم اور محبوب عناصر تھے جو جدید تہذیب کی فضا میں بھی قائم رہے وہ جس مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی مدت کے لئے مصر تشریف لے گئے ۔ اسی بے تکلف تبسم کے ساتھ جامعہ ازھر کے فاضل ہو کر ہم سے آملے ۔

مرحوم کی مذہبی شدت مشہور تھی پر وہ محض رسوم و عبادات ہی میں نہیں بلکہ

صفائی اور سچائی میں بھی۔ ان کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی تو سخت دشواری اور لاچاری میں بھی انھوں نے صفائی کا پورا پورا خیال رکھا۔

ایک بار کھانے کے بعد مشفق استاد ہمارے کھانے کے کمرے میں تشریف لائے۔ دسترخوان زیادہ صاف نہ تھے۔ بس یہ بات ان کی صفائی پسند طبیعت گوارا نہ کر سکی۔ وہ بہت خفا ہوئے اس پر کسی نے کہا "کیا کریں مجبوراً کھاتے ہیں" اس پر وہ اور خفا ہوئے اور غصہ سے فرمایا کہ پھر تم لوگ یہ دسترخوان پھاڑ کیوں نہیں دیتے اور کیسے ان پر کھانا گوارا کرتے ہو۔

سعد صاحب مرحوم جن کی ظاہری صفائی سے بڑھ کر کے دل کی صفائی تھی وہ غلطی پر خفا ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے کبھی زیادہ خفا ہو جاتے تو پھر اتنی ہی محبت سے بعد میں خفگی کی وجہ سے معاملہ کو صاف کر لیتے۔

میں کئی بار ان کی خفگی کا نشانہ بنا۔ خفگی کے بعد چائے پر بلا کر محبت سے منانا ان کی عادت تھی۔ ایک دفعہ بہت معمولی سی غلطی پر محترم استاد اتنے خفا ہوئے کہ مجھ سے یہ خفگی برداشت نہ ہو سکی۔ انھوں نے حسب عادت مجھے چائے پر بلایا۔ میں گیا تو پر چائے پینے سے پہلے کچھ افسردگی سے کہنے لگا۔ آپ ذرا ذرا سی بات پر مجھ سے بے حد خفا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اور ساتھی بھی تو اسی طرح کی کتنی غلطیاں کرتے ہیں مرحوم نے اس کے جواب میں اپنے خاص لہجہ اور خاص انداز میں فرمایا۔ میرے عزیز یہ بتاؤ کیا تم بھی اوروں ہی کی طرح ہو۔ میں تو تمھیں اوروں سے کچھ مختلف سمجھتا تھا۔ اگر تم کہو تو میں تمھیں بھی اوروں کی طرح نظر انداز کر دیا کروں۔

مرحوم کی اس مختصر بات نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور میں نے سوچا کہ شاید یہ خصوصیت صرف میرے ہی لئے ہو۔ لیکن اپنے شاگردوں سے ان کا

سلوک ایسا ہی تھا اور غالباً اسی سلوک کا نتیجہ تھا کہ ہمیں ان سے دلی تعلق تھا۔ مجھے مشفق و محترم سعد صاحب کے ساتھ اکثر کام کرنے کا موقع ملا۔ خاص طور پر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تبلیغی جماعتوں میں عموماً مرحوم کے ساتھ میوات اور کئی دوسرے مقامات کا سفر کیا۔ ہم خیالی اور خصوصی شفقت کی وجہ سے استاد محترم اکثر موقعوں پر مجھے آگے بڑھا کر میری ہمت افزائی کرتے اور پھر بعد میں مناسب تنقید کے ذریعے میری تربیت فرماتے مرحوم کی بزرگانہ شفقت اور مخلصانہ محبت میں ایک عجیب طرح کا غیر محسوس اثر تھا جسے الفاظ میں ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک بار استاد محترم کی طبیعت ناساز تھی ہم لوگوں کے امتحانات ہو رہے تھے اس لئے صرف ایک آدھ دفعہ جا کر مزاج پرسی کی اور چلے آئے رات کو مجھے اچانک خیال ہوا کہ کہیں خدانخواستہ طبیعت زیادہ ناساز نہ ہو۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ آخر کتابیں چھوڑ کر سیدھا گھر پر گیا۔ دیکھا تو بخار بہت تیز تھا اور اتفاق سے کوئی موجود بھی نہ تھا میں نے ہاتھ پیروں کی مالش شروع کردی۔ دیر تک بیٹھا مالش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کافی دیر بعد پسینہ آکر بخار کم ہوگیا۔ میں آنے لگا تو انھوں نے پوچھا، کون میں نے سوچا کیا کہوں مگر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ خود ہی پہچان گئے اور فرمایا بھئی میری طبیعت گھبرا رہی تھی سوچا کہ تمھیں بلواؤں مگر تم خود ہی آگئے اور میں نے محض اس قیاس پر کہ تم ہوگے شروع میں کچھ نہ کہا پھر سوچا شاید کوئی اور ہو اس لئے نام پوچھ لیا مجھے اس پر تعجب کے ساتھ کچھ ہنسی بھی آئی اور میں نے اجازت چاہی مرحوم نے بہت دعائیں دیں اور اصرار سے کہا اب پڑھنا نہیں سو جانا۔

مرحوم کی زندگی کے ضبط و نظم اور اعتدال کی ایک دلچسپ مثال ان

کا پروگرام تھا۔ خود کئی بار فرمایا میں تو آٹھ گھنٹے پڑھتا ہوں۔ آٹھ گھنٹے آرام کرتا ہوں اور آٹھ گھنٹے دیگر ضروری کام انجام دیتا ہوں۔

مرحوم کی وطن دوستی بھی ان کے مذہبی شغف سے کچھ کم نہ تھی ایک بار طلبہ کے ایک مزاحیہ جلسہ میں وہ حسب عادت شریک تھے اور دلچسپی لے رہے تھے کہ ان کو اسی دوران میں کلکتہ فائرنگ کی اطلاع پہنچی وہ فوراً اٹھے اور فرمایا آپ لوگوں کا یہ جلسہ نامناسب وقت ہو رہا ہے اسے ملتوی کر دیجئے تو اچھا ہو۔ جلسہ عین شباب پر تھا لوگوں کو یہ تقریر ضرورت سے زیادہ جذباتی معلوم ہوئی محفل جمی ہوئی تھی۔ لوگوں کو جلسہ کی برخاستگی کے معاملے میں کچھ مذبذب پاکر وہ خود جلسے سے چلے گئے۔

جلسے کے بعد سب نے فائرنگ کی تفصیلات معلوم کیں تو نہایت افسوس ہوا اور دوسرے دن ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا۔

جلسہ میں حکومت کی مذمت کی گئی اور مجروحین سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا مرحوم بزرگ بھی اس موقع پر اپنے جذبات کو نہ دبا سکے۔ انھوں نے خاموشی کو توڑ کر ایک پرجوش تقریر سے مجمع کو گرما دیا اور حکومت کے رویہ کی سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے مستقبل کے خوش آئند امکانات کا ذکر بھی کیا۔ پر آہ کسے خبر تھی کہ آزاد وطن کی تمناؤں کو دل میں چھپا کر کام نہیں ظاہر کرنے والے کی یہ تقریر آخری تقریر ہے۔

مشفق محترم کی تواضع اور فیاضانہ مہمان نوازی سے جامعہ میں کون ناواقف ہوگا۔ وہ اکثر دعوتیں کرتے اور اکثر دعوتوں میں بلائے جاتے اور شرکت فرماتے۔

ایک بار ہم چند بے تکلف ساتھیوں نے مل کر ایک دعوت کا سامان کیا۔

جمعہ کا دن تھا، فرنیچر وغیرہ ہم نے خود ہی تیار کیا تھا اور سب سے الگ ایک جگہ جا بیٹھے تھے کہ اچانک عین موقع پر آپ تشریف لے آئے۔ ہم لوگوں نے معذرت کے طور پر کہا ہم لوگ تو یوں ہی مذاق کے لئے جمع ہیں فرمایا ارے بھئی میں بھی تو تمہارے مذاق میں شریک ہونے آیا ہوں۔ تاکہ تم لوگوں کا مذاق اچھا ہو جائے۔

اپنے شاگردوں سے موصوف کو ایک خاص دلی لگاؤ تھا چنانچہ ان کی ہر تفریح و تقریب میں آپ پابندی سے شرکت فرماتے تھے۔ جب تک محفل میں رہتے نہ صرف خود خوش ہوتے بلکہ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔

موسمی پھلوں میں آم کا بے حد شوق تھا نیز کھانے کے معاملہ میں ایک خاص عادت یہ بھی کہ کوئی خاص کھانا ہو وہ بغیر دوسروں کو شریک کئے ہرگز نہ کھاتے۔ ایک بار صرف آم کھانے رخصت لے کر لکھنؤ تشریف لے گئے تو میں نے ایک خط میں طنزاً لکھنؤ کے آموں کا ذکر کیا جواب میں فرمایا "بھئی میں آموں اور امرودوں کا احترام کرتا ہوں۔ ان کو پارسل سے بھیجنا بہت برا سمجھتا ہوں جس کو شوق ہو وہ آئے اور کھائے۔

جب کبھی ہم لوگ سیر و سیاحت کے لئے جاتے جو پروگرام بنتا آپ ساتھ رہتے اور پیدل چلنے کے معاملہ میں کبھی پیچھے نہ رہتے۔ بزم کے اکثر سیاحت کے پروگرام آپ ہی کے شوق و دلچسپی سے کامیاب ہوئے۔

مرحوم بڑے لڑکوں کو قرآن کریم کا درس دیتے تھے اس درس میں ان کے ذوق و شوق سے بڑا لطف پیدا ہو جاتا تھا۔ اسی دوران میں موقع اور مناسبت کے لحاظ سے علامہ اقبال مرحوم کے اشعار بڑے جوش سے پڑھتے۔ اقبال کے متعلق فرماتے یہ نظم میں قرآن کریم کی اردو تفسیر ہے۔

مدرسہ ثانوی میں اسی عقیدت و محبت کی بناء پر جو آپ کی خصوصیت سے علامہ مرحوم سے تھی آپ نے یوم اقبال کی تقریب بہت کامیابی سے منعقد کی لڑکوں نے علامہ اقبال پر مضامین پڑھے نظمیں یاد کیں۔ اچھے اشعار کے انتخاب کئے اقبال کے اشعار میں بیت بازی اور ان کے مکالمہ ابلیس و جبریل سے ایک مختصر سا ڈرامہ بھی کھیلا۔

ان تمام کاموں میں آپ کی دلچسپی اور محنت نمایاں تھی کچھ عرصے بعد رمضان المبارک میں آپ ہی کی تجویز سے آپ ہی کی مدد کے بھروسہ پر مدرسہ ثانوی کے طلباء نے یوم قرآن منایا۔ تمام رمضان المبارک میں اس کی تیاری رہی۔ قرآن کا مطالعہ اور اس پر مضامین کے اعتبار سے بہترین ٹکڑوں کا انتخاب۔ یوم قرآن کا جلسہ مضامین قرآن کی نمائش اس سارے پروگرام کے روح رواں آپ ہی کی ذات تھی۔

جامعہ میں قرآن کریم کی لازمی تعلیم کے نصاب کے سلسلہ میں مرحوم نے مدرسہ ثانوی کے لئے مضامین کے اعتبار سے قرآن کریم کے ٹکڑوں کا انتخاب کرکے کئی سال تک اس کی تعلیم دی اس کے فوائد کا تجربہ کیا اور بڑی حد تک اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔

چھوٹے لڑکوں کے لئے اسلامیات پر کئی آسان اور عمدہ کتابیں بھی تصنیف کیں جن محاسن اسلام، اچھی باتیں، درس میں داخل ہیں۔

عربی قواعد کو انتہائی سہل اور آسان بنانے کا کام بھی آپ نے بڑی کامیابی سے انجام دیا صرف و نحو پر اس قدر اچھے نوٹ لکھواتے کہ پھر کسی قواعد کی کتاب کی ضرورت نہ پڑتی۔

مرحوم بہت عرصہ تک بزم ادب مدرسہ ثانوی کے صدر بھی رہے آخری کابینہ نے جب فوٹو کھچوانے کی درخواست کی تو پہلے کچھ ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا مگر کابینہ

کے اصرار پر بڑی خوشی اس میں شریک ہوئے۔ مرحوم کی یہ آخری تصویر تھی۔ جب تصویریں کر آئی تو دیکھ کر سنجیدگی اور تبسم سے فرمایا اب تو بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو چلے۔ حالانکہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی عام کمزوری اور کچھ بالوں کی سپیدی ضرور تھی اور شاید اس لئے یہ جملہ فرمایا۔

جامعہ سے آخری بار دسمبر ۱۹۴۵ء میں مکان لکھنؤ تشریف لے گئے ۱۳ جنوری کو جس دن آنے کا قصد تھا اسی دن اچانک سر میں درد ہوا درد کی شدت نے سفر ملتوی کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن شام تک طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ مغرب کی نماز میں امامت کی۔ کھانا کھا کر آرام فرمایا۔ شب کے آخری حصہ میں دوسرا سخت دورہ پڑا۔ اور اس میں اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کو ہمیشہ خوش رکھنے والے مشفق بزرگ بڑی خاموشی سے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لکھنؤ سے مکان سے چند قدم پر ایک پرانے قبرستان میں آخری آرام گاہ ہے قبر کچی ہے مگر صاف مٹی سے لپی ہوئی ہے جسے دیکھ کر مرحوم کی سادگی اور صفائی یاد آ کر دل کو تڑپا جاتی ہے۔

ہارون بھائی نے قبر کے ارد گرد کچھ پھول پودے لگائے ہیں۔ سرہانے ایک پرانا درخت ہے۔ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب قبلہ نے تاریخ وفات نکالی ہے۔ سعد صاحب سچے عاشق جامعہ سے اٹھ گئے۔

مرحوم کی وفات کی خبر تیسرے دن جامعہ پہنچی۔ اظہار تعزیت کے لئے چھٹی ہو گئی۔ قرآن خوانی ہوئی انجمن اتحاد نے جس کے آپ سابق نائب صدر تھے۔ اظہار تعزیت کا جلسہ منعقد کیا۔ ڈاکٹر صاحب صدر تھے۔ فرمایا سعد صاحب جامعہ کی جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔ اچھی جماعت اپنے آدمیوں کو مرنے نہیں دیتی

اور بری جماعت میں زندہ آدمی بھی بس مرنے ہی کے لئے ہیں اگر ہماری جماعت اچھی جماعت ہے تو ہم سعد صاحب کو مرنے نہ دیں گے اور وہ ہمیشہ اس جماعت میں اور اس کے کام میں زندہ رہیں گے ۔

سعد صاحب نہ صرف ہماری جماعت کے ایک فرد تھے بلکہ وہ اس جماعت کے نقاد اور نکتہ چیں بھی تھے جن کی نصیحت کی تلخی میں بھی محبت کی صداقت صاف محسوس ہوتی تھی اور اب جامعہ کے ہر جلسہ ہر تقریب اور ہر بزم میں ان کی ہنسی اور قہقہے تصور کے کانوں کو سنائی دیتے ہیں خود آنکھوں کو نظر نہیں آتے۔ سعد صاحب مرحوم کو جامعہ ہارون بھائی سے کچھ کم عزیز نہ تھی ۔ پھر کیوں نہ اُسے ان کی امیدوں اور آرزوں کا سہارا کہا جائے۔ مرحوم کی ساری امیدیں اس سے وابستہ تھیں خدا کرے ہم ان امیدوں کو پورا کر کے سعد صاحب کی روح کو مسرور اور اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکیں ۔

(رضی الدین)

صغیر مرحوم

اگست ۱۹۳۶ء میں جس وقت جامعہ نگر کی نئی بستی بسائی گئی، یہاں کے کارآزمودہ، تجربہ کار اور کہنہ مشق افراد کی جماعت میں ایک بالکل ہی اجنبی مگر باہمت نوجوان بھی اپنے دل میں خدمت کا عزم اور استقلال کی قوت لے کر شامل ہوا۔

یہ شخص نہ تو جامعہ کی زندگی سے واقف تھا اور نہ یہاں کے لوگوں کی کیفیت سے باخبر۔ اس کے لئے یہاں کا ہر فرد، ہر کام اور سارا ماحول بالکل نیا اور غیر مانوس تھا۔

اس بستی میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے جو خدمت اس کے سپرد کی گئی وہ دفتر کی محرری تھی۔ نووارد نے نہ صرف اپنے آپ کو اپنے کام سے مانوس کیا بلکہ بڑے چھوٹے ساتھیوں کے دل میں بھی جلد جگہ پیدا کرلی۔

محنت، شوق، سمجھ بوجھ، ہنس مکھ چہرہ میٹھی زبان اور جی میں گھر کرلینے والے اخلاق واطوار۔ اس پر سے خوش مذاقی اور ادبی ذوق، یہ سب باتیں جس کے اندر موجود ہوں۔ مشقت سے جو گھبراتا نہ ہو۔ ذمہ داریوں سے جسے الجھن نہ ہو۔ کام کرنے کا طریقہ اور ہر دلعزیزی کی صفتیں جس کی سیرت کا جزو ہوں۔ ظاہر ہے وہ کیوں کر مقبول نہ ہوتا۔

اسی زمانے میں اس نئے اور اب سے دس برس پہلے کے مختلف ماحول۔ سنسان اور کم دلچسپ فضائیں بہت سے دوسرے نئے آدمی آئے، متعدد جگھوں پر رہے مگر اپنے آپ کو موزوں اور مستعد نہ ثابت کرسکے اور از خود ان کو یہاں سے کہیں

اور چلے جانے کی کوشش کرنا پڑی۔ مگر ہمارا مستعد نووارد ہر لمحہ یہ ثابت کرنے لگا کہ وہ اس مدرسے اور یہاں کے ہر ایک متعلق اور غیر متعلق کام کا اہل ہے، نہ صرف اہل بلکہ نہایت موزوں اور مناسب۔

ان کی خوش مزاجی اور اہلیت نے ذمہ دار حضرات کو آمادہ کیا کہ دفتر کے کاموں کے علاوہ اس کے اندر دوسرے اہم فرائض کی انجام دہی کی جو خداداد صلاحیتیں موجود ہیں ان سے بھی کام لیا جائے۔

چنانچہ بہت تھوڑے عرصے میں ہی نووارد دفتر کے کاموں کے علاوہ درس و تدریس کے مشاغل میں بھی مصروف پایا جانے لگا۔

جس معقولیت اور سوجھ بوجھ سے دفتری کاموں میں ایک نمایاں حیثیت اختیار کرلی تھی وہی انہماک شغف اور صلاحیت تعلیم کے کام میں بھی نظر آتی تھی۔ اور بالآخر دفتر سے جملہ خدمات تعلیم و تربیت کی طرف منتقل کردی گئیں وہی ذمہ دار حضرات جو نووارد نوجوان کی سابقہ خدمات حسن کارکردگی سے مطمئن اور خوش تھے۔ اس وقت اسی اجنبی کی تعلیم و تربیت کے قائل اور معترف پائے گئے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مستقل طور پر اساتذہ کی جماعت میں یہ شخص شامل کرلیا گیا۔ میٹرکولیشن کے بعد طالب علمی کی تازہ اور آزاد زندگی سے الگ ہوتے ہی، ایک ایسی جماعت کا رکن اور مقبول رکن بن جانا جہاں اس جماعت کا ہر فرد اپنے سامنے تعلیم و تربیت کا خاصا تجربہ رکھتا ہو جس جماعت کے بیشتر ارکان جامعہ کے قدیم خدمت گزار۔ نہ جانے کیسی کیسی سختیاں اور دشواریاں جھیلے ہوئے۔ ان سب کی مجلس میں یہ اجنبی اب اجنبی نہ رہا تھا بلکہ اک رہا سہا اور جانا بوجھا فرد۔

تعلیم کے سلسلے میں اس کی حیثیت اک کامیاب استاد اور تربیت کے معاملے میں اس کا وطیرہ کسی مستند اتالیق سے کم نہ تھا۔

اساتذہ کی وہ جماعت جس میں ادبی مشغلے، اور شعر و شاعری کے چرچے رہتے ہوں خواہ تنقید و تبصرے کے مرحلے انجام پاتے ہوں یہ جوان ہمت اس میں موجود اور شریک نہ صرف اک سامع اور نیاز مند کی صورت میں بلکہ مجلس کے ایک اہم اور قابل توجہ رکن کی حیثیت سے۔ گفتگو کا انداز اور مسائل پر غور و فکر میں کسی طرح اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ یہ مجلس کا سب سے کم عمر اور اسکول سے نیا نیا نکلا ہوا طالب علم ہے۔ طبیعت میں شعریت ذہن میں ادبی نکتہ سنجیوں کو محفوظ رکھ لینے کی صلاحیت قابل تعریف حد تک موجود تھی خود شاعر نہ تھا مگر شعری خوبیوں کو پرکھنے اور صحیح داد دینے کا مادہ کافی حد تک موجود تھا۔

مطالعے کا سلسلہ درسی کتابوں تک محدود نہ تھا بلکہ نظم و نثر کی منتخب کتابوں کی تلاش اس کو دیکھنے کا موقع نکال لینا اور اس میں سے یاد رکھنے والی باتوں کو حافظے کا جزو بنا لینے کی عادت پیدا کرلی تھی۔

ایک طرف اگر ادبی مجلسوں میں شرکت کرنے اور اس میں گرما گرمی پیدا کرنے کی خو تھی تو دوسری طرف کھیل کے میدان اور کشتی کے اکھاڑے میں اسی شغف اور انہماک کے ساتھ موجود ـــــــ اس معاملے میں بھی کوئی باہر کا آدمی یہ شبہ نہ کرسکتا تھا کہ یہ شخص نیا ہے اور نوآموز ـــــــ یہی اسباب تھے جنھوں نے طلبہ کی نظر میں محبوب اور رفیع بنا رکھا تھا اور ساتھیوں کے دلوں میں قدر و منزلت کے جذبات موجزن رہا کرتے تھے۔

نحیف الجثہ ہونے کے باوجود سخت سے سخت کام میں اپنے سے زیادہ اچھے ہاتھ پیر والوں کے رفیق و معاون۔ سیر و تفریح کے دل دادہ۔ بھاگ دوڑ اور شکار کے شوقین۔ مختصر یہ کہ اس بستی کی ہر دل چسپی میں خواہ رزم کی ہو یا بزم کی یہ مقبول و محبوب الانسان ہمیشہ اور ہر زمانے میں نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔

جس دن سے مدرسہ ابتدائی میں قدم رکھا ہر اس موقعے پر جہاں کسی نئے انتظام
کی ضرورت پیش آئی اور کوئی آدمی خاطر خواہ سامنے نہ آیا صغیر مرحوم پر بے ساختہ
لوگوں کی نگاہیں پڑنے لگتی تھیں۔ اور یہ ہمہ گیر صلاحیتوں کا اولوالعزم انسان اپنی خدمات
پیش کر دینے سے کبھی دریغ نہ کرتا۔ چنانچہ ایک زمانے میں جب کہ مدرسے کی آبادی
میں بلحاظ طلبہ، اساتذہ اور عملہ خاصا اضافہ ہو گیا۔ اس وقت مطبخ کے سابقہ نظام میں
تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب تک جن بزرگوں کے ذمے یہ انتظام تھا۔ ان کی
خدمات دوسرے شعبے کے نظم و نسق کو بہتر کرنے کے لئے لازمی سمجھی جانے لگیں اب
سوال یہ تھا کہ مطبخ کون سنبھالے۔ باہر کا کوئی آدمی بلایا نہیں جا سکتا تھا موجودہ اسٹاف
میں سب کے سب مصروف، بہر کیف نظر انتخاب جا کر ٹھہری تو مرحوم صغیر پر۔
سابقہ کام اور موجودہ ضرورت کا بُعد بلکہ تضاد ملاحظہ فرمائیے کہاں تعلیم و تربیت
کے فرائض کہاں فراہمی اجناس اور تیاری تقسیم طعام کی خدمت ـــــ کارپردازانِ
مدرسہ اور منتظمین اعلیٰ کی نظر انتخاب پڑتے ہی اور زبان پر یہ کلمہ آتے ہی "صغیر
صاحب اس کام کو بھی آپ کر دیکھیں" ہمارا مستعد اور باعمل ساتھی نہایت خندہ پیشانی
کے ساتھ اس خدمت کی انجام دہی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور نہ صرف آمادہ بلکہ کام
کو ہاتھ میں لیتے ہی اس انہماک خوبی اور کامیابی سے انجام دیتا ہے کہ دیکھنے والوں
کو حیرت اور سننے والوں کو اس کی کارکردگی پر رشک آنے لگتا ہے۔

موجودہ مطبخ اور اس سلسلے کی اکثر و بیشتر چیزوں کی فراہمی اور انتظامات کی داغ
بیل مرحوم کے زمانۂ نظامت میں پڑ چکی تھی ـــــ نہ صرف اس شخص میں انتظامی قابلیت
موجود تھی بلکہ اس نے اپنے قابل تعریف طالب علمانہ ذوق کے ماتحت کھانے پکانے
کے فن اور اس کے رموز کو بھی نہایت قلیل عرصے میں بہت اچھی طرح سیکھ لیا تھا
کتاب کا ذوق اور عمل کا شوق نہ جانے کس حد تک اپنی طبیعت میں سے کر پیدا

ہوا تھا۔

کم و بیش یہی علم و عمل کا جذبہ ابتدائی طالب علمی کے زمانے سے عادات و اطوار میں پایا جاتا تھا، مسلسل محنت کی عادت، اور پھر جامعہ نگر آکر طرح طرح کے کاموں کو اپنے ہاتھ میں لینا اور ان کو تن من سے کرنا۔ زندگی کو نہایت مفید، مقبول اور ایک حد تک کامیاب بنائے بغیر نہ رہ سکا۔

ضروری تعلیم، مناسب عمر، دل و دماغ میں تازگی، محنت کا شوق، اکتساب کا مادہ، مختلف قسم کے کاموں کو حسن و خوبی سے انجام دینے کی صلاحیت یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ مرحوم اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اگر چاہتے تو جامعہ کے علاوہ جہاں ان کو زیادہ تنخواہ کی نوکری مل سکتی تھی چلے جاتے۔ مادی حالات نے بعض اوقات اس قسم کی باتوں کو سوچنے پر مجبور کیا۔ احباب اور متعلقین نے بھی دوسری راہیں دکھائیں اور بتائیں —— چاہتے تو نکل جاتے اور اپنے آپ کو مالی حیثیت سے بہتر رکھ کر زندگی گزارتے، مگر جامعہ والوں کو ان سے ان کے کام سے ان کی طبیعت سے کچھ اتنا تعلق ہو گیا تھا کہ وہ صغیر کی جدائی گوارا نہ کرتے اور خود ان کو یہاں کے افراد سے یہاں کے صبح و شام سے یہاں کے مشاغل و افکار سے کچھ اتنا انس ہو گیا تھا کہ باوجود تکالیف اور پریشانیوں کے انھوں نے کسی دوسری طرف کا خیال بھی نہ کیا اور اپنے انس کو قائم اور تعلق کو نہ صرف برقرار بلکہ مستحکم کرنے کی خاطر جامعہ نگر کو سچ مچ اپنا گھر ہی بنا لیا۔ اسی بستی میں جہاں اکثر بڑے چھوٹے منتشر مکانات نظر آتے ہیں وہیں ایک چھوٹا سا سادہ اور خوبصورت گھر بھی بنوا لیا۔

خدا کے فضل سے ماں باپ بھائی بہن اور ایک ہرا بھرا کنبہ موجود مگر انھوں نے اسی پردیس کو بعض بزرگوں اور مخلصوں کی طرح اپنا دیس بنا لیا۔ اور کئی برس

تک جامعہ کے ایک مفید کارکن کی حیثیت سے اپنے ایک مختصر سے خاندان کے ساتھ رہتے رہے۔

سنہ ۴۰ء سے مرحوم کی زندگی میں بعض نئے افکار شامل ہو گئے تھے، خرابیٔ صحت نے ان کو بہت کمزور اور کسی قدر متفکر کر دیا تھا۔ کبھی خود علیل رہتے تو کبھی بچوں کی علالت کی وجہ سے پریشان بچوں سے غیر معمولی محبت تھی لہذا ان کی تھوڑی سی تکلیف مرحوم کی بہت بڑی اذیت کا سبب بن جاتی تھی۔ انھیں حالات میں سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں جامعہ ٹریننگ کالج سے معلمی کا امتحان پاس کیا۔ اس سال زیادہ تر وہ صاحب فراش رہے مگر جو ارادہ کیا تھا اسے پورا کر ہی لیا۔ معلمی کے امتحان کے بعد صرف تین سال وہ اس پیشہ سے وابستہ رہے۔ متاہل زندگی کے افکار پھر اپنی اور بچوں کی مسلسل خرابیٔ صحت مجبوراً ان کو اپنی خدمات پہلے تو دفتر ہمدرد ان کی طرف اور اس کے تھوڑے عرصے بعد دفتر مسجل میں منتقل کرا لینا پڑیں۔ یہاں ان کو مدرسے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ وقت مل جاتا تھا جسے وہ اپنی صحت کو بہتر کرنے نیز بچوں کی دیکھ بھال میں صرف کرنے لگے تھے۔

وہ حالات اور وہ افکار جس نے صغیر مرحوم کو کسی قدر خاموش اور لاغر کر دیا تھا اب بدل چلے تھے، ان کے چہرے پر پہلی جیسی بشاشت آچلی تھی۔ اپنے چھوٹے سے خاندان اور مختصر سے مکان میں ان کے اوقات نسبتاً فراغت سے گزرنے لگے تھے ان کے ذہن میں کچھ نئے منصوبے اور عمل کے نئے کچھ دوسرے میدان پیدا ہو چلے تھے۔ ایک طرف وہ اپنے موجودہ کام کو سکون کے ساتھ اور اطمینان بخش انداز سے کرنے لگے تھے تو دوسری طرف ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ اپنی سابقہ خدمات کو انجام دینے کی خاطر کچھ اور بھی کر لیں۔ تاکہ جس طرح پہلے انھوں نے زیادہ تر اپنی کوشش، ذوق اور محنت کی وجہ سے جامعہ کے ایک تعلیمی ادارے

کو فائدہ پہنچایا ہے۔ اب اور علم حاصل کر کے کچھ زیادہ فائدہ پہنچانے کے قابل بن جائیں
ناگاہ ۱۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کی شام کو چلتے پھرتے ہنستے بولتے وہ اس دنیا سے چل بسے
ان کے منصوبے ان کے ساتھ گئے۔ وہ خورد سال بچے بیوی۔ ماں، باپ، عزیز اقارب
دوست احباب سب روئیں تڑپیں۔ قدرت کا جو منشا تھا پورا ہو کر رہا۔

آج سے دس سال پہلے جس اجنبی نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اپنا گھر چھوڑ
کر اس بستی میں گھر بنایا تھا۔ کون جانتا تھا اس کا پہلا ہی نہیں بلکہ آخری گھر کا نشان بھی
یہیں کی مٹی سے بنایا جائے گا۔

بچے بلک رہے ہیں۔ بیوی کو آرزو رہ گئی کاش کچھ خدمت ہی کر لیتی !!

ماں باپ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کا آخری دیدار بھی نہ کر سکے۔!!!

مرنے والا جس طرح تمام زندگی اپنی ہی کاوش اور کوشش پر سہارا کرتا رہا
اسی طرح اس نے اپنے آخری لمحات میں بھی کسی کو پرسش کا موقع دیا اور نہ تیمارداری
کی زحمت۔

رشید نعمانی
۸ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

صفدر احمد مرحوم

مولانا سعدالدین انصاری مرحوم

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ ایم اے۔ پی ایچ، ڈی۔ (برلن)

جامعہ کی پچیسویں سال گرہ ۔۔ کیا کیا خیال، کس کس کی یاد، کیسی کیسی ہمت شکن تنقیدیں، اور کیسی کیسی ہمت افزا حمایتیں، بے وفائیوں اور وفاداریوں کم ہمتی اور استقامت خامی کٹھن راہ پر تھک تھک کر تھم تھم جانے اور پھر ایک دوسرے کو سہارا دے کر اس راہ پر قدم بڑھانے کی کتنی تصویریں ذہن کے سامنے گذر جاتی ہیں۔

جامعہ کی پچیسویں سالگرہ! اس کے ذکر سے آپ سب کے ذہن میں ایسی ہی تصویریں آئیں گی، اگر ہم انھیں خیالات پر معاملہ کو ختم کر دیں تو سب کچھ یوں ہی ہوتا رہیگا جیسے ہو رہا ہے، بہت سے دوسرے اداروں کی طرح جامعہ بھی اس لئے چلتی رہے گی بلکہ شاید لوگوں کے خیال میں "ترقی" بھی کرتی رہے گی کہ کسی کو اس کے بند کرنے کا خیال نہ آئے گا، اور چلتی ہوئی چیز کا قاعدہ ہے کہ کوئی مانع حالات یا ارادہ راہ میں نہ آئے تو چلتی ہی رہتی ہے۔ جامعہ والوں کو جامعہ کے اس طرح چلتے رہنے پر کبھی بھی راضی نہ ہونا چاہئے ہمیں چاہئے کہ ہم اس پچیسویں سالگرہ کو تعمیری تنقیدی اور محکم عزم کے لئے ایک موقع بنائیں۔

پچیس برس ۔۔ لوگ اکثر کہہ دیتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں ۲۵ برس کیا ہوتے ہیں (ہاں سوتی ہوئی قوموں پر صدیاں بھی کسی ناقابل ذکر تغیر کے ساتھ گذر جاتی ہیں) جن قوموں کو کچھ کرنا ہوتا ہے ان کے لئے پچیس سال بہت ہوتے ہیں، پچیس برس میں قومیں اپنی زندگی کا رخ بدل لیتی ہیں، رحمت بنجاتی ہیں، عذاب بنجاتی ہیں، ہم نے اپنے کام سے مزاج قومی کو متاثر کیا، زندگی کے کسی شعبہ میں اس کی فکر یا سعی کو بدلا، اپنے وجود ملّی کو استحکام بخشا، دوسری قوموں میں حیثیت کو بلند کرنے، رحمت بننے، عذاب بننے کا ذکر ہی کیا ہے، اسے سوچنا چاہئے مایوس ہونے کے لئے نہیں بلکہ مشکلوں اور مجبوریوں

کو سمجھنے، ان پر غالب آنے کے وسائل سوچنے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنے اور بہت سے قدم آگے بڑھانے کے لئے، پچیس برس اور اتنا سا کام ا ہاں بہت کم کام ہے۔ بہت معمولی کام ہے بظاہر بہت بے اثر سا کام ہو لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے کاموں کا بیج ہے، جماعتی کاموں میں میرا گمان ہے کہ پہلے سے راہ کے جملہ نشیب و فراز سے آگاہ ہونا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ساتھ ملکر چلنے والوں کا یکجا ہونا، توفیق الٰہی شامل حال ہو تو یہ راہ بھی دریافت کر لیتے ہیں ایک دوسرے کو سہارا دے کر اسے طے بھی کر لیتے ہیں، کسی نے خوب کہا ہے۔

من از طریق نہ جویم، رفیق می جویم
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و باز طریق

جہاں پچیس مہینے کام کو مل کر کرنے کی مثالیں کمیاب ہوں وہاں پچیس برس آرام و آسائش میں نہیں تکلیف اور بے سر و سامانی میں جمے رہنا بالکل بے معنی بات نہیں، اس پر بہت فخر کرنے کا موقع بیشک نہیں اور یہ خیال دل میں لانا چاہیئے کہ اوروں سے کچھ نہ بن پڑا، دوسرے کی کم ہمتی کو اپنے لئے معیار بنانا بڑی ہی کم ہمتی کی بات ہے، پست نظری کی بات ہے، لیکن مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں رفیقان راہ سے اس پچیسویں سال گرہ پر یہ درخواست ہے کہ اب طریق کے تعین میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اپنی سعی کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے میں لگ جائیں، یکسوئی اور دیانت سے کام میں جمے رہیئے اور اس پر رنج نہ کیجئے کہ بہت وقت گذر گیا، آدمی اگر اپنا فرض ادا کرتا رہے اور دامن امید کو ہاتھ سے نہ جانے دے تو۔

طے شود جادہ صد سالہ بہ آہے گاہے

ذاکر حسین

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے، پی ایچ، ڈی۔ (برلن)

اس موقع پر جب جامعہ کی زندگی کے پچیس سال ختم ہو چکے ہیں ہمارے دلوں میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے اتنے دنوں میں کیا کیا؟ اور اب ہمیں کیا کرنا ہے؟

انسان کے لئے خود اپنے کاموں کا محاسبہ کرنا سب سے مشکل کام ہے، ایک طرف افتخار کا جوش اس کے سعی و عمل کے نتائج کو بڑھا کر پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف انکسار کا جذبہ انھیں گھٹا کر دکھانا چاہتا ہے، اس مدوجزر کے درمیان حقیقت کی سطح پانے کے لئے اپنے کو غیر بن کر معروضی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کی کوشش کی تو مجھے جامعہ کی چوتھائی صدی کی کوششوں کا ماحصل یہ نظر آیا۔

(۱) مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ حکومت کا بنایا ہوا تعلیمی نظام ان کی حیات ملی کی تشکیل میں مدد نہیں دیتا بلکہ رکاوٹ ڈالتا ہے انھیں اپنی تعلیمی عمارت خود بنانی ہے اور کم و بیش اسی نقشہ کے مطابق جو جامعہ ملیہ نے پیش کیا ہے۔

(۲) حکومت یہ تسلیم کر لینے پر آمادہ ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کو بغیر اس کی مداخلت کے اپنے بچوں کو اپنی اجتماعی مصلحتوں کے مطابق تعلیم دینے کا حق حاصل ہو۔

(۳) دنیا پر یہ ثابت ہوگیا کہ مسلمان بھی قومی خدمت کے لئے ایثار کر سکتے ہیں، اور صبر و استقلال کے ساتھ خاموش تعمیری کام انجام دے سکتے ہیں۔

کتنا بڑا کام ہے جو جامعہ نے کر دکھایا؟

مگر جو کچھ جامعہ کو کرنا ہے اس کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہیں، ابھی تو اس نے صرف

زمین تیار کی ہے اور ایک چھوٹی سی کیاری میں پود لگائی ہے اب اس کو اس پود سے تعلیم کا عظیم الشان باغ لگانا ہے۔

اگر سوچئے کہ اس کے لئے کتنا وقت، کتنے وسائل، کتنی محنت چاہئے تو جی ڈوبنے لگتا ہے، لیکن اگر اس کا خیال کیجئے کہ اچھے آغاز کو انجام تک، نیک سعی کو اتمام تک پہنچانے کا وعدہ اس خدا نے کیا ہے جس کی قوت اور قدرت کی کوئی انتہا نہیں تو دل کے سوتوں سے امید کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔

سید عابد حسین

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

آدمی دنیا میں کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا یہ اس کی ہمت پر منحصر ہے، بعض کو کام کرنے کی ایسی دُھن ہوتی ہے کہ وہ تھکتے ہی نہیں، بعض کو ایسا قلبی سکون عطا ہوتا ہے کہ اُنھیں کچھ کرکے تسکین حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، کام کرنے والوں کو کام میں مزا آتا ہے، آرام کرنے والے کو آرام میں۔ قدرت کا کوئی قاعدہ مصلحت سے خالی نہیں، کام کرنے والے قدرت کی مصلحت سمجھیں تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ ان پر جو بار ڈالا گیا ہے وہ ان کا حق ہے، کہ اس بوجھ اٹھانے سے ان کے کندھے مضبوط ہوتے ہیں، کام کی فکروں میں پڑنے سے اُن کے دل بڑھتے ہیں شخصیت نشوونما پاتی ہے۔

جامعہ والوں کو اب دکھانا ہے کہ ان کے کندھے کتنے مضبوط ان کے دل کتنے بڑے اور ان کا تدبر وسائل پر کس طرح حاوی ہے، انھیں دکھانا ہے کہ وہ کام کے دھنی ہیں، وہ مایوس اور پریشان نہیں ہوتے اپنی دنیا کو بناتے جاتے ہیں اور ترقی دیتے رہتے ہیں، کام سے ان کو خوشی نصیب ہوتی ہے، کام ہی سے ان کو آرام ملتا ہے۔

محمد مجیب

انجمن اتحاد

انجمن اتحاد، جامعہ کالج کے طلبہ کی انجمن اور ان کے علمی اور اجتماعی مشاغل کا تمامتر مرکز ہے۔ جامعہ کے قیام کے ساتھ ساتھ یہ انجمن بھی وجود میں آئی اور نہ صرف اپنے مخصوص علمی واجتماعی مقاصد کو ہمیشہ پورا کرتی رہی بلکہ اس کی گذشتہ تاریخ بتاتی ہے کہ خود جامعہ کے بقا و استحکام کی کوششوں میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن اتحاد کو جامعہ کی اجتماعی زندگی میں ہمیشہ ایک غیر معمولی اہمیت اور وقعت حاصل رہی ہے۔

انجمن کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے، دستور کے مطابق، ہر سال ایک مجلس منتظمہ کا انتخاب ہوتا ہے جو ۱۹۴۳ء تک تین عہدیداروں (نائب صدر، ناظم عام، ناظم دار المطالعہ) اور پانچ اراکین پر مشتمل ہوتی تھی، لیکن ۴۳ء کے جدید دستور کی رو سے "مدیر جوہر" بھی انجمن کا عہدیدار قرار پایا اور اس طرح ۴۳ء کے بعد سے انجمن کی مجلس منتظمہ چار عہدیداروں اور پانچ اراکین پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ عہدیدار اپنی مدت کا پوری کرنے کے بعد انجمن کے حیاتی رکن ہو جاتے اور مجلس منتظمہ کے دوامی ممبر شمار ہوتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں ایسے تمام اراکین حیاتی کی مکمل فہرست دی جا رہی ہے جس سے انجمن کے سابق عہدیداروں کا تعارف ہو جائے گا اور ان حیاتی اراکین کا بھی تعارف ہو جائے گا جنھوں نے مسلسل چار سال تک کالج میں تعلیم پانے کے بعد حیاتی رکن بننے کی خواہش کی تھی اور مجلس منتظمہ نے اسے منظور بھی کر لیا تھا۔
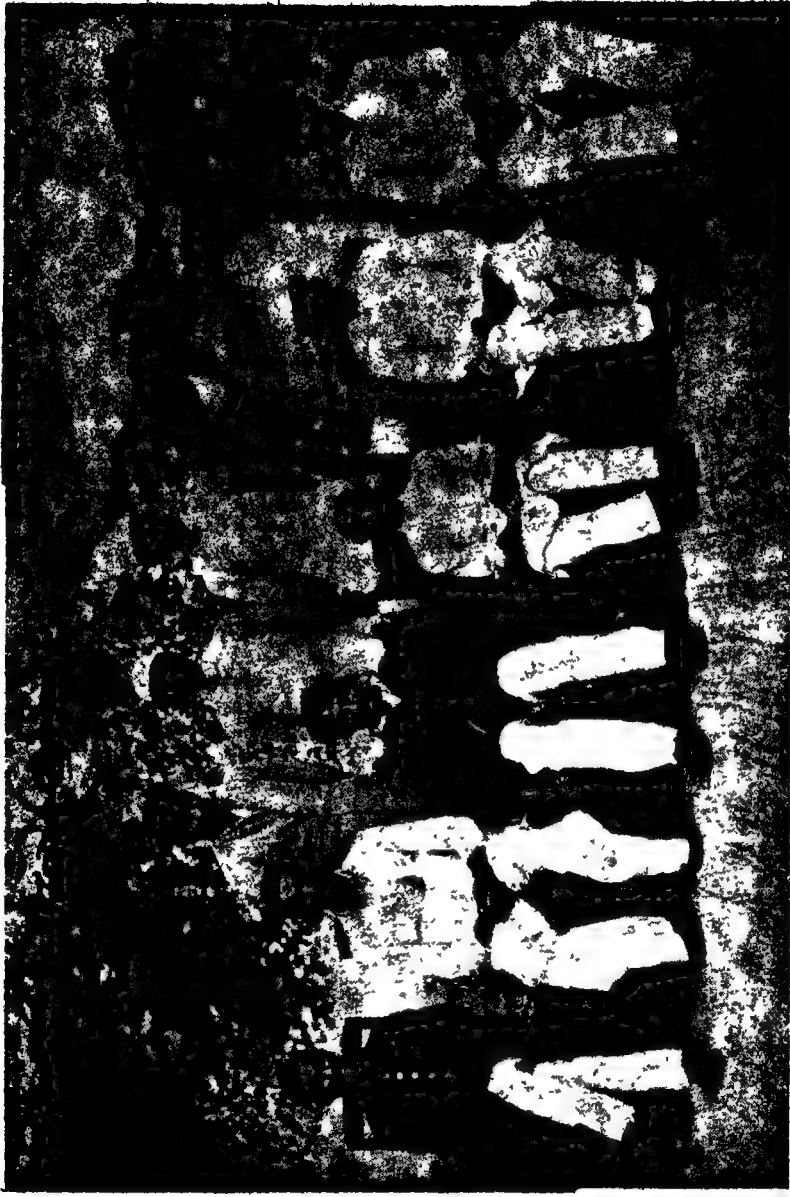
اراکین مجلس انجمن اتحاد (1945-46)

کرسیوں پر : احسان الحق مدیر رسالۂ جوہر - محمد عرفان نوری بی۔ اے (جامعہ) مدیر جوہر عربانی نمبر و سابق نائب صدر؛ پروفیسر محمد مجیب صاحب قائم مقام شیخ الجامعہ - تقی احمد سید نائب صدر محمد یوسف بی۔ اے (جامعہ) ناظم - عبدالحلیم ندوی ناظم دارالمطالعہ -
کھڑے ہوئے : عبدالرحیم - اقبال احمد ، رضی الدین - جمیل اختر اراکین -

حیاتی اراکین کے علاوہ انجمن اتحاد کو اس کا فخر حاصل ہے کہ اُس کے اعزازی اراکین میں ملک کی تقریباً تمام بڑی بڑی ہستیاں شامل ہیں جنھوں نے ازراہِ نوازش اپنی ذات گرامی کو انجمن سے منسوب کر کے اس کی عزت افزائی فرمائی ہے اور جو وقتاً فوقتاً اپنی تشریف آوری اور اپنے گراں بہا خیالات سے انجمن کو نوازتے اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم اپنے ان قابل فخر اعزازی اراکین کی فہرست بھی درج کرتے ہیں :-

اراکین اعزازی

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب — صدر انجمن

۱۔ مہاتما گاندھی
۲۔ مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی
۳۔ پنڈت جواہر لال نہرو
۴۔ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی
۵۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم
۶۔ جناب دیوداس گاندھی صاحب
۷۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی
۸۔ محترمہ خالدہ ادیب خانم صاحبہ
۹۔ مسز سروجنی نائڈو
۱۰۔ بابو سباش چندر بوس
۱۱۔ خان عبدالغفار خاں صاحب
۱۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم
۱۳۔ مولانا آزاد سبحانی

۱۴۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

اراکین حیاتی

۱۔ جناب مولوی ارشاد الحق صاحب مسجل جامعہ ملیہ اسلامیہ

۲۔ " مولوی سرور صاحب بی۔ اے، آنرز (جامعہ) فاضل ازہر (مصر) پروفیسر تاریخ اسلام و ناظم بیت الحکمۃ (جامعہ)

۳۔ جناب حامد علی خاں صاحب، بی۔ اے (جامعہ) مہتمم مکتبہ جامعہ

۴۔ " بشیر احمد انصاری بی۔ اے (جامعہ)، محاسب جامعہ۔

۵ " معین الدین حارث صاحب بی۔ اے (جامعہ) ایڈیٹر اجمل ممبئی

۶۔ " عبدالقادر صاحب سابق استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر

۷۔ " اصغر حسن صاحب اصلاحی بی۔ اے (جامعہ) استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر

نائب صدر

۱۔ جناب سید نور اللہ شاہ صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن بمبئی سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء

۲۔ " سعد الدین صاحب انصاری مرحوم استاذ اسلامیات جامعہ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء

۳۔ " شفیق الرحمن صاحب قدوائی ناظم تعلیم و ترقی جامعہ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء

۴۔ " ظہیر الدین خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ)

۵۔ " یوسف حسین خاں صاحب بی اے (جامعہ) ڈی۔ لٹ (پیرس) پروفیسر تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء

۶۔ " عبدالعلیم صاحب اعزازی بی۔ اے آنرز (جامعہ) ایم اے پی ایچ۔ ڈی برلن پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء

۷۔ جناب عبدالحمید صاحب زبیری، بی۔ اے (جامعہ) پی ایچ ڈی (برلن) — ۱۹۲۶-۲۷ء

۸۔ " محمود حسین خاں صاحب۔ جامعہ سینیر پی ایچ ڈی (برلن) — ۱۹۲۷-۲۸ء
پروفیسر سیاسیات ڈھاکہ یونیورسٹی

۹۔ " عبدالکریم خانصاحب بی اے (جامعہ) ہیڈ ماسٹر آزاد ہائی اسکول — ۱۹۲۸-۲۹ء
اُتمان زئی

۱۰۔ " محمد انور خاں صاحب بی اے جامعہ — ۱۹۲۹-۳۰ء

۱۱۔ " محمد حسین صاحب حیدر آبادی۔ بی اے جامعہ، اُستاد و منتظم — ۱۹۳۰-۳۱ء
دفتر مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر

۱۲۔ " رئیس احمد جعفری، مدیر انقلاب بمبئی — ۱۹۳۱-۳۲

۱۳۔ " نجم الدین صاحب بدخشانی — ۱۹۳۲-۳۳ء

۱۴۔ " کے۔ سی۔ ڈیکا صاحب بی۔ اے (جامعہ) — ۱۹۳۳-۳۴ء

۱۵۔ " بدر الحسن صاحب بی۔ اے (جامعہ) حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی — ۱۹۳۴-۳۵ء

۱۶۔ " محمد طیب صاحب بی۔ اے (جامعہ) کرت پور، بجنور — ۱۹۳۵-۳۶ء

۱۷۔ " اسمٰعیل محمد صاحب بی۔ اے، جامعہ — ۱۹۳۶-۳۷ء

۱۸۔ " حافظ ضمیر الدین بی اے (جامعہ) سابق اُستاد تعلیمی مرکز — ۱۹۳۷-۳۸ء

۱۹۔ " حافظ احمد علی صاحب علوی۔ بی اے (جامعہ) — ۱۹۳۸-۳۹ء

۲۰۔ " محمد عرفان خاں صاحب ندوی — ۱۹۳۹-۴۰

۲۱۔ " محمد نسیم خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) — ۱۹۴۰-۴۱ء

۲۲۔ " آزاد رسول صاحب بی اے (جامعہ) استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر — ۱۹۴۱-۴۲ء

۲۳۔ " شمس الرحمٰن[5] صاحب بی اے (جامعہ) متعلم ایم۔ اے فائنل — ۱۹۴۲-۴۳ء

[5] چھ ماہ کی مدت کا پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے آپ بحیثیت نائب صدر انجمن کے رکن دوامی نہیں ہیں۔

۲۴۔ رحیم الدین خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء
۲۵۔ محمد عرفان بیگ صاحب زیدی بی اے (جامعہ) رفیق بیت الحکمۃ جامعہ نگر — سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء
۲۶۔ تقی احمد سید صاحب متعلم بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء

ناظم عام

۱۔ جناب اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر حیدر آباد دکن — سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء
۲ " مقرب حسین صاحب زیدی مرحوم — سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء
۳۔ " ملک عبد الرؤف صاحب بی اے جامعہ پی ایچ ڈی (برلن) کارس پنڈنٹ انڈین پیپرس پیرس — سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء
۴۔ " سید محمد ہادی صاحب ہیڈ ماسٹر انجمن اسلام ہائی اسکول احمد آباد — سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء
۵۔ " جنگ بہادر صاحب، بی، اے (جامعہ) ایڈیٹر ٹریبون — سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء
۶۔ " سید انصاری صاحب، بی، اے (جامعہ) ایم اے، پرنسپل استادوں کا مدرسہ جامعہ " "
۷۔ " حافظ منظور احمد صاحب، بی، اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء
۸۔ " عبد الحمید صاحب زبیری بی، اے (جامعہ) پی ایچ ڈی (برلن) " "
۹۔ " عبد الباقی خانصاحب، بی اے جامعہ) — سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء
۱۰۔ " سید نصیر احمد صاحب — سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء
۱۱۔ " عبد الجلیل خانصاحب بی اے جامعہ — سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء
۱۲۔ " عزیز اللہ بیگ صاحب بی اے جامعہ — سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء
۱۳۔ " امتیاز حسین خانصاحب بی، اے جامعہ، بی کام (لندن) — سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء
۱۴۔ " عبد السلام صاحب قدوائی، ناظم ادارہ تعلیمات اسلام لکھنو نمبر ۲۸ — سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء
۱۵۔ " رشید اختر صاحب مدیر حمایت اسلام لاہور — سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء

۱۶۔ " عبدالحمید خاں صاحب ندوی ناظم شعبۂ باغبانی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی — سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء

۱۷۔ " برکت علی صاحب فراق، بی اے جامعہ، اُستاد تعلیمی مرکز نمبر ا قرولباغ — سنہ ۱۹۳۴-۳۵

۱۸۔ " عبدالملک صاحب بی اے (جامعہ) زمزم لاہور — سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء

۱۹۔ " محمد عرفان انصاری بی اے (جامعہ) ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول۔ بھوپال — سنہ ۱۹۳۶-۳۷

۲۰۔ " محمد حسنین سید بی۔ اے (جامعہ) قیم جماعت اسلامی، بہار — سنہ ۱۹۳۷-۳۸

۲۱۔ " عبداللطیف صاحب اعظمی — سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء

۲۲۔ " اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ) حال متعلم امریکہ — سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء

۲۳۔ " حامد حسین صاحب — سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء

۲۴۔ " شمس الرحمٰن صاحب بی، اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء

۲۵۔ " عبدالوحید صاحب بی، اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء

۲۶۔ " مظفر علی صاحب منصوری بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۳-۴۴

۲۷۔ " سید مجاہد حسین صاحب زیدی بی، اے (جامعہ) اُستاد مدرسہ ثانوی جامعہ نگر — سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء

۲۸۔ " محمد یوسف صاحب بی۔ اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء

ناظم دار المطالعہ

۱۔ جناب پیر الٰہی بخش صاحب وزیر مالیات سندھ — سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء

۲۔ " ایشور ناتھ ٹوپا، بی اے، آنرز (جامعہ) پی ایچ ڈی (برلن) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) — سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء

۳۔ " سید محمد جعفری صاحب۔ ایڈیٹر ملت — سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء

۴۔ " عبدالقدوس صاحب شریف مرحوم — سنہ ۱۹۲۳-۲۴

۵۔ " عبدالعلیم صاحب اعزازی۔ پی ایچ ڈی، پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی — سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء

۶۔ جناب سی، کے، نائر صاحب بی۔اے، آنرز (جامعہ) انچارج گاندھی آشرم نریلا — سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء

۷۔ ،، عبدالسلام صاحب ملیباری۔ بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء

۸۔ ،، عبدالکریم خانصاحب بی اے (جامعہ) ہیڈ ماسٹر آزاد ہائی اسکول — سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء

۹۔ ،، عبدالواحد صاحب سندھی۔ اُستاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر دہلی — سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء

۱۰۔ ،، فضل الرحیم صاحب — سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء

۱۱۔ ،، احسان اللہ خانصاحب، بی، اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء

۱۲۔ ،، بدرالحسن صاحب، بی اے (جامعہ) حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی — سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء

۱۳۔ ،، عبدالغفور صاحب بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۳۲-۳۳

۱۴۔ ،، اسماعیل محمد مدھا صاحب بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء

۱۵۔ ،، خواجہ نبی احمد صاحب بی، اے (جامعہ) مہتمم کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ — سنہ ۱۹۳۴-۳۵

۱۶۔ ،، محمد یوسف صاحب بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۳۵-۳۶

۱۷۔ ،، محمد عمر صاحب بی۔اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء

۱۸۔ ،، محمد اسمٰعیل خاں صاحب بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء

۱۹۔ ،، محمد عثمان سوید صاحب — سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء

۲۰۔ ،، شیورام راجو صاحب — سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء

۲۱۔ ،، محمد حسین صاحب۔ ایف۔اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء

۲۲۔ ،، عبدالرؤف صاحب بی اے (جامعہ) اُستاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر — سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء

۲۳۔ ،، محمد بن عبدالقیوم صاحب بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء

۲۴۔ ،، عبدالستار صاحب بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۳-۴۴

۲۵۔ ،، مصعب الرحمٰن صاحب بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۴-۴۵

۲۶۔ ،، عبدالحلیم ندوی متعلم بی اے (جامعہ) — سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء

مدیر جوہر

۱۔ جناب اصغر علی صاحب بی اے (جامعہ) — ۱۹۴۳-۴۴ء
استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر۔ دہلی

۲۔ " تقی احمد سید صاحب متعلم بی۔ اے — ۱۹۴۵ء

۳۔ " محمد عرفان بیگ صاحب نوری بی اے (جامعہ) — ۱۹۴۵-۴۶ء
(مدیر خاص جوہر جوبلی نمبر)

۴۔ " احسان الحق صاحب متعلم بی اے جامعہ — ۱۹۴۵-۴۶ء

(ناظم انجمنِ اتحاد)